محمود الفتاویٰ

سوم

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ

تقدیم وترتیب

مفتی عبدالقیوم راجکوٹی

ناشر

تفصیلات

نام کتاب:......... ....محمود الفتاویٰ جلد سوم

ازقلم:...............................حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

مقدمہ وترتیب

ازقلم:.....................................مفتی عبدالقیوم راجکوٹی

معین مفتی دارالإفتاء جامعہ ھذا

کمپیوٹرسٹینگ:....................................مفتی محمد امین پنیلا

مدرس مدرسہ جامعہ محمودیہ دیتانی، باڑمیر

صفحات جلد سوم:...۳۹۷

سن طباعت:.............. ۱۴۳۰ھ م ۲۰۰۹ء

فہرستِ محمود الفتاویٰ جلد سوم

نمبر شمار	عناوین	صفحہ
۞	**کتاب البیوع**	۱۵
۱	خیارِ عیب بہر حال خریدنے والے کو حاصل ہے	۱۷
۲	ادائے قرض میں ہدیۃً زائد رقم دینا	۱۸
۳	اخبار کی کوپن خریدنا ناجائز ہے	۱۹
۴	ملازم کا متعین نرخ سے زائد قیمت پر چیز بیچنا	۲۰
۵	انسان کے پاخانہ کی بیع	۲۱
۶	ذی روح کھلونے کی تجارت	۲۱
۷	’’اے ٹو زیڈ مارکیٹنگ‘‘ نامی کمپنی کا گاہک بننے کا حکم	۲۳
۸	قاصد سے رقم ضائع ہوئی تو ذمہ دار کون؟	۲۵
۹	جس گڑ سے چائے خراب ہوگئی ہو دکان دار کو واپس کر سکتے ہیں؟	۲۷
۱۰	کام نہ کر کے تنخواہ لینا حرام ہے	۲۸
۱۱	پارسل اگر ضائع ہو گیا تو نقصان کا ذمہ دار کون؟	۲۸
۱۲	گانے بھرے ہوئے کیسٹ کی تجارت جائز نہیں	۲۹
۱۳	شراب کی خالی بوتلوں کی تجارت درست ہے	۳۹
۱۴	مچھلی کے علاوہ بحری جانوروں کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟	۳۰

۱۵	نقد اور ادھار خریداری کے بھاؤ میں فرق رکھنا	۳۰
۱۶	نقد اور ادھار کے بھاؤ میں فرق کرنا درست ہے	۳۱
۱۷	کیا ٹی وی کی فروخت جائز ہے؟	۳۱
۱۸	دودھ کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے اس میں برف ڈالنا کیسا ہے؟	۳۱
۱۹	آرڈر دے کر مال بنوانا درست ہے	۳۲
۲۰	کیا گاہک سے مقدمہ کے مصارف وصول کر سکتے ہیں؟	۳۳
۲۱	ثمن کی وصولیابی کے مصارف خریدار سے وصول کر سکتے ہیں؟	۳۴
۲۲	تجارتی امداد میں حکومت کو فریب دینا ناجائز ہے؟	۳۴
۲۳	ٹیکس سے بچنے کے لیے تدبیر اختیار کرنا کیسا ہے؟	۳۵
۲۴	بغیر سامان کے صرف بل (رسید) بیچنا کیسا ہے؟	۳۵
۲۵	ہندوستانی اشیاء پر جاپانی مارکہ لگا کر فروخت کرنا	۳۵
۲۶	دودھ کی خالی بوتل مالک کو نہ دے سکے تو کیا کرے؟	۳۶
۲۷	اقالہ کی فضیلت وحکم	۳۷
۲۸	مال پر قبضہ کیے بغیر کسی دوسرے کو بیچنا درست نہیں	۳۸
۲۹	ہوٹل کے حصوں کو کن الفاظ سے بیچنا درست ہے اور کن سے درست نہیں؟	۳۹
۳۰	خرید وفروخت کے چند مسائل	۴۰
۳۱	مقررہ وقت گزر جانے پر ثمن مع سود دینے کی شرط لگانا	۴۱
۳۲	خریدار کی ملکیت میں دودھ خراب ہوا تو بائع ذمہ دار نہیں	۴۱

۳۳	تجارت کو فروغ دینے کی ایک ناجائز اسکیم	۴۲
۳۴	بائع کا ثمن پر قبضہ کیے بغیر وہی چیز کم بھاؤ میں مشتری سے خرید لینا	۴۳
۳۵	خرید و فروخت کی ایک جائز صورت	۴۴
۳۶	گمراہ کن عقائد پر مشتمل کتابوں کی تجارت درست نہیں	۴۴
۳۷	بلڈر کو دی ہوئی رقم سے زائد وصول کرنا حرام ہے	۴۵
۳۸	رعایتی دام سے خریدی ہوئی چیز زیادہ نفع لے کر بیچنا	۴۶
۳۹	ایضاً	۴۷
۴۰	شرطِ فاسد کی ایک صورت	۴۸
۴۱	الکحل کی خرید و فروخت	۴۹
۴۲	کم قیمت چیز زیادہ قیمت سے دے کر مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا	۵۰
۴۳	بی۔ پی ایل B P L کارڈ اور راشن کارڈ سے ناجائز فائدہ اٹھانا	۵۱
۴۴	ڈِلر (Dealer) اور بینک سے گاڑی خریدنے کی چند صورتیں	۵۲
	باب الربوٰا	**۵۶**
۴۵	بلاضرورت بینک میں رقم جمع کرنا اور ملنے والا سود مدارس پر خرچ کرنا	۵۶
۴۶	بینک کے توسط سے رکشہ خریدنا	۵۸
۴۷	حکومتی ٹیکسوں میں سودی رقم دینا	۵۹
۴۸	مکان وغیرہ بنانے کے لیے سرکار سے لون لینا	۶۰
۴۹	سودی آمدنی سے دی ہوئی تنخواہ حلال نہیں	۶۰

۵۰	سود کی رقم مسجد کے طہارت خانہ میں استعمال کرنا جائز نہیں	۶۰
۵۱	سود کی رقم سے بیت الخلاء بنوانا درست نہیں	۶۱
۵۲	بینک سے حاصل شدہ سود سے بیت الخلاء بنانا کیسا ہے؟	۶۱
۵۳	سود کی رقم سے مسجد کا بیت الخلاء بنانا درست نہیں	۶۲
۵۴	مسجد کی رقم پر ملنے والے سود کا مصرف کیا ہے؟	۶۲
۵۵	بیمہ درحقیقت قماراور ربا پر مشتمل ہے	۶۲
۵۶	رفاہی کاموں میں سود کی رقم دینا جائز نہیں	۶۳
۵۷	مقروض آدمی کو سود کی رقم دے سکتے ہیں	۶۴
۵۸	جیون بیمہ میں ملی ہوئی رقم کا صدقہ کرنا ضروری ہے	۶۴
۵۹	سرکاری ٹیکس سے بچنے کے لیے سودی قرض لینا کیا درست ہے؟	۶۵
۶۰	بینک سے حاصل شدہ سود کو نفع کا نام دینے سے سود کی حقیقت بدل نہیں جاتی	۶۶
۶۱	گروی رکھی ہوئی زمین سے انتفاع درست نہیں	۶۷
۶۲	ایل،آئی،سی (L.I.C.) کی رکنیت لینا درست نہیں	۶۸
۶۳	فکس ڈپازٹ سے حاصل شدہ رقم کا استعمال، سودی رقم سے بنائی گئی عمارت میں نماز ومکتب کا حکم	۶۹
۶۴	کیا ہاؤس ٹیکس میں سود کی رقم دے سکتے ہیں	۷۱
۶۵	رشوت اوراین۔اے کی کاروائی میں سود کی رقم دینا	۷۲
	کتاب الھبة	۷۳

٦٦	زندگی میں جائیداد اپنی اولاد میں کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کرنا	۷۵
٦۷	اگر زندگی میں ہی مال تقسیم کرنا ہو تو تمام کو یکساں دے	۷۵
٦۸	مشترک چیز کا ہبہ کیا یا قانونی مجبوری سے بخشش پتر لکھا یا رقم کو سونے میں تبدیل کر دیا تو کیا حکم ہے؟	۷٦
۞	**کتاب الاجارۃ**	**۷۹**
٦۹	دلالی کے دو مسئلے	۸۱
۸۰	گیسٹ ہاؤس میں آنے والے جوڑے کا تعارف نہیں کہ میاں بیوی ہیں یا اجنبی اس کا کرایہ وصول کرنا	۸۲
۷۱	کرایہ دار کا سرکاری قانون کا سہارا لیکر مسجد کی دکان خالی نہ کرنا حرام ہے۔	۸۲
۷۲	غیر مسلموں کے غیر شرعی لباس سینے کی اجرت کا کیا حکم ہے؟	۸۴
۷۳	کرایہ دار دکان میں شراب کا گڑ بیچتا ہو تو بھی کرایہ لینا درست ہے	۸۵
۷۴	مزدور کے لیے کھیتی کی پیداوار میں سے اجرت (مزدوری) طے کرنا	۸۵
۷۵	باپ اپنے بیٹے کو کاروبار میں اجرت پر رکھے تو جائز ہے	۸۵
۷٦	قرض کی بنیاد پر اجرت کم مقرر کرنا درست نہیں	۸٦
۷۷	تعلیم قرآن پر اجرت	۸٦
۷۸	دلال کی اجرت	۸۷
۷۹	مضاربت اور اجارہ کو خلط کرنا درست نہیں ہے	۸۷
۸۰	شراب پینے والے غیر مسلم کو ہوٹل میں ملازم رکھنا	۸۸

۸۱	دلال کا باہم معاملہ کرادینا اور بغیر دیکھے مال روانہ کرنا کیا درست ہے؟	۸۸
۸۲	ڈپازٹ دے کر بغیر کرایہ کے گھر میں رہنا جائز نہیں	۹۰
۸۳	اجرت متعین کیے بغیر فلیٹ میں رہنا	۹۳
۞	**کتاب الاضحیة**	۹۵
۸۴	قربانی کس پر واجب ہے؟	۹۷
۸۵	قربانی کس پر واجب ہے؟	۹۷
۸۶	مرحوم کی طرف سے قربانی انفراداً	۹۸
۸۷	خنثیٰ جانور کی قربانی اور اس کا کھانا	۹۸
۸۸	خنزیر کے دودھ سے پلے ہوئے جانور کی قربانی	۹۹
۞	**کتاب الحظر والاباحة**	۱۰۱
۸۹	معاشرت کے متعلق دین کی اصولی تعلیم، ماں باپ پر اولاد کے حقوق، بہو سے خدمت لینے کا حق، لڑکے کا اپنی بیوی کے ساتھ والدین سے علیحدہ رہنا ہزاروں مفاسد کے انسداد کا ذریعہ ہے، والدین سے علیحدہ رہنے میں عزت بڑھتی ہے، والدہ کے کہنے سے بیوی کو طلاق دینا وغیرہ وغیرہ۔	۱۰۳
۹۰	S.M.S میڈیا کمپنی کا بذریعۂ موبائل اشتہار کے معاوضہ کا حکمِ شرعی	۱۱۸
۹۱	سائبر کافے اور گیم پارلر کھولنے کا شرعی حکم	۱۲۰
۹۲	مروّجہ بالواڈی کی شرعی حیثیت	۱۲۳
۹۳	عصرِ حاضر میں رائج کھیلوں (کرکٹ، فٹ بال وغیرہ) اور لہو ولعب کا حکم	۱۲۵

۹۴	ویڈیو گیم کے کلب قائم کرنا جائز نہیں	۱۴۴
۹۵	فارمی مرغیوں کی خوراک وگوشت اور مغربی ممالک کی تیار غذا کا حکم	۱۴۵
۹۶	عصری تعلیمی ادارے،تصاویر وغیرہ کا شرعی حکم (اسکول سے متعلق ۲۱ سوالات)	۱۴۷
۹۷	کعبۃ اللہ کی تصاویر پر مشتمل چٹائیوں پر قدم پڑنے سے بے حرمتی کا وہم	۱۶۸
۹۸	دینی اجلاس میں پنڈتوں کی شرکت،موبائل کی رنگ میں ''اللہ اکبر'' فٹ کرنا	۱۷۰
۹۹	کمپیوٹر پر ''ڈجیٹل فوٹوگرافی'' (Digital Photography) تصویر سازی کے حکم میں ہے	۱۷۹
۱۰۰	کسی کتاب کا بعض حصہ حذف کر کے یا نام بدل کر شائع کرنا	۱۸۱
۱۰۱	کیا چھ (۶) کونے والا اسٹار یہود کا شعار ہے	۱۸۵
۱۰۲	بجلی چوری کرنے کے مختلف حیلے (ترکیبیں) اور ان کا حکم شرعی	۱۹۰
۱۰۳	موبائل کی گھنٹی کا بٹن بند کیے بغیر مسجد کی جماعت میں شرکت،موبائل کھلا (آن) رکھ کر مسجد میں آنا	۲۰۰
۱۰۴	ایک تبلیغی مقرر صاحب کا واقعۂ شاہِ ہرقل سے غلوآمیز استدلال کا جواز	۲۰۸
۱۰۵	عورتوں (مستورات) کی تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت	۲۱۱
۱۰۶	نظر اور شرمگاہ کی حفاظت کے متعلق اسلامی تعلیم	۲۱۶
۱۰۷	دینی مجالس وغیرہ میں عورتوں کی شرکت کا حکم	۲۲۱
۱۰۸	دینی اداروں میں ہونے والی کوتاہیوں کا ذمہ دار کون؟	۲۳۷

۱۰۹	داڑھی کی شرعی حیثیت	۲۴۷
۱۱۰	قرآنی مسابقہ کا حکم	۲۵۵
۱۱۱	عورتوں کا اصلاحی وانعامی اجلاس منعقد کرنا	۲۶۰
۱۱۲	طلبہ کے ناجائز لباس کو پھاڑنا ناجائز اور موجبِ ضمان ہے	۲۶۳
۱۱۳	ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ تعلیم دینا کیسا ہے؟	۲۶۷
۱۱۴	یہود ونصاریٰ کا مذہبی نشان	۲۶۸
۱۱۵	پڑوسی کی لائٹ بجلی استعمال کرنا	۲۶۸
۱۱۶	چرم قربانی فروخت کرنے کے بعد قیمت مدرسین کی تنخواہ وغیرہ میں صرف کرنا	۲۶۹
۱۱۷	بالوں کی تراش وخراش کی حدود اور قزع کی تشریح	۲۶۹
۱۱۸	اہل فلیٹ سے مینٹنس (Menteness) کی رقم کتنی وصول کی جائے؟ مینٹنس کی رقم میں تاخیر پر جرمانہ لینا	۲۷۴
۱۱۹	صحتِ قرآن کے لیے نورانی قاعدہ پڑھنا ضروری ہے یا نورانی شخصیت (استاذ) سے پڑھنا ضروری ہے؟	۲۷۵
۱۲۰	دینی امور کے لیے مسجد میں چندہ اور چندہ کرنے والے کے ساتھ سلوک	۲۸۰
۱۲۱	شادی سے پہلے دعوت کا حکم	۲۸۴
۱۲۲	ایک انسان کا گردہ دوسرے کو لگانا	۲۸۴
۱۲۳	لڑکے لڑکی کی رضامندی کے بغیر رشتہ طے کرنا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟	۲۸۷

۱۲۴	موبائل(MOBILE) سے متعلق چند اہم مسائل	۲۸۹
۱۲۵	مہتمم کے اوصافِ مطلوبہ	۲۹۲
۱۲۶	مظالم کے خلاف احتجاج میں مسجد کو مقفل کرنا	۲۹۶
۱۲۷	نسبندی حرام ہے	۲۹۹
۱۲۸	ایک بلڈنگ تین جگہوں میں وقف	۳۰۰
۱۲۹	جھینگہ کھانا	۳۰۱
۱۳۰	پھٹے ہوئے روپئے کم قیمت سے بیچنا	۳۰۲
۱۳۱	فتویٰ کو نہ ماننا	۳۰۲
۱۳۲	ایام حمل میں عوارض پیش آتے ہی ہیں	۳۰۳
۱۳۳	کھانے کی ابتداء اور انتہاء نمکین سے	۳۰۳
۱۳۴	''مجھے ہندو سمجھو مسلمان نہ سمجھنا'' کہنا	۳۰۳
۱۳۵	قومی فساد کا علم ہوتے ہوئے نہ بتانا بہت برا ہے ایسے کو مسلمان کے قبرستان میں دفن کرنا	۳۰۴
۱۳۶	دوکان کا مال جانچنے والے کو رشوت دینا	۳۰۶
۱۳۷	سات چیز حلال جانور کی کھانا منع ہے	۳۰۷
۱۳۸	دستاویز نکالنے میں رشوت دینا	۳۰۷
۱۳۹	قبرستان کی زمین میں تعمیر، کھیتی وغیرہ جائز نہیں	۳۰۸
۱۴۰	کیا علماء کی ٹوپی انگریز کی ٹوپی کے مشابہ ہے؟ حضور ﷺ کا عمامہ کیسا تھا؟	۳۰۹

۱۴۱	بگڑے ہوئے معاشرہ میں حلال وحرام میں تمیز کے بغیر ترقی ہو ہی نہیں سکتی	۳۱۱
۱۴۲	بن بلائے دعوت میں شرکت	۳۱۶
۱۴۳	منی گروٹرس اسکیم یعنی سوال کا مہذب طریقہ	۳۱۸
۱۴۴	سنت وبدعت کے مابین فرق کا جامع ضابطہ	۳۲۳
۞	**کتاب السیاسۃ**	**۳۳۵**
۱۴۵	ہندوستان میں نظامِ قضاء کے اجراء کا شرعی حکم	۳۳۷
۱۴۶	ہندوستان کے حالاتِ حاضرہ میں مساجد کی حفاظت، فرقہ وارانہ فسادات میں تحمل یا مقابلہ، ووٹ اور بیمہ کے شرعی احکام	۳۵۷
۱۴۷	مسلمانوں پر ظلم کے وقت متحد ہو کر آئینی کارروائی کرنا ہی حل ہے	۳۶۵
۱۴۸	یکجا ہو کر رہنمائی کرنے کا مطلب	۳۶۶
۱۴۹	بابری مسجد کے متنازعہ مسئلہ میں مسلمانوں کا ردعمل	۳۶۷
۱۵۰	حکومت کے ہمنوا عہدے داروں سے بائیکاٹ کا حکم	۳۶۷
۱۵۱	نصرتِ خداوندی کب حاصل ہوتی ہے	۳۶۸
۱۵۲	کفار سے جنگ کرنے کے لیے ولی کامل ہونا شرط نہیں	۳۶۹
۱۵۳	اسباب اختیار کرنا ضروری ہے، ''قدم جمانے'' کا مطلب	۳۶۹
۱۵۴	کیا ان حالات میں بھی جہاد فرض نہیں ہوا؟	۳۷۰
۱۵۵	جان ومال کی حفاظت کی تدابیر	۳۷۱

۱۵۶	اہل وعیال ومسجد کی حفاظت میں مارا گیا شہید ہے	۳۷۱
۱۵۷	دفاعی تنظیم کا قیام اور اس کی مخالفت کرنے والے کی سزا	۳۷۲
۱۵۸	شہید کے اقسام	۳۷۳
۱۵۹	جہاد کے اقسام	۳۷۳
	کتاب المیراث	**۳۸۹**
۱۶۰	ترکہ میں میراث جاری ہوتی ہے	۳۹۱
۱۶۱	لڑکی اپنا حصہ معاف کردے تو بھی معاف نہیں ہوتا	۳۹۱
۱۶۲	اپنا حصہ وارثوں کو ھبہ کرنا	۳۹۲
۱۶۳	بہنوں کو ان کا حقِ وراثت نہ دینا ظلم ہے	۳۹۳

كتاب البيوع

خیار عیب بہر حال خریدنے والے کو حاصل ہے

سوال: آج تقریباً پینتیس سال سے ہم ہوگ استعمال شدہ کارٹون خرید کر اور پھر بعد میں استعمال شدہ بتلا کر اور کہہ کر بیچنے کا دھندا کرتے ہیں، یعنی سیکنڈ بتلا کر بیچتے ہیں حالاں کہ چند سال قبل جب کہ دعوت کے کام میں نہیں لگے تھے اس وقت مال بدلنے کی شرط نہیں لگاتے تھے، اب احساس ہوا تو مال بدلنے کی شرط بھی لگاتے ہیں اور جو بھی نقصان والا مال ہو تو اس کو واپس بھی لے لیتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود گاہک یعنی بیوپاری کو بتلا دیا جاتا ہے کہ جو مال آپ نے خریدا ہے اس میں اگر کوئی ڈیفکٹ ہو تو دیکھ لینا اور جو مال آپ کو نہ چلے وہ مال ہم کو واپس کر دینا، اب چاہے تو اس کے بدلہ میں دوسرا اچھا مال لے لینا یا قیمت واپس لے لینا، اب اس طرح کے معاملہ میں گاہک چھ چھ مہینہ کے بعد بھی کوئی کارٹون واپس کرتا ہے تو ہم واپس کر لیتے ہیں؛ لہذا اس طرح خرید وفروخت کرنا کیسا ہے؟ اور جو اس طرح سے خرید وفروخت کے معاملہ میں مال کو واپس بھی نہ لے اور قیمت بھی واپس نہ کرے تو یہ معاملہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب کوئی آدمی کسی کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا ہے، اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ فروخت ہونے والی چیز عیب سے پاک ہے؛ اس لیے اگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں کوئی عیب ہے تو شرعاً خریدنے والے کو اختیار حاصل ہے کہ اگر اس کو اپنے پاس رہنے دینا چاہتا ہے تو جو قیمت ادا کی ہے اسی کے عوض رہنے دے، اور اگر واپس کرنا چاہے تو واپس کر کے اپنی پوری قیمت لوٹا لے، اس کو شریعت کی اصطلاح میں خیار عیب کہا جاتا ہے، بیچنے والا چاہے یہ اختیار دے یا نہ دے؛ بہر حال خریدنے والے کو یہ اختیار حاصل ہوتا

ہے؛ البتہ اس کے لیے ضروری ہے کہ خریدنے والے کے پاس جا کر اس میں کوئی نیا عیب پیدا نہ ہوا ہو۔

فقہ کی مشہور کتاب کنز الدقائق اور اس کی شرح زیلعی میں ہے: من وجد بالمبیع عیبا اخذہ بکل الثمن، او ردہ، لان مطلق العقد یقتضی السلامة من العیب فکانت السلامة مشروطة فی العقد صریحا لکونها مطلوبة عادة (تبیین الحقائق ٤/ ٣١)

اس لیے آپ جو معاملہ کر رہے ہیں وہ درست ہے، اور شریعت کے مطابق ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

ادائے قرض میں ہدیۃً زائد رقم دینا

سوال: عمر نے زید سے دو لاکھ روپیے بطور قرض لیے اور کہا کہ میں ایک سال کے بعد دو لاکھ کے بدلے میں ڈھائی لاکھ دوں گا، اور کہتا ہے کہ یہ رقم میں اپنی طرف سے بطور ہدیہ دوں گا تو کیا زید کے لیے یہ زائد رقم (پچاس ہزار روپیے) لینا جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ سود ہے اس کا دینا اور لینا درست نہیں۔

کل قرض جر نفعا فهو حرام. (شامی) عن النبی ﷺ قال: اذا أقرض الرجل فلا یاخذ هدیة. (رواه البخاری فی تاریخه، هکذا فی المنتقی)

وعن ابی بردة بن ابی موسی رضی اللہ عنہ قال: قدمت المدینة فلقیت عبداللّٰہ بن سلام رضی اللہ عنہ فقال: انك بارض فیها الربوا فاش، فاذا کان لك علی رجل حق، فاهدی الیك حمل تبن او حمل شعیرا و حبل قت فلاتاخذ ہ، فانه الربوا. (رواه البخاری مشکوٰة شریف ص/ ٢٤٦) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

اخبار کی کوپن خریدنا ناجائز ہے

سوال: آج کل اخبار میں کوپن اسکیم آرہی ہے، روزانہ اخبار میں ایک کوپن آتی ہے، پورے مہینہ کی جمع کر کے اخبار والوں کو دینے کی صورت میں یقینی طور پر ہر کوپن جمع کرانے والے کو پچاس، ساٹھ روپئے تک کی کوئی چیز ملتی ہے اور ان تمام امیدواروں میں ڈرا (قرعہ اندازی) کیا جاتا ہے جس میں گاڑی وغیرہ ملتی ہے، تو اس طرح سے کوپن جمع کر کے دینا اور اس میں انعام کو حاصل کرنا جائز ہے کہ نہیں؟ بعض لوگوں کے یہاں پہلے سے اخبار آرہا ہے وہ خاص انعام کے لیے اخبار خریدتے نہیں ہیں تو وہ لوگ کوپن جمع کر کے انعام حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جمع نہیں کرتے تو ویسے ہی یہ انعام ہاتھ سے چلا جاتا ہے اگر خود نہیں کرتے لیکن پڑوس والے وہ کوپن لے جاویں تو ان کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟ بعض لوگ خاص انعام کی غرض سے دو تین اخبار خریدتے ہیں ان کے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اخبار میں آنے والی ان کوپنوں کا اخبار والوں کی طرف سے دیے گئے فارم پر ترتیب سے چپکانے کے نتیجہ میں عموماً جاندار کی تصویر تیار ہوتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں یہ شخص تصویر بنانے پر جو وعیدیں احادیث میں آئی ہیں ان کا مستحق ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو عمل تخلیق میں میرا مقابلہ کرنے لگا، یہ لوگ ایک دانہ یا ایک ذرہ کو پیدا کر کے دکھائیں۔ (بخاری شریف) نیز ایک اور روایت میں تصویر بنانے والے پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے اس طرح کی کئی وعیدیں تصویر

بنانے والوں کے متعلق آئی ہیں۔ یہ وعیدیں ہر قسم کی تصویر سے متعلق ہیں خواہ بڑی ہو یا چھوٹی کپڑے، کاغذ پر بنائی جائے یا در و دیوار پر، پھر ان وعیدوں کا مصداق فقط تصویر بنانے والا ہی نہیں بلکہ علامہ ابن الحاجؒ کی تصریح کے مطابق اس کی تحسین و تصویب کرنے والا، اس کا ہمنشین، اس کے فعل پر دل سے راضی ہونے والا، اس فعل کو دیکھ کر قدرت کے باوجود نکیر نہ کرنے والا، سب شریک گناہ ہیں۔ (ماخوذ از احسن الفتاوی ۸/ ۴۱۹ تا ۴۲۲)

اب آپ فیصلہ کریں کہ اخبار والے کی طرف سے پچاس، ساٹھ روپے کی قیمت کی ملنے والی چیز آپ کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات؟ دنیا کے چند روپیوں کی چیز کے لیے اللہ کے پاک رسول ﷺ کی لعنت اور قیامت کے روز ہونے والا سخت ترین عذاب خریدنا یقیناً بڑی بدبختی کی بات ہے۔

اس طرح یہ انعام حاصل کرنا یا کسی دوسرے کو یہ کوپن دیکر انعام حاصل کرنے میں مدد کرنا یہ سب ناجائز اور حرام ہے، اور جو لوگ اسی مقصد کے لیے اخبار خریدتے ہیں ان کے لیے تو وعید اور سخت ہوجاتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۲۶/ جمادی الاخری ۱۴۲۵ھ

ملازم کا متعین نرخ سے زائد قیمت پر چیز بیچنا

سوال: ایک آدمی کسی تاجر کی دکان پر ملازمت کرتا ہے، تاجر کسی چیز کا نرخ متعین کردے مثلاً: ساٹھ روپیہ میں فروخت کرتا ہے، اب یہ ملازم اس کو ستر روپیہ میں فروخت کرکے دس روپیہ اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور مالک کو ساٹھ روپیہ دیتا ہے تو کیا اس طرح ملازم کے لیے دس روپیہ لینا جائز ہے؟ اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس ملازم کی حیثیت وکیل بالبیع کی ہے؛ اس لیے صورت مسئولہ میں اگر اس نے اس چیز کو جس کے متعلق مالک نے اس کو ساٹھ روپیہ میں بیچنے کو کہا تھا، ستر روپیہ میں بیچا تو وہ بیع درست اور صحیح ہے؛ لیکن زائد رقم دس روپیہ بھی مالک کی ملک سمجھے جائیں گے، وہ ملازم اس رقم کو اپنی جیب میں نہیں رکھ سکتا، اگر ایسا کیا تو یہ خیانت ہے۔

الوكيل اذا خالف ان خلافا الى خير في الجنس كبع بالف درهم فباعه بالف و مأة نفذ. (درمختار على هامش الشامي ٤/٤٥٢)

انسان کے پاخانہ کی بیع

سوال: انسان کا پاخانہ جو سوکھ کر مٹی کی طرح کھاد ہو گیا ہو اس کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر اس میں مٹی کی ملاوٹ ہے تو اس کی بیع جائز ہے، ورنہ نہیں۔

ولم ينعقد بيع النحل و دود القز الا تبعا، ولا بيع العذرة خالصا بخلاف السرقين و المخلوطة بتراب الخ. (شامی ٤/١١٧) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ذی روح کھلونے کی تجارت

سوال: (۱) کھلونے (toys) وغیرہ جو تفریح طبع کے لیے بنائے جاتے ہیں جس کا کاروبار دور حاضر میں کافی پھل پھول رہا ہے جن میں بعض تو خالص غیر ذی روح اشیاء کی ہوتی ہیں ان کے بیع و شراء میں تو کوئی تأمل نہیں۔

(۲) لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ایجنسی (ہول سیل) اسی صورت میں ملتی ہے کہ ملے جلے کھلونے اپنی دکان پر فروخت کیے جائیں، نہ چاہتے ہوئے بھی صرف ایجنسی

باقی رکھنے کے لیے مجبوراً ایسے کھلونے فروخت کرنا جن میں مختلف غیر ذی روح پلین، موٹر، گاڑیاں وغیرہ، اور ذی روح اشیاء مثلاً کتے، بندر، بلی، گڑیاں وغیرہ کی مماثل کھلونے ہوتے ہیں تو شرعاً یہ مخلوط کاروبار کیا حکم رکھتا ہے؟ اور حاصل شدہ منافع کا کیا حکم ہے؟

(۳) فقہ کی کتابوں میں شراب اور خنزیر کا تو مسلم کے لیے مال غیر متقوم ہونا مصرح ہے،، تو کیا اس کا اور اوپر مذکور کاروبار کا حکم یکساں ہے؟ یا کچھ فرق ہے؟

(۴) متحدہ عرب امارات میں ایسے کاروبار کافی منفعت بخش ہوتے ہیں، اور خریداروں میں کچھ مسلم جب کہ اکثر غیر مسلم سیاح ہوتے ہیں تو کیا ذی روح کھلونا غیر مسلم سیاح کو فروخت کر سکتے ہیں؟

(۵) مصورین کو قیامت کے دن سخت عذاب ہونا حدیث میں مذکور ہے، تو کیا غیر ذی روح اور ذی روح کھلونے کا مخلوط کاروبار اس حدیث پاک کے عموم میں شامل ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱،۲) کسی بھی جان دار کی تصویر بنانا سخت حرام اور گناہ کبیرہ ہے، خواہ تصویر کسی بھی قسم کی ہو، بڑی ہو یا چھوٹی۔ کپڑے، کاغذ پر بنائی جائے یا در و دیوار پر قلم سے بنائی جائے یا کیمرہ سے، اسی طرح تصویر کا پریس میں چھاپنا، مشین یا سانچے میں ڈھالنا بھی ناجائز ہے، تصویر کی خرید و فروخت حرام ہے، اس ذریعہ سے کمایا ہوا پیسہ حرام اور ناقابل انتفاع ہے۔ (احسن الفتاوی ۸/ ۴۳۷)

مصور گڑیوں، مصور کھلونوں اور مصور مٹھائیوں کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کا بنانا، بیچنا، خریدنا اور کھانا جائز نہیں، بغیر خریدے بھی کھانا جائز نہیں؛ اس لیے کہ اس میں تعاون علی المعصیۃ ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۸/ ۴۳۸)

گڑیا کی یا کسی اور کھلونے کی شکل وصورت جان دار کی نہ ہوتو کچھ مضائقہ نہیں، جان دار کی صورت بنانا اور گھر میں رکھنا منع ہے، بچوں کے لیے بھی نہ رکھیں، ایسی صورتوں کی تجارت بھی نہ کریں۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۲/ ۲۷۷)

ایجنسی حاصل کرنے کے لیے ذی روح کھلونوں کی خریداری کو بھی شرط قرار دیا گیا ہے جو حرام ہے؛ اس لیے یہ ایجنسی حرام کو متضمن ہونے کی وجہ سے حرام اور نا جائز ہے۔

(۳،۴) (وكـذا) بطل (بيع مال غير متقوم) اى مال لا يباح الانتفاع بـه، ذكره ابن الكمال وغيره فليحفظ. (كالخمر) فى مابين مسلمين، ومسلم وكـافـر (والخنزير) ...... ويدخل فيه فرس او ثور من خزف لا ستيناس الصبى لانه لاقيمة له ولا يضمن متلفه. (در المنتقى على هامش مجمع الانهر ٢/ ٥٤)

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ سوال میں مذکور ذی روح کھلونے بھی مال غیر متقوم ہونے کی وجہ سے ان کی بیع باطل ہے؛ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر مسلم کے ہاتھوں بھی اس کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

(۵) جیسا کہ جواب نمبر ا رمیں لکھا جا چکا، یہ اس وعید میں داخل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

۱۱/ جمادی الاولی ۱۴۲۵ھ

''اے ٹو زیڈ مارکیٹنگ'' نامی کمپنی کا گاہک بننے کا حکم

سوال: (الف) ایک کمپنی ہے جس کا نام ''اے ٹو زیڈ مارکیٹنگ'' ہے یہ کمپنی اپنے بننے والے گاہک کو ۳۵۰۰/ روپیے کی مالیت پر ایک کیڈ دیتی ہے (جس میں ضروریات زندگی مصالحاجات کی چیزیں) وغیرہ ہوتی ہیں۔

جب کوئی مثلاً زید اس کو خرید کر گاہک بنے گا تو اس کو بجائے ساڑھے تین سو روپیے کے تین سو روپیے ادا کرنے ہوں گے، اور وہ کیڈ زید کو سپرد کردی جائے گی (اب زید اس کا ممبر بن گیا) اب یہ زید اس کمپنی کا گاہک بن گیا اب وہ دوسروں کو بھی اپنے ذریعہ اس کمپنی کا گاہک بنا سکتا ہے تو زید کے ذریعہ جو بھی مشتری مثلاً عمرو اس کمپنی سے جو کیڈ خریدے گا تو اس کو بھی ساڑھے تین سو والی کیڈ تین سو میں مل جائے گی، پھر یہ زید کے واسطے سے گاہک بننے والا عمرو کمپنی سے جتنا مال خریدے گا اس پر زید کو بھی دو فیصد کمیشن ملتا جائیگا پھر ھلم جرا۔ اگر عمرو بھی اس طرح گاہک بناتا ہے تو اس کو بھی اپنے ذریعے بننے والے گاہک پر دو فیصد کمیشن ملتا رہے گا، تو قابل دریافت امر یہ ہے کہ اس طرح کی کمپنیوں میں مذکورہ طریقے سے شرکت کرنا چہ حکم دارد؟

(ب) یہی کمپنی ہمارے گاؤں میں ایک دکان شروع کررہی ہے جس کو ''ڈپو'' کہتے ہیں کمپنی والے خود اس ڈپو میں بیچنے کے تمام سامان کیڈ وغیرہ پہنچادیتے ہیں، اس ڈپو پر بیٹھ کر سودا کرنے والا ذمہ دار خود کمپنی کا کوئی آدمی نہ ہو بلکہ ہمارے گاؤں ہی سے مثلاً زید ہی کو اس ڈپو کا ذمہ دار، مال کا سودا کرنے والا اس شرط پر مقرر کرتا ہے کہ تیرے ہاتھ سے اس ڈپو سے جتنا مال بکے گا، جتنا سودا ریٹل میں ہوتا رہے گا اس میں سے زید کو ۱۵/ فیصد ملتے رہیں گے، تو اس ڈپو میں زید کا ذمہ دار بن کر مذکورہ شرط پر کام کرنا کیسا ہے؟

(ج) اگر صورت مذکورہ (ب) میں مثلاً زید کو ۱۵/ فیصد نہ دیا جائے تو وہ لوگ زید کو اس طرح بھی ڈپو میں رکھنے کو تیار ہیں کہ فیصد کے بجائے تجھے ہم ماہانہ دو تین ہزار بطور ملازمت کے دیتے رہیں گے، تو اس کمپنی کے ڈپو میں ملازمت کرنا کیسا ہے؟ بینوا وتوجروا

نوٹ: اس میں اگر صورتِ جواز بن سکتی ہو تو رقم فرمادیں۔۱۲

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف) زید کے واسطے سے براہ راست گاہک بننے والے حضرات جتنی خریداری کریں، اس پر زید کو دو فیصد کے حساب سے کمیشن دینا بشرطیکہ یہ سلسلہ آگے جاری نہ ہوتا ہو، یہ دلالی ہونے کی وجہ سے درست ہے، اور اگر اس کے ذریعہ بالواسطہ بننے والے گاہکوں کو بھی یہ کمیشن دیا جاتا ہو تو دلالی کا مصداق نہ ہونے کی وجہ سے درست نہیں۔

(ب) یہ طریقہ قفیز طحان کے قبیل سے ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

(ج) اگر ڈپو کا طریق کار جواب نمبر الف میں لکھی ہوئی صورت جواز کے مطابق ہو تو درست ہے؛ ورنہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۱۹/ جمادی الاخری ۱۴۲۵ھ

قاصد سے رقم ضائع ہوئی تو ذمہ دار کون؟

سوال: (الف) اگر کسی کو ضرورت ہو تو ہم لوگ روپیوں (رقم) لین دین کا کام (یعنی حوالہ کا کام) کرتے ہیں، جس میں ضرورت مند کو بینک کے ذریعے یا ہاتھوں ہاتھ رقم پہنچائی جاتی ہے؛ چناں چہ اسی طرح اس شخص کے ساتھ ۹۵۰۰۰/ پچانوے ہزار ڈالر سے کچھ اوپر رقم کا لین دین کا معاملہ دبئی میں ہوا، ہمارا آدمی وہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے رقم لینے والے نے یعنی ضرورت مند نے اپنا آدمی بھیجا کہ میرے آدمی کو آپ رقم دیدو وہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کردے گا، اس شخص کے کہنے کے مطابق وہ پوری پوری رقم ہم نے اس شخص کے آدمی کو دیدی، جب وہ آدمی اس کے سیٹھ کے اکاؤنٹ (بینک اکاؤنٹ) میں جمع کروانے گیا تو اس آدمی کے کہنے کے مطابق بینک بند ہو چکا تھا اس آدمی نے اپنے سیٹھ

کوفون کے ذریعہ خبر دی کہ بینک بند ہو چکا ہے اب اس رقم کا کیا کرنا ہے؟ سیٹھ نے اپنے اس آدمی کو شام میں دوبارہ بینک کھلنے پر واپس بینک جا کر وہ رقم کو اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرنے کو کہا اس کے بعد وہ رقم بینک میں جمع نہ ہوئی؛ بلکہ اس آدمی نے کہا کہ جب میں دوبارہ بینک میں رقم لے کر جا رہا تھا اس وقت راستہ میں ایک مرسڈیز کار والے نے مجھے لوٹ لیا اور وہ آدمی دبئی چھوڑ کر ہندوستان آ گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ۹۵۰۰۰/ ڈالر سے زائد رقم ہم اس سیٹھ کہ جس کے آدمی کو ہم نے دی تھی اس سے وہ پوری پوری رقم واپس لینے کے حق دار ہیں کہ نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ نے رقم مطالبہ کرنے والے شخص یعنی (سیٹھ) کے قاصد (یعنی اس کی طرف سے رقم وصول کرنے کے لیے بھیجے گئے شخص) کے ہاتھ میں ۹۵۰۰۰/ ڈالر دے دیے، اس کے بعد اس آدمی کے پاس سے وہ رقم لوٹ لی گئی تو یہ رقم اس سیٹھ کی ہلاک ہوئی سمجھی جائے گی، اور آپ اس سیٹھ کے پاس ۹۵۰۰۰/ ڈالر وصول کرنے کے شرعاً حق دار ہیں، مطلب کہ وہ قاصد سیٹھ کا بھیجا ہوا ہونے کی وجہ سے آپ کا اس کے ہاتھ میں رقم کا دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ سیٹھ کے ہاتھ میں دی ہوتی اور اس کے ہاتھ سے لوٹ لی جاتی۔

لو ارسل المدين دينه الى الدائن وقبل الوصول اليه تلف فى يد الرسول فان كان رسول المدين، يتلف من مال المدين، وان كا ن رسول الدائن، يتلف من مال الدائن، ويبرأ المدين من الدين (مجلة الاحكام ماده: ١٤٣٤)

واذا تلف الدين الذى ارسله المدين الى الدائن مع رسول وتلف فى يد الرسول قبل ان يصل اليه فاذا كان الرسول رسول المدين، تلف من مال

المدين، لان قبض هذا لا يقوم مقام قبض الدائن وتعود خسارته الى المدين ويلزم المدين ان يؤدى الى الدائن الدين، واذا وقع التلف فى يد الرسول بلاتعد ولا تقصير فلا يلزمه شيء. انظر الى الفقرة الاخيرة من المادة الآنفة: اما اذا تلف بتعد او تقصيرضمن المدين الرسول. انظر المادة. (از ۷۸۷)

واذا كان رسول الدائن يتلف من مال الدائن، لان قبض هذا قائم مقام قبض الدائن بناء عليه يبرأ المدين من الدين ولا يلزم الرسول ضمان اذا كان التلف الذى حصل فى يده بلاتعد ولا تقصير، اما اذا كان التلف بتعديه او تقصيره ضمنه الرسول للدائن. (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ۳/ ۵۸٦)

اب اگر قاصد کے ہاتھ سے اس رقم کے چلے جانے میں اس قاصد کی کسی کوتاہی کو دخل نہ ہو تو سیٹھ اس سے وصول نہیں کرسکتا، اور اگر اس میں اس کی کوتاہی کو دخل ہے تو سیٹھ یہ رقم قاصد سے وصول کرسکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۲۸/ ۵/ ۱۴۲۵ھ

جس گڑ سے چائے خراب ہوگئی ہو دکان دار کو واپس کرسکتے ہیں؟

سوال: زید نے گڑ خریدا اور گھر جا کر چائے بنائی تو پھٹ گئی (خراب ہوگئی) تو گاہک کو اس گڑ کے واپس کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

عیب وہ بات ہے جس کی وجہ سے مال فروخت شدہ کی قیمت تاجروں اور جاننے والوں کے نزدیک کم ہوجائے۔ (شامی ۴/ ۸۰)

صورت مسئولہ میں بھی اگر چائے کے گڑ میں یہ بات عیب شمار ہوتی ہے، اور یہ عیب گڑ میں پہلے سے یعنی بائع کی ملک ہی میں پیدا ہوا تھا تو خریدار کو خیار عیب حاصل ہے بشرطیکہ بائع نے بوقت عقد اس کو بیان نہ کیا ہو، اور نہ ہی اس نے تمام عیوب سے برأت کی شرط کی ہو۔ (کما فی کتب الفقہ فی باب خیار العیب) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

خیار عیب: یعنی مال میں خرابی اور عیب کی وجہ سے دکان دار کو مال لوٹانے کا اختیار۔ از مرتب عفی عنہ

کام نہ کر کے تنخواہ لینا حرام ہے

سوال: اگر کوئی ملازم سرکاری ملازمت کرتا ہے، ملازمت کا وقت صبح سات بجے سے شام چار بجے تک ہے، ملازم دفتر جا کر دستخط کر کے حاضری لگا کر آجاتا ہے اور ملازمت کے اوقات گھر پر گزارتا ہے اور اس وقت اگر کوئی بڑے صاحب (نگران) آجائے اور بازپرس کرے تو اپنی طبیعت ناساز بتلاتا ہے وغیرہ وغیرہ، اور جس وقت حقیقت میں بیمار ہوتا ہے تو اپنے ساتھی ملازم کو حاضری لگانے کا کہتا ہے کہ میری حاضری لگا دینا اور وہ صاحب حاضری بھی لگا دیتے ہیں اور ماہ کے آخر میں برابر تنخواہ حاصل کرتا ہے تو یہ تنخواہ لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ تنخواہ حرام اور ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

پارسل اگر ضائع ہوگیا تو نقصان کا ذمہ دار کون؟

سوال: تاجر نے خریدار کی طلب پر بذریعۂ ٹرانسپورٹ مال روانہ کیا، راستہ میں مال ضائع ہوگیا تو اس نقصان کو تاجر برداشت کرے گا یا خریدار؟ اگر آج کل کے عرف کے

مطابق تاجر کے ذمہ نقصان آتا ہو تو مشتری کے لیے تاجر سے اس نقصان کا وصول کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو مال ڈاک یا ریل وغیرہ (مثلاً ٹرانسپورٹ) کے ذریعہ سے روانہ کیا جائے وہ اس کے قبضہ میں سمجھا جائے گا جس نے یہ حکم دیا ہو، پس اگر خریدار نے لکھا کہ فلاں مال ریل یا ڈاک یا ٹرانسپورٹ میں بھیج دو اور ضائع ہو گیا، بائع ذمہ دار نہیں، اس نے گویا مشتری کے وکیل (یعنی ڈاک یا ریل یا ٹرانسپورٹ) کے حوالہ کر دیا، اور اگر اس کا یہ حکم نہ تھا، بائع نے خود بھیجا تو نہ یہ روانگی تسلیم مبیع ہے، نہ مشتری (خریدار) ذمہ دار۔ (عطر ہدایہ ۱۰۲)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

گانے بھرے ہوئے کیسٹ کی تجارت جائز نہیں

سوال: ایک آدمی پان وغیرہ کی دکان چلا رہا ہے اور اس کے ساتھ بیچنے کے لیے ٹیپ ریکارڈ میں بجانے کی کیسٹ بھی رکھتا ہے جس میں گانے وغیرہ بھرے ہوئے ہوتے ہیں تو ایسی کیسٹ کا بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

گانے بھرے ہوئے کیسٹ کا بیچنا اور اس کی تجارت جائز نہیں، ممنوع وحرام ہے۔ (احکام القرآن للمفتی محمد شفیعؒ ۵ / ۱۵٦)

شراب کی خالی بوتلوں کی تجارت درست ہے؟

سوال: شراب کی خالی بوتلوں کو شراب کے کارخانہ سے خریدی ہوئی قیمت سے زائد قیمت میں فروخت کرنا، یعنی کاروبار کرنا جبکہ کاروبار کرنے والا نہ تو شراب پیتا ہے

اور نہ اس کا کوئی شراب بنانے کا کارخانہ ہے، درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جن بوتلوں میں شراب رہ چکی ہے اس کے بعد وہ خالی ہوئیں اور پاک کر لی گئیں تو ان کو دوسرے کسی بھی کام میں استعمال کر سکتے ہیں، ان کی تجارت بھی درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مچھلی کے علاوہ بحری جان وروں کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟

سوال: مچھلی کے علاوہ بحری جانوروں کو اپنے قبضہ میں لا کر اس کی بیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز بحری خنزیر کی بیع کے متعلق بھی تحریر فرمائیں کہ کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بحری جانوروں میں سے مچھلی اور وہ جانور جن کی کھال اور ہڈی سے انتفاع جائز ہو اس کی بیع (فروخت) درست ہے۔ (بحر الرائق ٦/ ١٨٧، شامی ٤/ ٢٣٩)

خنزیر بحری کا وہی حکم ہے جو بری کا ہے۔

و لنا قوله تعالیٰ ﴿حرمت عليكم الميتة و الدم ولحم الخنزير﴾ من غير فصل بين البري و البحري. (بدائع الصنائع ٥/ ٣٥) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نقد اور ادھار خریداری کے بھاؤ میں فرق رکھنا

سوال: تاجر اپنے نقد اور ادھار خریداروں کو خوب جانتا ہے؛ اس لیے جب کوئی نقد خریدنے والا تاجر سے اشیاء کی قیمت معلوم کرتا ہے تو اس کو کم دام بتاتا ہے، اور جب ادھار خریدنے والا اشیاء کی قیمت معلوم کرتا ہے تو اس کو زیادہ دام بتلاتا ہے اور اس کو خریدار قبول بھی کرتا ہے اس طرح کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نقد اور ادھار کے بھاؤ میں فرق کرنا درست ہے

سوال: نقد خرید ا جائے تو بھاؤ کم لگایا جاتا ہے،اور اسی چیز کو ادھار خریدا جائے تو بھاؤ زیادہ لگایا جاتا ہے،تو اس طرح نقد اور ادھار میں بھاؤ میں فرق کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے؛ البتہ مجلس عقد میں یہ طے ہو جانا ضروری ہے کہ معاملہ نقد ہے یا ادھار۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کیا ٹی وی کی فروخت جائز ہے؟

سوال: کیا ٹی وی کی بیع جائز ہے؟ بائع اس کو نہ دیکھتا ہے، نہ اس کو پسند کرتا ہے؛لیکن کوئی دوسرا پیشہ نہ ہونے کی بناء پر اس کو اختیار کیے ہوئے ہے، اگر نا جائز ہے تو اور چیزیں جو شریعت میں معصیت شمار ہوتی ہیں مثلاً ریڈیو وغیرہ کا بیچنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ٹی وی آلات لہو ولعب میں ہے اس کا عمومی استعمال یہی ہے؛ اس لیے اس کی فروخت جائز نہیں ہے۔(فتاوی رحیمیہ ۲۹۲/۶) ریڈیو آلات لہو ولعب میں داخل نہیں، نا جائز طریقہ پر استعمال کرنے کا جرم ان پر عائد ہوگا جو اس کو نا جائز طور پر استعمال کرتے ہیں؛لہٰذا اس کا فروخت کرنا مباح ہے۔(ایضاً ۲۶۹/۶)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

دودھ کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے اس میں برف ڈالنا کیسا ہے؟

سوال: بمبئی میں جب بھینسوں کا دودھ نکالا جاتا ہے تو اس دودھ کو ایک بڑے

برتن میں جمع کیا جاتا ہے پھر اس کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے مندرجۂ ذیل دو شکلیں اختیار کی جاتی ہیں تا کہ خراب نہ ہو:

(۱) بعض لوگ براہِ راست دودھ میں برف ڈال دیتے ہیں تا کہ دودھ ٹھنڈا رہے خراب نہ ہو۔

(۲) اور بعض لوگ برف کو دوسرے برتن میں بند کر کے اس برتن کو دودھ میں رکھتے ہیں تا کہ دودھ کو ٹھنڈک پہنچے اور خراب نہ ہو۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ دونوں شکلوں والے اپنے دودھ کو خالص کہہ کر پوری قیمت سے بیچتے ہیں تو کیا شرعاً اس طرح ٹھنڈا کر کے بیچنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دودھ کی حفاظت کے لیے عام طور پر جو تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اس قسم کی تدبیر اختیار کرنے کی اجازت ہے؛ البتہ جس صورت میں برف دودھ میں ڈالی گئی تھی اس صورت میں دودھ کو خالص کہنا ایک قسم کا دھوکہ ہے جو جائز نہیں ہے، اور مشتری (خریدار) کو معلوم ہونے کی صورت میں اگر وہ واپس کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، بشرطیکہ واپسی سے مانع کوئی بات پیدا نہ ہوئی ہو۔ کما ھو مصرح فی کتب الفقہ. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

آرڈر دے کر مال بنوانا درست ہے

سوال: زید اینٹ بنانے اور فروخت کرنے کا کاروبار کرتا ہے، اب بکر زید کے پاس اینٹیں خریدنے گیا، تو زید نے کہا کہ فی الحال میرے پاس مال تیار نہیں ہے: لہٰذا میں دس ہزار اینٹیں دو کلووزن کی تین سو روپیے ہزار اینٹ کے حساب سے بھٹہ پکنے پر تمھارے گھر پہنچا دوں گا اس کی قیمت ابھی مجھے دیدو، بکر نے پوری قیمت دیدی اور معاملہ کرلیا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہاں نہ مبیع (سامان) موجود ہے، نہ مبیع (سامان) سپرد کرنے کا متعین وقت معلوم ہے، اور نہ مبیع کا نمونہ موجود ہے ایسی صورت میں اس بیع (خرید وفروخت) کا کیا حکم ہے؟ نیز آج کل اس میں ابتلاء عام ہے؛ اس لیے ناجائز ہونے کی صورت میں جواز کی شکل کیا ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بیع درحقیقت استصناع ہے جو درست ہے، اس میں یہ ضروری ہے کہ جس چیز کے بنانے کا آرڈر دیا جارہا ہے اس کی جنس، نوع، مقدار اور وصف معلوم ہونے کے ساتھ لوگوں میں اس چیز کو آرڈر دے کر بنوانے کا عرف ہو۔ (انظر لتفصیل احکامه البدائع الصنائع ٥/٢، ٣، ٤ کتاب الاستصناع) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کیا گاہک سے مقدمہ کے مصارف وصول کر سکتے ہیں؟

سوال: کوئی گاہک تاجر کو بقایا ادا نہیں کرتا، اب اس تاجر نے کورٹ میں مقدمہ دائر کیا اور مقدمہ میں فیصلہ یہ ہوا کہ قرض دار قرض کی رقم مع سود اور مقدمہ کے خرچ کے ادا کرے، سود تو خیر لینے کا سوال ہی نہیں ہوتا مگر سوال یہ ہے کہ گاہک کی بدمعاملگی اور خلاف عہد کی وجہ سے تاجر کو مقدمہ کا خرچ کرنا پڑا اور تکلیف اٹھانی پڑی تو مقدمہ کا خرچ گاہک سے وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب کسی کو اپنے حق کی حفاظت کے لیے مجبوری نالش کرنا پڑے اور فریق مخالف کی طرف سے بالکل مخاصمانہ کاروائیوں کی وجہ سے بہت سے مصارف برداشت کرنا پڑے تو اس صورت میں خرچہ کا روپیہ لینا بہت سے علماء کے نزدیک (ومنھم مولانا رشید احمد صاحب

رحمہ اللہ تعالیٰ) جائز ہے۔(امداد الفتاوی ۳/۱۲۳)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ثمن کی وصولیابی کے مصارف خریدار سے وصول کر سکتے ہیں؟

سوال: ایک تاجر نے قرب وجوار کے دیہات کے کسی مشتری کو ایک ماہ کی مدت سے قرض مال دیا؛ لیکن مشتری نے حسب وعدہ وہ رقم ادا نہیں کی حتی کہ تاجر کو اس رقم کی وصولیابی کے لیے خریدار کے پاس کرایہ خرچ کر کے جانا پڑا بلکہ کئی بار جانا پڑا تو کیا تاجر اس خریدار سے آمدورفت کے مصارف وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مشتری کے لیے ضروری ہے کہ حسبِ وعدہ ثمن ادا کر دے؛ لیکن اس نے ادا نہیں کی اور تاجر از خود کرایہ خرچ کر کے اس کے پاس گیا تو اس کرایہ کی ذمہ داری خود تاجر پر ہے، وصولیابی کے لیے جانا تاجر کا اپنا فعل ہے اس کے مصارف وہ مشتری سے وصول نہیں کر سکتا۔

تجارتی امداد میں حکومت کو فریب دینا جائز ہے؟

سوال: حکومت چھوٹے صنعت کاروں کو مشین وغیرہ لینے کے لیے رقم دیتی ہے، جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مدد چاہنے والے کو پہلے تاجر سے بھاؤ بل لے کر پیش کرنا ہوتا ہے، اس پر حکومت بینک کے ذریعہ چیک دلواتی ہے، بعض لوگ اس ترکیب سے اس چیک کو حکومت سے حاصل کرتے ہیں؛ لیکن مشین نہیں خریدتے بلکہ تاجر کو وہ چیک دے کر نقد رقم لے لیتے ہیں، تاجر بھی فیصد کم کر کے نقد دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ مدد خواہ کے لیے اس طرح مشین لینے کے لیے لیے ہوئے چیک سے بجائے مشین کے رقم لینا صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس میں فریب وکذب دونوں موجود ہیں جو ناجائز وحرام ہیں۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ٹیکس سے بچنے کے لیے تدبیر اختیار کرنا کیسا ہے؟

سوال: حکومت تاجروں سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کرنے کے لیے تاجروں کے حساب کتاب کو باقاعدہ دیکھتی ہے، تاجر لوگ ان ٹیکسوں سے بچنے کے لیے مختلف تدبیریں کرتے ہیں، شرعاً اس طرح سرکاری ٹیکسوں سے بچنے کے لیے تدبیریں کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کے ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کے لیے کوئی جائز تدبیر اختیار کرنا درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بغیر سامان کے صرف بل (رسید) بیچنا کیسا ہے؟

سوال: زید نے خالد سے دس ہزار کی رقم کا سامان خریدا؛ لیکن خالد نے کسی مصلحت کی وجہ سے زید کو سامان کا بل نہیں دیا، اب زید کو سرکار میں حساب پیش کرنے کے لیے بل کی ضرورت پڑی تو زید نے بکر نامی تاجر کے پاس جا کر کہا کہ میں نے خالد سے مال خریدا ہے مگر اس نے بل نہیں دیا تو کیا تم مجھے بل دے سکتے ہو؟ بکر نے کہا دوں گا مگر فی صد پانچ روپیے اس بل کے عوض دینے ہوں گے، سوال یہ ہے کہ زید کے لیے عوض دے کر بل لینا اور بکر کے لیے بغیر مال دیے ہوئے صرف بل دینے کے عوض رقم لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست نہیں ہے، فریب اور دھوکہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ہندوستانی اشیاء پر جاپانی مارکہ لگا کر فروخت کرنا

سوال: زید ایک فیکٹری کا مالک ہے اور وہ ڈپلیکیٹ اشیاء فیکٹری میں تیار کرتا ہے، مثلاً ایک پارٹ ہے وہ اصلی اور جاپان کا ہے اس کی قیمت ۵۰۰/ پانچ سو روپیہ ہے

زید بھی اسی طرح کا پارٹ یہاں (ہندوستان میں) اس کے ہم مثل کمزور پارٹ تیار کرتا ہے اور اس کو بھی پانچ سو میں فروخت کرتا ہے، اور مشتری کو اس بات کا علم ہے کہ یہ چیز حقیقت میں جاپان کی نہیں ہے ہندوستان ہی کی ہے، اس کے باوجود پانچ سو میں خریدتا ہے اور بائع بھی آشنا کردیتا ہے کہ میری چیز اتنی مضبوط نہیں ہے چند روز کام آئے گی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کی یہ تجارت صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر زید اپنی مصنوعات پر وہی مارکہ لگاتا ہے جو جاپانی مصنوعات پر لگتا ہے تب تو اس کا یہ عمل ایک نوع کا دھوکہ ہے؛ اس لیے کہ چاہے وہ اپنے پاس سے خریدنے والوں کو یہ بتلائے بھی کہ اصلی مال نہیں ہے لیکن یہ احتمال موجود ہے کہ وہ خریدار جب دوسرے آدمی کو وہ مال فروخت کرے گا تو اس کو یہ بات نہ بتلا کر اندھیرے میں رکھے اور اس کا ذریعہ زید بنا ہے؛ اس لیے اس صورت میں زید کا حاصل کردہ منافعہ خبیث ہے پاک نہیں؛ البتہ زید نے اگر جاپانی مارکہ استعمال نہیں کیا تو اس کے لیے وہ منافعہ درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

دودھ کی خالی بوتل مالک کو نہ دے سکے تو کیا کرے؟

سوال: ایک مسافر گاڑی میں سفر کررہا ہے، ایک اسٹیشن پر دودھ وغیرہ کی بوتل خریدی اور قیمت ادا کردی؛ لیکن ابھی بوتل اس کے پاس تھی کہ گاڑی چلنے لگی اب کوئی صورت بوتل کو مالک تک پہنچانے کی نہیں ہے تو اب اس بوتل کا کیا کرے؟ خود استعمال کرے یا غریب کو دے دے؟ دوسری صورت یہ ہے کہ دودھ کی قیمت دو روپے ہیں مسافر نے دودھ والے کو پانچ روپے دیے اور گاڑی چل دی، اب بوتل مسافر کے پاس تھی اور دودھ والے سے تین روپے لینے باقی ہے تو کیا یہ تین روپے بوتل کی قیمت بن سکتے ہیں؟

حالاں کہ بیع کا رکن ایجاب وقبول ندارد۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

خود یا کسی دوسرے کے ذریعہ سے مالک تک اس کا پہنچانا ضروری ہے، گاڑی کا چل دینا عذر نہیں ہے؛ البتہ بعد میں بھی مالک نہ ملا تو یہ لقطہ کے حکم میں ہوگی، خود اگر غریب ہے تو استعمال کرسکتا ہے ورنہ صدقہ کردے البتہ بعد میں مالک مل جانے پر اس نے صدقہ کو منظور رکھا تب ٹھیک ورنہ قیمت ادا کرنی ہوگی۔ (شامی ۳/۳۵۱)

دوسری صورت کا بھی یہی حکم ہے البتہ اس صورت میں مالک کے مل جانے پر اس سے اپنا بقیہ روپیہ وصول کرسکتا ہے۔ (شامی ۳/۳۵۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اقالہ کی فضیلت وحکم

سوال: ایک صاحب نے دس روپے کلو کے حساب سے بیس لاکھ (۲۰۰۰۰۰۰) کلو لوہا خریدا، خریدار نے بائع کو پچاس ہزار روپیئے پیشگی دے دیے اور یہ طے ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد مال اٹھانا شروع کریں گے اور ایک وقت میں جتنا مال اٹھائیں گے اس کی رقم اسی وقت ادا کی جائے گی چوں کہ مال زیادہ ہے؛ اس لیے کئی قسطوں میں مال اٹھایا جانا طے ہوا، اچانک لوہے کا دام پورے ملک میں گر گیا ہے، اب اگر خریدار وہ مال لیتا ہے تو اس کو تیس لاکھ (۳۰۰۰۰۰۰) روپے کا خسارہ ہوگا، خریدار چاہتا ہے کہ پچاس ہزار کی پیشگی رقم چھوڑ دوں اور سودا فسخ کردیا جائے مگر بائع سودا فسخ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، مال ابھی بائع کے گودام ہی میں رکھا ہے، خریدار کا کہنا ہے کہ اگر شریعت کی طرف سے اجازت ملتی ہے تو میں بیع فسخ کروں گا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شرعاً بائع اور مشتری دونوں کو یہ حق حاصل ہے کہ باہمی رضامندی سے بیع کو مکمل

ہوجانے کے بعد توڑ دیں۔(مجلہ الاحکام ۴۹) اسی کو شریعت کی اصطلاح میں ''اقالہ'' کہتے ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ جو آدمی اپنے سودے پر پچھتارہا ہو اس کو جو شخص فسخ کر دے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے گناہوں کو معاف کرے گا۔(درر الحکام ۱/۱۴۲)

صورتِ مسئولہ میں بائع کو چاہیے کہ خریدار کے مطالبہ پر اس سودے کو فسخ کرنے پر راضی ہوجائے تاکہ اس کو حدیث میں وارد شدہ فضیلت حاصل ہو؛ لیکن اگر بائع اس پر راضی نہیں تو خریدار کو یک طرفہ طور پر سودا فسخ کرنے کا اختیار نہیں، بیع کو فسخ کرنے کے لیے دونوں کی رضامندی شرط ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　　۱۹/ ربیع الآخر ۱۴۲۵ھ

مال پر قبضہ کیے بغیر کسی دوسرے کو بیچنا درست نہیں

سوال: زید ایک بڑا تاجر ہے، عمر نے زید سے ایک ٹن اناج خریدا اور پھر بکر کے ہاتھ دس فیصد نفع لے کر اس طرح بیچ دیا کہ عمر نے زید سے کہا میں نے تجھ سے جو ایک ٹن اناج خریدا ہے وہ مال تو بکر کو پہنچا دے؛ چناں چہ زید نے وہ مال بکر کو پہنچا دیا، اب سوال یہ ہے کہ عمر نے اس مال پر نہ تو قبضہ کیا اور نہ ہی وزن کیا، تو کیا شرعاً یہ خرید و فروخت درست ہے؟

نوٹ: عمر اگر مال کا وزن کرے اور قبضہ کرے تو اخراجات اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ کم نفع پر بھی تجارت نہیں کی جاسکتی، اور اس زمانہ میں عمومی طور پر اسی طرح خرید وفروخت ہوتی ہے۔

الجواب حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بیع (خرید وفروخت) درست نہیں۔ فلا يصح اتفاقا الخ (درمختار) ومن

اشتریٰ شیئا مما ینقل ویحول لم یجز له بیعه حتی یقبضه، لانه علیه الصلوۃ والسلام نهی عن بیع مالم یقبض الخ (هدایه) اناج کے سلسلہ میں یہ مسئلہ مجمع علیہ ہے۔(تکمله فتح الملهم ۱/۳۵۰)

ہوٹل کے حصوں کو کن الفاظ سے بیچنا درست ہے اور کن سے درست نہیں؟

سوال: زید ایک ہوٹل دس ہزار روپیے میں خریدتا ہے اور اس میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے تو یہ کہہ کر شریک کرتا ہے کہ:

(الف) میں نے یہ ہوٹل دس ہزار میں خریدا ہے؛ لیکن اس کو پندرہ ہزار کا قرار دے کر حصہ دار بنانا چاہتا ہوں گویا اس ہوٹل کے سو حصے کرتا ہے تو ایک حصہ ایک سو پچاس (۱۵۰) کا پڑتا ہے جو شخص جتنے چاہے حصے لے سکتا ہے۔

(ب) زید یہ نہیں کہتا کہ یہ ہوٹل اس کو کتنے میں پڑا ہے صرف یہ کہتا ہے کہ ایک حصہ ایک سو پچاس (۱۵۰) کا ہے اور ایسے سو حصے ہیں حالاں کہ زید کو ایک حصہ سو میں پڑا ہے۔

(ج) زید کو یہ ہوٹل دس ہزار میں پڑا ہے؛ لیکن غلط بیانی سے کام لے کر یہ کہتا ہے کہ مجھے یہ ہوٹل پندرہ ہزار میں پڑا ہے اور اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

ان تینوں صورتوں کا شرعاً جو بھی حکم ہو بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف) یہ بیع مرابحہ ہے جو جائز ہے۔(تنویر الابصار ۴/۱۷۰،۱۷۱)

(ب) یہ بھی جائز ہے اس کو فقہاء کی اصطلاح میں بیع مساومہ کہتے ہیں۔(شامی ۴/۱۷۰)

(ج) اس طرح کرنا جائز نہیں ہے، اب اگر اس نے ساتھ میں یہ بھی کہا کہ مجھے جتنے میں پڑا ہے اس حساب سے میں شریک کرتا ہوں تو یہ بیع تولیہ ہوگی، جس کا حکم یہ ہے

کہ اس میں خیانت ثابت ہو جانے پر مشتری (خریدنے والا) اس مقدار خیانت کو ثمن میں سے کاٹ لے گا، اور اس نے صرف اتنا کہا کہ یہ ہوٹل مجھے پندرہ ہزار میں پڑا ہے (حالاں کہ دس ہزار میں پڑا تھا) اور میں اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں؛ لیکن ساتھ میں یہ جملہ کہ ”جتنے میں مجھے پڑا اسی حساب سے شریک کرتا ہوں“ نہیں کہا ہے تو اس صورت میں مشتری (خریدار) کو جب خیانت کا علم ہو اس کو اختیار ہے کہ اس بیع کو فسخ کر دے؛ البتہ قیمت کم نہیں کرسکتا، یعنی مقدار خیانت کو ثمن میں سے کاٹ نہیں سکتا۔ (هنديه ۳/۱٦۲، درمختار ٤/١٧٤، البحر الرائق ٦/١٢٠) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

خرید وفروخت کے چند مسائل

سوال: بعض مرتبہ گاہک دکان پر آکر چند اشیاء کا آرڈر دے جاتا ہے، تاجران اشیاء کو تول کر رکھ دیتا ہے گاہک آکر پوچھتا ہے کتنا پیسہ ہوا تاجر مجموعی قیمت بتاتا ہے اور گاہک پیسے دے کر اپنی خریدی ہوئی چیزیں لے کر چلا جاتا ہے، اس طرح کی خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

سوال: زید ٹریکٹر وغیرہ کے پرزوں کا تاجر ہے، عمر اس سے کہتا ہے کہ میری موٹر فلاں نمبر کی بکر چلاتا ہے اگر کبھی وہ پارٹس (پرزے) وغیرہ لینے آئے تو دے دینا قیمت میں ادا کردوں گا تو کیا اس طرح معاملہ کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب بکر وہ اشیاء لینے آئے اس وقت اس کو ان اشیاء کی قیمت بتلا دے تو کوئی

حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مقررہ وقت گزر جانے پر ثمن مع سود دینے کی شرط لگانا

سوال: کپڑے کی منڈی میں خود منڈی والوں کے کچھ اصول ہوتے ہیں چونکہ علی العموم کاروباری غیر مسلم ہوتے ہیں؛ اس لیے اصول بھی ان لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں جو بسا اوقات ہماری شریعت کے خلاف ہوتے ہیں، اب اگر ہم ان کے خلاف کریں تو ہمیں منڈی سے نکال دیا جائے گا اور منڈی میں ہم سے کوئی معاملہ نہ کرے گا مثلاً جب ہم مال خریدتے ہیں تو قیمت ادا کرنے میں ایک ماہ کی مہلت ملتی ہے، اب اگر ایک ماہ کے اندر اندر ادا کردیں تو کوئی سود نہیں لگایا جاتا؛ لیکن اگر کسی وجہ سے خواہ کیسی ہی شدید مجبوری کیوں نہ ہو کچھ دن مہینہ کے اوپر گزر گئے تو سود دینا پڑتا ہے اور اگر سود نہ دیں تو دوسری بار ہم سے کوئی تاجر معاملہ کرنے پر تیار نہیں ہوتا تو کیا اس طرح کی شرائط کے ساتھ مجبوری خرید وفروخت کرسکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر عقد بیع میں ایسی شرط رکھی گئی ہے تو یہ معاملہ یقیناً سودی ہوگا، اور اگر عقد میں ایسی شرط نہیں ہے تو معاملہ درست ہے، اس کے بعد اگر وہ زائد وصول کرتا ہے تو یہ ظلم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

خریدار کی ملکیت میں دودھ خراب ہوا تو بائع ذمہ دار نہیں

سوال: ایک شخص نے ہوٹل والے سے روزانہ پچاس لیٹر دودھ پہنچانے کا چھ ماہ کا معاہدہ کیا، اور روزانہ ملازم کے ساتھ دودھ بھیجتا ہے اور خود مالک ہفتہ میں ایک روز ہوٹل والے سے ہفتہ بھر کا حساب لینے جاتا ہے، اور اگر کسی روز دودھ خراب ہوگیا تو خریدار

بائع سے کہتا ہے کہ فلاں دن کا دودھ خراب ہوگیا تھا اس کی قیمت نہیں دوں گا یا مقررہ قیمت سے کم دوں گا تو کیا ازروئے شرع اس طرح کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دودھ ہوٹل والے کے قبضہ میں آنے کے بعد پھٹ گیا تو اس کی ذمہ داری بائع پرنہیں ہے۔

واما شرائط ثبوت الخیار فمنها: ثبوت العیب عندالبیع، او بعده قبل التسلیم حتی لو حدث بعد ذلك لایثبت الخیار.(بدائع الصنائع ۳/٦٦، عالمگیری ٥/۲۷٥)

اس لیے ہوٹل والے کا مقررہ قیمت سے کم دینا یا قیمت ہی نہ دینا شرعاً جائزنہیں ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

تجارت کوفروغ دینے کی ایک ناجائزاسکیم

سوال: ایک شخص اپنی تجارت کوفروغ دینے کے لیے یہ صورت اختیار کرتا ہے، کہ ایک گھڑی کی قیمت سو روپیے ہے اور بازار میں بھی اسی قیمت پرملتی ہے، اس کے واسطے پچاس ممبر بنائے گئے، دس دس روپے کی یہ اسکیم دس مہینہ چلائی جائے گی، پہلے مہینہ میں جس شخص کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا اس کودس روپے میں گھڑی دے کراس کا نام ممبری سے خارج کردیا جائے گا، اسی طرح نو ماہ تک جس کا نام آتا جائے گا اس کوگھڑی دے کراس کا نام ممبری سے خارج کیا جاتا رہے گا، اوراس سے روپیے نہیں لیے جائیں گے، دسویں مہینہ اکتالیس اشخاص جو بچے ان کوایک ایک گھڑی دے کراسکیم ختم کردی جائے گی، اس صورت میں کسی کودس روپیے میں کسی کوبیس روپے میں اورکسی کوچالیس روپے میں یہاں تک کہ کسی کوسو روپے میں گھڑی ملے گی؛ لیکن قرعہ اندازی ضروری ہوگی، اب

دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا شرعاً یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم مفصل ومدلل جواب سے نوازیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں بیع صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ مجلسِ عقد میں ثمن کی تعیین نہیں ہو پاتی۔ و جهالة الثمن تمنع صحة البيع. (بدائع الصنائع)

اسی لیے کوئی آدمی اس طرح کوئی چیز فروخت کرتا ہے کہ نقد لو تو اتنی قیمت اور ادھار لو تو اتنی قیمت یا ایک مہینہ کے وعدہ پر لو تو اتنی قیمت اور دو مہینہ کے وعدہ پر لو تو اتنی قیمت تو یہ بیع ناجائز ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ۳/۱۳۶)

البتہ اگر مجلس ہی میں یہ متعین ہو جائے کہ فلاں طریقہ پر لیتا ہوں اور متعاقدین اس پر راضی ہو جائیں تو جائز ہوگی۔

فاذا علم ورضى له جاز البيع لان المانع من الجواز هو الجهالة عند العقد وقد زالت في المجلس. (بدائع الصنائع ۵/۱۵۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

بائع کا ثمن پر قبضہ کیے بغیر وہی چیز کم بھاؤ میں مشتری سے خرید لینا

سوال: زید نے اپنی زمین کی پیدا شدہ یا خریدی ہوئی رائی اپنے پاس رکھی تھی تاکہ بھاؤ بڑھنے پر اس کو بیچے، اسی اثناء میں بکر کو نقد رقم کی ضرورت پڑی، بلاسود کے قرض نہ ملنے پر اس نے زید سے وہ رائی بازار کے عام بھاؤ اسّی روپیے ایک من کے بجائے بڑھا کر سو روپے ایک من کے حساب سے ایک سال بعد قیمت ادا کرنے کے وعدہ پر خرید لی، پھر وہی رائی زید کو اسّی روپے ایک من کے حساب سے نقد قیمت میں بیچ دی اور نقد رقم لی تو کیا اس طرح معاملہ کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ درست نہیں۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیة ١/ ٢٤٥)

لو باع شیئا و قبضه المشتری ولم یقبض البائع الثمن، فاشتراه باقل من الثمن الاول لایجوز الخ. (شامی ٤/ ١٢٨) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

خرید وفروخت کی ایک جائز صورت

سوال: بکر کو کچھ رقم کی ضرورت پڑی تو اس نے زید سے مطالبہ کیا، زید نے اس سے کہا کہ میں نقد رقم تو تجھ کو نہیں دے سکتا؛ البتہ غلہ ادھار دے سکتا ہوں جسے تو بیچ کر نقد رقم بنا سکتا ہے؛ چناں چہ بکر نے اتفاق کرلیا، پھر زید نے عمر سے اسّی روپیہ من کے حساب سے غلہ لاکر بکر کو ایک سال کے وعدہ پر سو روپیے من کے حساب سے بیچ دیا، جس کو بکر نے خرید کر بازار میں اسّی روپے من کے حساب سے بیچ دیا اور رقم اپنے استعمال میں لے آیا، تو اب مذکورہ صورت میں زید کا اس طرح بیع کرنا درست ہے یا کوئی حرج ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے بشرطیکہ زید کا تاجر سے گٹھ جوڑ نہ ہو، اور بکر بعد میں اسی تاجر سے نہ بیچے۔ (کما یفهم من الشامیة ٤/ ٣١١)

گمراہ کن عقائد پر مشتمل کتابوں کی تجارت درست نہیں

سوال: دنیا میں مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں، ساتھ ہی مسالک مختلف ہیں، جس میں سے اسلام کے ماننے والے مسلمانوں کے عقائد میں بھی فرق ہے، بعض مسلمانوں کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ کتابوں کے تاجر کے لیے فاسد العقیدہ کتابوں کی تجارت کیا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:
باطل اور گمراہ کن عقائد کی ترویج واشاعت جس طرح بھی ہو معصیت اور حرام ہے، ایسے عقائد پر مشتمل کتابوں کی طباعت واشاعت اور تجارت بھی اسی حکم میں ہونے کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:﴿و لاتعاونوا علی الاثم و العدوان﴾ (سورۃ المائدۃ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

بلڈر کو دی ہوئی رقم سے زائد وصول کرنا حرام ہے

سوال: بمبئی میں ایک آدمی بلڈنگیں بنوا کر فلیٹ فروخت کرتا ہے، دس سال پہلے اس نے اعلان کیا تھا کہ میں کئی بلڈنگیں بنانے والا ہوں جس کو بھی فلیٹ بک کرانا ہو وہ کرائے اور فلیٹ کے روپیے قسط وار ادا کرنے ہوں گے، یہ اعلان سن کر کئی لوگوں نے روپیے جمع کروا کر فلیٹ بک کرائے؛ البتہ بلڈر نے جتنی بلڈنگیں بنانے کا وعدہ کیا تھا وہ سرکاری پریشانی یا کسی اور وجہ سے بنا نہ پایا اور لوگ تو برابر قسط وار رقم جمع کروا رہے تھے، اب ان رقم جمع کروانے والوں میں سے بعض کو بلڈر نے اگریمینٹ دیے تھے اور بعض کو نہیں دیے تھے، اب آج دس سال کے بعد وہ اعلان کر رہا ہے کہ میں فلیٹ نہ دے سکوں گا؛ لہٰذا جنھوں نے اب تک رقم جمع کروائی ہے وہ اپنی رقم لے جائیں، اور جن کو میں نے اگریمینٹ دیے ہیں ان کو دی ہوئی رقم سے زائد دوں گا اور جن کو اگریمنٹ نہیں دیے ہیں ان کو اتنی ہی رقم دوں گا جتنی کہ انھوں نے جمع کروائی ہے، اب یہ لوگ احتجاج کر رہے ہیں کہ اگریمینٹ نہیں دیا تو یہ قصور بلڈر کا ہے ہمیں بھی زائد رقم چاہیے، مختصر سوال یہ کہ جب فلیٹ بک کرایا تھا تب اس کی قیمت دو لاکھ تھی اور آج دس سال کے بعد چار لاکھ ہے، اب بلڈر کسی وجہ سے فلیٹ نہ دے سکا تو دو لاکھ کے بجائے چار لاکھ دے رہا ہے، تو کیا یہ دو لاکھ

زائد لینا جائز ہے؟ جب کہ خریدنے والے کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ فلیٹ کہاں ملنے والا تھا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جتنی رقم بلڈنگ بنانے والے کو دی تھی اس سے زیادہ رقم اس سے وصول کرنا حرام ہے، چاہے اگریمنیٹ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، یہ زائد رقم سود شمار ہوگی، اور حدیث میں سود لینے اور دینے والے پر لعنت آئی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

رعایتی دام سے خریدی ہوئی چیز زیادہ نفع لے کر بیچنا

علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجۂ ذیل مسائل میں کیا فرماتے ہیں:

سوال: (۱) چند افراد نے مل کر محدود افراد کی (پرائیویٹ لمیٹیڈ) تجارتی سوسائٹی بنائی، جس میں مختلف اقسام کے سامان کی خرید وفروخت ہوتی ہے، یہ سامان سوسائٹی کے ممبران ہی کو فروخت کیا جاتا ہے، تجارتی سوسائٹی کو حکومت کی طرف سے ٹیکس معاف رہتا ہے، مثلاً کسی چیز کی قیمت پندرہ روپیہ ہے، اور پانچ روپے اس پر ٹیکس لگتا ہے تو اس کی قیمت بیس روپے ہو جاتی ہے، مذکورہ چیز بازار میں بائیس روپے میں بکتی ہے، مگر سوسائٹی کے رکن (ممبر) کو وہ چیز پندرہ روپے میں ہی مل جاتی ہے۔

تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ سوسائٹی کا رکن اس چیز کو جو اسے پندرہ روپے میں ملی ہے اور جو اس کی اپنی ملکیت ہے کسی اور شخص کو سترہ روپے میں بیچ سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) سوسائٹی مختلف کمپنیوں سے مال خریدتی ہے، ممبران کو جس مال کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے حصول کے لیے ضروری کاغذات اس کمپنی کے دفتر میں جمع کرنا ہوتے ہیں، اس کے بعد وہ کمپنی اس ممبر کے لیے یومیہ ضرورت کے حساب سے کوٹہ مقرر کرتی ہے، بسا اوقات مقررہ کوٹہ زائد ہو جاتا ہے، تاہم کمپنی کی طرف سے پورے سال کا کوٹہ دیا جاتا ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ کہ کمپنی سے ملنے والے مال کو جو کبھی ضرورت سے زائد بھی ہوتا ہے، اور کبھی ضرورت کے برابر بھی یہ ممبر کسی اور ضرورت مند کو فروخت کرسکتا ہے یانہیں؟ واضح ہو کہ یہاں بھی سوسائٹی کے مال پر حکومت کی جانب سے ٹیکس معاف ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) تجارتی سوسائٹی کے ممبران کو حکومت کی طرف سے ٹیکس میں دی جانے والی رعایت کے نتیجہ میں جو چیز عام بازار میں فروخت ہونے والی اسی نوع کی چیز کے مقابلہ میں ارزاں ملی ہے، سوسائٹی کا ممبر خریدنے کے نتیجہ میں اس کا مالک ہو جاتا ہے، اس کے بعد بحیثیت مالک اس کو اپنی چیز فروخت کرنے کا شرعاً حق ہے، جس قیمت پر چاہے فروخت کرے؛ لیکن اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ اگر اس کا یہ طریق کار خلافِ قانون ہے تو اس میں عزت اور مال کا خطرہ ہے، نفع کے خاطر عزت اور مال کو خطرہ میں ڈالنا دانش مندی کی بات نہیں۔ (ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ ۱۲/۳۴۰)

(۲) اس کا بھی وہی حکم ہے جو اوپر جواب نمبر ایک میں تحریر کیا گیا، البتہ مال کے حصول کے لیے جو ضروری کاغذات کمپنی میں جمع کرائے جاتے ہیں ان میں جھوٹ اور فریب کا ارتکاب نہ ہو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۱۵/صفر المظفر ۱۴۲۵ھ

ایضاً

سوال: ایک تنظیم کے ارا کین کو حکومت کی طرف سے ایندھن کم دام میں مہیا کیا جاتا ہے، مگر اس تنظیم کے بعض ممبران جن کی کشتیاں بند ہیں، یا جنھوں نے ایندھن منظور

ہونے سے پہلے ہی اپنی کشتیاں بیچ ڈالی ہیں، یا ایندھن منظور ہونے کے بعد سال مکمل ہونے سے پہلے اپنی کشتیاں بیچ ڈالیں، اس کے باوجود یہ تینوں طرح کے ممبران حکومت کی مراعات (سہولت) کے ساتھ ایندھن حاصل کر کے اپنے طور پر دوسرے لوگوں کو زیادہ دام میں فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کی طرف سے حاصل شدہ رعایتی دام کے ذریعہ سے خرید کر آدمی مالک ہو جاتا ہے، مالک کو اپنی چیز فروخت کرنے کا حق ہے، جس قیمت پر چاہے فروخت کرے؛ لیکن اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ اگر یہ خلافِ قانون ہے تو پھر عزت اور مال کا خطرہ ہے نفع کی خاطر عزت اور مال کو خطرہ میں ڈالنا دانش مندی کی بات نہیں۔ (فتاوی محمودیہ ۱۲/۳۴۰)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.　　املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۱۵/صفر المظفر ۱۴۲۵ھ

شرکتِ فاسد کی ایک صورت

سوال: زید نے عمر کو تیس ہزار روپے دیے، عمر اس سے ایک آٹو رکشا خریدتا ہے اور خالد کو کرایہ پر دیتا ہے، خالد سے وہ روزانہ ۱۰۰/ روپے لیتا ہے اس میں سے عمر ۶۰/ روپے اپنے پاس رکھتا ہے اور ۴۰/ روپے زید کو دیتا ہے، اس طرح مہینہ میں زید کو ۱۲۰۰/ روپے ملتے ہیں، کاروبار کی شکل ہے اس کی چند شرطیں ہیں:

(۱) جنوری اور جولائی دو ماہ میں زید کو ۱۲۰۰/ روپے نہیں ملتے ہیں۔

(۲) اگر بہت زیادہ خرچ ہو تو وہ زید کو رکشا لوٹا دیتا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ جو بھی خرچ ہو وہ عمرو کے ذمہ ہے۔

(۴) ایک سال تک کا یہ قرار ہوتا ہے، ایک سال کے بعد ہم کو وہ رکشا اگر ہم چاہیں تو مل سکتی ہے؛ البتہ ۳۰۰۰۰/ روپے نہیں مل سکتے۔

تو کیا یہ کاروبار صحیح ہے؟ اور زید کو ہر ماہ ۱۲۰۰/ روپے لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) صورتِ مسئولہ میں اگر زید نے عمرو کو تیس ہزار روپے دے کر زید کے لیے رکشا خریدنے کا وکیل بنایا ہے۔ (جیسا کہ کاروبار کی شرط نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے) تو اس رکشا کا روزانہ کا جو کرایہ آتا ہے (سو روپے) اس کا مالک زید ہے، جنوری اور جولائی میں بھی اگر کرایہ کا معاملہ جاری ہے تو اس کرایہ کا مالک زید ہی ہے، اس رکشا کی مرمت اور بقاء میں جو مصارف بھی ہو (چاہے کم یا زیادہ) ان تمام کا ذمہ دار زید ہے، سال کے بعد رکشا جس کنڈیشن میں بھی ہو اس کا مالک زید ہے، عمر کے لیے روزانہ آنے والے کرایہ میں جو ساٹھ روپے طے ہوئے ہیں وہ درست نہیں؛ بلکہ عام طور پر اجرت پر ایسا کام کرنے والے کو جو اجرت ملتی ہو اتنی اجرت عمر کو ملے گی، بشرطیکہ وہ ساٹھ روپے یومیہ سے زیادہ نہ ہو، خلاصہ یہ ہے کہ یہ کاروبار شرعاً درست اور جائز نہیں؛ بلکہ شرکتِ فاسدہ ہے جس کا ختم کرنا دونوں پر لازم ہے۔

دفع دابتہ الی رجل یوجرھا علی ان الاجر بینھما فالشرکۃ فاسدۃ، والاجر لصاحب الدابۃ وللآجر اجر مثلہ، وکذا السفینۃ والبیت الخ. اھ.

(العقود الدریۃ لتنقیح الفتاوی الحامدیۃ ۱/ ۲۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

الکحل کی خرید و فروخت

سوال: میری دکان میں سینٹ بکتا ہے جو عطر کی قسم ہے جس میں الکحل گرتا ہے،

تو الکحل آمیز عطر استعمال کی گنجائش ہے؟ سنا ہے کہ موجودہ الکحل معدنی ہے اور خمری نہیں ہے، تو کیا یہ تحقیق صحیح ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ سینٹ کا لگانا اور بیچنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

الکحل اگر کشمش یا کھجور سے حاصل کی گئی ہو تو بالاتفاق نجس ہے، اور ان کے سوا کسی دوسری چیز سے بنائی گئی ہو تو شیخینؒ کے نزدیک پاک، اور امام محمدؒ کے نزدیک نجس ہے، تحقیق سے معلوم ہوا کہ آج کل الکحل کے لیے انگور اور کھجور استعمال نہیں کی جاتی؛ لہذا شیخینؒ کے قول کے مطابق پاک ہے؛ اس لیے الکحل آمیز سینٹ کا لگانا اور بیچنا درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

۲۳/ جمادی الاخری ۱۴۲۵ھ

کم قیمت چیز زیادہ قیمت سے دے کر مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا

سوال: ایک آدمی مجبوری میں کسی مال دار سے قرض لیتا ہے، وہ مال دار بجائے نقدی کے سرسوں دیتا ہے مثلاً جس کے بھاؤ اس وقت ۱۰۰۰/ روپیہ کوئنٹل ہے؛ مگر وہ مال دار ایک سال کی ادھاری پر ۱۵۰۰/ روپیہ فی کوئنٹل دے رہا ہے اور یہ طریقہ ہمارے یہاں بہت چل رہا ہے تو اس تجارت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر کوئی مال ادھار پر فروخت کیا جائے اور ادھار کی وجہ سے نقد کے مقابلہ میں قیمت زیادہ تجویز کی جائے تو شرعاً درست ہے، باقی مال دار لوگوں کا مجبور لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نقد رقم قرض دینے کے بجائے (کہ اس میں دی ہوئی مقدار سے زیادہ وصول کرنا سود ہے؛ اس لیے ایک تدبیر کے طور پر) ایسا کرنا پسندیدہ نہیں، مدارنیت

پر ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری
مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک، گجرات

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ نائب مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک، گجرات
الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی معین مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک، گجرات

بی۔پی ایل B P L کارڈ اور راشن کارڈ سے ناجائز فائدہ اٹھانا

سوال (۱) غیر مستحق حضرات (یعنی جو سرکاری شرائط پر پورے نہ اترتے ہوں) ان کا کسی طرح سے بی پی ایل (.B.P.L) کا کارڈ بنالینا اور اس کارڈ پر ملنے والی مختلف راحتوں کا حاصل کرنا (مثلاً دواخانہ کی راحتوں کا حاصل کرنا) ازروئے شرع کیسا ہے؟

(۲) زید نے اپنا راشن کارڈ عمر کو دیا اور کہا کہ اپنے روپیوں سے مٹی کا تیل لاؤ اور پچاس روپیے مجھے دینا کیوں کہ کارڈ میرا ہے، عمر نے کل سو روپیے خرچ کیے پچاس بائع کو دیے، اور دوسرے پچاس زید کو دیے، جب کہ پانچ لیٹر تیل کی قیمت پچاس روپیے ہیں تو کیا اس طرح زید کا کارڈ دینا اور اس کے عوض پچاس روپیے لینا صحیح ہے؟ نیز اس مسئلہ کا کون سے باب کے ساتھ تعلق ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) بی، پی، ایل کارڈ کی حقیقت سے مجھے واقفیت نہیں؛ البتہ اصولی طور پر یہ جان لیں کہ حکومت کی طرف سے بعض لوگوں کو بعض مخصوص شرائط کے ساتھ جو سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں، کسی ایسے آدمی کا جو ان مخصوص شرائط پر پورا نہ اترتا ہو فائدہ اٹھانا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

(۲) راشن کارڈ کے ذریعہ حکومت کم داموں پر جو اشیاء (تیل، شکر، غلہ) مخصوص

حضرات کو دیتی ہے، اس کے لیے حکومت کی طرف سے مخصوص شرائط کی پابندی کی جاتی ہے، جو آدمی ان شرائط پر پورا اترتا نہ ہو اس کے لیے اس طرح کا راشن کارڈ حاصل کر کے اس سے فائدہ اٹھانا جائز اور درست نہیں؛ نیز راشن کارڈ جس کے نام پر جاری کیا گیا ہے حکومت کی طرف سے یہ بھی پابندی ہے کہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی شخص اس راشن کارڈ سے فائدہ اٹھا نہیں سکتا، حکومت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے؛ اس لیے صورت مسئولہ میں زید نے اپنا راشن کارڈ عمر کو دے کر اس سے فائدہ اٹھانے کی جو اجازت دی ہے وہ درست نہیں، یہ ایک نوع کی خیانت ہے؛ نیز اس راشن کارڈ کے استعمال کے عوض میں زید کا عمر سے پچاس روپیے وصول کرنا بیع حقوق کے قبیل سے ہونے کی وجہ سے درست اور جائز نہیں؛ البتہ اگر زید اس راشن کارڈ کے ذریعہ خود تیل خرید کر اسی دام میں یا اس سے زیادہ میں عمر کے ہاتھ فروخت کرے گا تو شرعاً یہ سودا درست ہو جائے گا؛ البتہ اگر حکومتی قانون کے طور پر اس طرح کرنے کی بھی اجازت نہ ہو تو زید کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ
۲۰/ جمادی الاول ۱۴۲۷ھ

ڈِلر (Dealer) اور بینک سے گاڑی خریدنے کی چند صورتیں

سوال: ایک شخص گاڑی خرید رہا ہے خریدتے وقت گاڑی ڈِلر (Dealer) سے گاڑی کی قیمت طے کرتا ہے اور گاڑی ادھار لیتا ہے جس کی تین صورتیں ہیں:

مثلاً: (الف) گاڑی کی قیمت ۱۴,۶۵,۰۰۰

نقد لیتا ہے تو ڈسکاؤنٹ ۱,۲۵,۰۰۰

کل قیمت ۱۳,۴۰,۰۰۰ روپئے

(ب) ادھار لیتا ہے تو ۱۴,۶۵,۰۰۰

نقد ادا کرنا ہے ۶۵,۰۰۰

باقی رہے ۱۴,۰۰,۰۰۰ روپئے

یہ (۱۴,۰۰,۰۰۰) روپئے چار سال کے اندر ادا کرنا طے ہوا ہے جس میں ہر مہینہ (۲۹,۱۶۷) کے چیک ابھی دے دینے ہیں۔

(ج) اگر گاڑی میں ڈسکاؤنٹ نہیں ہے اور چار سال کی ادھاری پر لیتا ہے تو گاڑی کی قیمت ۱۶,۳۳,۰۰۰ نقد ادا کرنا ہے ۶۵,۰۰۰ باقی رہے ۱۵,۶۸,۰۰۰

یہ (۱۵,۶۸,۰۰۰) چار سال کے حساب سے ہر مہینہ کے (۳۲,۶۶۷) کے اڑتالیس چیک ابھی دے دینے ہیں۔

اوپر کیے گئے تینوں معاملوں میں نقد کا ایک چیک اور قسط کا ایک چیک ڈِلر کے نام کا اور باقی تمام چیک بینک کے نام کے ہوتے ہیں، اور دوسری صورت میں نقد کا ایک چیک اور قسطوں کے اڑتالیس چیک رقم بھر کر بغیر نام لکھے یا تو ڈِلر کو یا بینک کو دے دیتے ہیں، اس طرح گاڑی خرید سکتے ہیں یا نہیں؟ براہِ کرم رہبری فرما کر احسان فرمائیں۔ فقط والسلام

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے سوال میں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ گاڑی کی خریداری کس سے کی جارہی ہے؟ یعنی یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ گاڑی بیچنے والا کون ہے؟ ڈلر یا بینک؟ اگر گاڑی بیچنے والا ڈلر ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بینک بیچ میں کیوں آیا؟ سارا معاملہ ڈلر سے ہونا چاہیے، قیمت کی ادائیگی یا چیک سب کچھ ڈلر ہی کے نام کا ہونا چاہیے جیسا کہ سوال میں لکھا گیا ہے، بینک کے نام کے چیک کیوں لکھے جارہے ہیں؟

ہم اصولی طور پر کون سا معاملہ جائز ہے اور کون سا معاملہ ناجائز ہے؟ آپ کو بتلائے دیتے ہیں آپ اس جواب کو سامنے رکھ کر ان معاملات کا حکم سمجھ لیں۔

(۱) اگر ڈلر ہی گاڑی کا بیچنے والا ہے چاہے نقد بیچتا ہو یا ادھار قسطوں پر، اور سارا معاملہ ڈلر ہی سے ہو رہا ہے اندر میں بینک کا کوئی دخل نہیں، اور اس صورت میں نقد گاڑی خریدنے پر ادھار کے مقابلہ میں قیمت کم طے ہوتی ہے اور ادھار خریدنے پر نقد کے مقابلہ میں قیمت زیادہ طے ہوتی ہے؛ لیکن سودا کرتے وقت یہ بات صاف کردی جاتی ہے کہ یہ سودا نقد ہے یا ادھار تو اس صورت میں یہ معاملہ شرعی اعتبار سے درست ہے۔

(۲) اسی طرح بیچنے والا بینک ہے اور اوپر لکھی ہوئی تفصیل کے مطابق دونوں صورتیں ہیں تو اس صورت میں بھی معاملہ جائز ہوگا۔

(۳) اور اگر بیچنے والا تو ڈلر ہے اور بینک خریدنے والے کی طرف سے ڈلر کو ابھی پوری قیمت ادا کردیتا ہے، اور پھر آئندہ قسطوں کی شکل میں اپنی ادا کی ہوئی رقم کچھ زائد مقدار کے ساتھ خریدنے والے سے وصول کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بینک نے خریدنے والے کی طرف سے قیمت کی جو مقدار ادا کی، بعد میں آگے چل کر بینک وہ قیمت خریدنے والے سے سود کے ساتھ وصول کر رہا ہے چونکہ اس میں سود دینا لازم آتا ہے؛ اس لیے شرعاً یہ معاملہ درست نہیں۔

نوٹ: عام طور پر خریداری کے وقت صرف اتنا دیکھا جاتا ہے یہ گاڑی ادھار اتنی رقم میں ملی جس کو قسطوں کی شکل میں بینک کو اتنی مدت میں ادا کرنا ہے، اور اندر میں جو کاغذات تیار ہوتے ہیں وہ اسی طرح کے ہوتے ہیں کہ ڈلر کے پاس سے خریدنے والا گاہک ہے اور بینک خریدنے والے کی طرف سے ڈلر کو ساری رقم ادا کردیتا ہے، اور بعد

میں اپنے اصول کے مطابق خریدار سے وہ رقم سود کے ساتھ وصول کرتا ہے اور یہ ساری کارروائی بینک جاکر نہیں ہوتی بلکہ ڈلر کے شوروم ہی میں ایک ٹیبل بینک والے کا ہوتا ہے اور وہیں سے یہ سب کام انجام دیا جاتا ہے، جولوگ سارے معاملہ کے اندر کی تفصیلات سے واقف ہوتے ہیں وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں، اور جولوگ اس کاغذی کارروائی کی اندرونی تفصیلات سے واقف نہیں ہوتے ان کو پتہ نہیں چل پاتا اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ۵٪ بیاج (سود) سے گاڑی خریدی، اور پھر مفتیان کرام سے اسی طرح سوال کرتے ہیں کہ ۵٪ بیاج (سود) سے گاڑی خریدنا درست ہے کہ نہیں؟ مفتی کے سامنے جب یہ بات رکھی جاتی ہے کہ بیاج (سود) ہے ہی نہیں تو پھر وہ جائز ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اس لیے آپ نے سوال میں جو صورتیں لکھی ہیں اس میں آپ یہ دیکھ لیجیے کہ معاملات کے اندر میں کوئی ایسی صورت تو نہیں جس کے نتیجہ میں بینک نے گاہک کی طرف سے ڈلر کو قیمت ادا کی ہو اور بعد میں چل کر اپنی رقم زیادتی کے ساتھ وصول کر رہا ہو، اگر ایسا ہے تو سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے یہ جائز نہیں، چاہے اس کو کوئی سا بھی نام دیا جائے۔

اوپر جواب میں جو تین صورتیں لکھی ہیں، اس میں دوسری صورت جس میں بینک کو بیچنے والا بتلایا گیا ہے وہ ایک حکم بتلانے کی غرض سے ہے ورنہ جیسا کہ ہمارے علم میں ہے بینک خود خرید و فرخت کا معاملہ قانونی طور پر نہیں کرسکتا ہے۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۷/۹/۱۴۲۷ھ

باب الربوٰا

بلاضرورت بینک میں رقم جمع کرنا اور ملنے والا سود مدارس پر خرچ کرنا

سوال: ہمارے یہاں انگلینڈ میں کچھ مسلمان بینک یا بلڈنگ سوسائٹی (یہ بھی بینک جیسا کاروبار کرتے ہیں) میں سودی کھاتے میں اپنی رقم جمع کروا کر اس پر جو سود ملتا ہے وہ سود غریبوں، مدرسوں میں دے دیتے ہیں، کیا اس طرح سود لینا جائز ہے؟ جبکہ یہاں بنکوں میں ایسے کھاتے کھولنے کی سہولتیں بھی ہیں جن میں رقم جمع کروانے والے کو بینک سود نہیں دیتی، ایسے کھاتوں کو کرنٹ اکاؤنٹ کہتے ہیں، ان کھاتوں میں ایک سہولت یہ بھی ہے کہ رقم جمع کروانے والا کسی کو بھی نقد رقم کے بجائے چیک کی صورت میں رقم ادا کر سکتا ہے، کیا ایسی سہولت کے باوجود بھی بینک میں سود والے کھاتے یعنی اکاؤنٹ میں رقم رکھ کر اس پر سود لے کر غریبوں اور مدرسوں کو دینا جائز ہے؟ مدرسوں اور غریبوں کو سود والی رقم دینے کی وجہ سے لوگوں میں چند قباحتیں بھی پیدا ہوگئی ہیں، مثلاً جو مسلمان بینک میں دو ہزار پونڈ جمع کرواتا ہے تو اس کو ایک سال کے بعد اس رقم پر آج کل تقریباً ۱۶۰ پونڈ سود ملتا ہے، اور اس پر مزید ۵۰ پونڈ زکوٰۃ بھی فرض ہوجاتی ہے، تو کیا وہ ایک سال میں ۲۱۰ پونڈ اس میں بہ آسانی ادا کرے گا، اگر کسی نے اتنی رقم نکال بھی دی تو پھر وہ للہ خرچ کرنے میں بخل کرے گا، اور اکثر لوگ ایسا کر بھی رہے ہیں کہ جب وہ اتنی بڑی رقم سود کی غرباء اور مدرسوں کو دیں گے تو ان کو للہ جہاں تک زکوٰۃ ادا کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ براہِ کرم اس مسئلہ پر تفصیلاً روشنی ڈالیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سود کی حرمت منصوص اور قطعی ہے۔ ﴿وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام

قرار دیا) سود کی حرمت جب نازل ہوئی اس وقت جن لوگوں کا پہلے سے باقی تھا اس کو وصول کرنے کی بھی ممانعت فرمادی گئی بلکہ اس کو شرط ایمان کے برابر قرار دیا۔﴿وَ ذَرُوا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ (سود کا بقایا چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو) جو لوگ سود لینے سے باز نہ آئے ان کے لیے اعلانِ جنگ ہے۔﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (اگر تم نے ایسا نہ کیا، یعنی سود کا بقایا نہ چھوڑا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے) سود خوار کے حشر کو قرآن پاک میں اس طرح بیان کیا گیا۔﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے روز اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو) سود لینے والے، سود دینے والے، سود کا رقعہ لکھنے والے، سود کی گواہی دینے والے پر حدیث میں لعنت آئی ہے۔ لعن رسول اللہ ﷺ آكل الربوٰ، وموكله، وكاتبه، و شاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شریف)

بلاضرورتِ شدیدہ بینک میں روپیہ جمع کرانے کی اجازت نہیں ہے؛ اس لیے کہ تعاون علی الاثم ہے؛ اس لیے اولاً تو بینک میں روپیہ داخل ہی نہ کیا جائے؛ البتہ اگر رقم کی حفاظت کی کوئی اور صورت نہ ہو تو بدرجۂ مجبوری رقم جمع کرانے کی اجازت دی گئی ہے، اور شریعت کا قاعدہ ہے کہ "الضرورة تتقدر بقدر الضرورة" (جس کام کی اجازت کسی ضرورت کی وجہ سے دی گئی ہو وہ ضرورت کی حد تک ہوتی ہے) جب وہ ضرورت کرنٹ اکاؤنٹ سے پوری ہو جاتی ہے جس میں سود لینا نہیں پڑتا، تو پھر ایسا کھاتہ کیوں جاری کرایا جائے جس میں سود لینا پڑتا ہے، پھر یہ رقم غرباء و مساکین اور مدارس کو جو دی جاتی ہے اس کا مقصد تو اس کے وبال کو دور کرنا ہے نہ کہ ثواب حاصل کرنا؛ بلکہ اگر کوئی آدمی اس رقم سے

ثواب کی نیت کرے تو یہ نہایت خطرناک بات ہے، جب شروع سے ہی اپنے آپ کو اس وبال سے بچانا ممکن ہے تو پھر یہ کونسی دانشمندی اور دیانت ہے کہ اس وبال کو اختیاری طور پر اپنے سر لیا جائے اور پھر اس کو دور کرنے کی تدبیر اختیار کی جائے، کوئی بھی سمجھدار آدمی اس لیے زہر نہیں کھا سکتا کہ اس کے پاس تریاق موجود ہے۔ پھر دینی اور مذہبی اداروں کو اگر حرام مال سے چلایا جائے گا تو ان سے ایسے لوگ تیار ہو کر نکلیں گے جو خود بھی حرام وحلال کی تمیز سے بے بہرہ ہوں گے اور قوم کو حرام سے روکنے کا جذبہ بھی ان میں نہیں ہوگا، اس طرح ایسے لوگوں کو تیار کرنا ظاہر ہے کہ کوئی دینی خدمت نہیں جس سے رضاءِ خداوندی میسر آسکے جو کہ مسلمان کی خلقت کا اصل مقصد ہے؛ نیز اس میں سود کی قباحت کو لوگوں کے قلوب سے کم کرنا لازم آتا ہے جو مقاصد دین کے صریح منافی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ ذوی الحجۃ الحرام ۱۴۰۷ھ

بینک کے توسط سے رکشہ خریدنا

سوال: ایک آدمی کو رکشہ خریدنا ہے؛ لیکن اس میں بینک کا وسیلہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے: رکشہ اگر براہ راست اپنے نام پر خریدا جائے تو مثلاً تیس (۳۰) ہزار میں ملتا ہے اور اگر بینک کے واسطے سے خریدا جائے تو ۳۲/ ہزار میں ملتا ہے، اس شکل میں رکشہ کی چوتھائی قیمت کا حصہ پیشگی اور بقیہ رقم قسط وار ادا کرنی ہوتی ہے، رکشہ بینک کے نام رہے گا اور اس میں کچھ تصرف مثلاً بیچنے کا اختیار ہم کو نہیں ملے گا؛ لیکن جو نقصان ہو اس کی تلافی خود کرنی ہوگی، بینک اس کی ذمہ دار نہیں، قسط وار رقم پوری ہونے پر رکشہ ہمارے نام پر ہوگا اور تب جا کر اس میں تصرف کا حق بھی ملتا ہے اس صورت میں بینک کے وسیلے سے رکشہ خریدنا درست ہے یا نہیں؟ اور زائد رقم (مثلاً دو ہزار) کیا سود ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر معاملہ اس طرح کیا جائے کہ بینک کمپنی سے رکشہ خرید کر آپ کو بتیس (۳۲) ہزار میں فروخت کرے جس کی قیمت کا ایک چوتھائی آپ پہلے ادا کریں اور بقیہ رقم بالاقساط ادا کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (نظام الفتاوی ۱/۴/۳۰) فقط واللہ اعلم بالصواب.

حکومتی ٹیکسوں میں سودی رقم دینا

سوال: حکومت وقت کی طرف سے لگائے گئے ٹیکس: مثلاً پانی کا ٹیکس، گھر کا ٹیکس، سڑک کا ٹیکس، قحط زدہ علاقوں میں راحت رسانی کے لیے ہنگامی ٹیکس؛ وغیرہ میں سودی رقم سے ادائیگی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سود کی جو رقم سرکاری محکمہ سے حاصل ہوئی ہے اس کو سرکار کی طرف سے لگائے گئے غیر واجبی ٹیکس میں ادا کرنا درست ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۴/۳/۲۰۳) حکومت کی طرف سے پانی پہنچانے کا جو انتظام کیا جاتا ہے اس پر اگر ٹیکس لیا جاتا ہے تو اس کو غیر واجبی نہیں کہا جاسکتا، سڑک بھی اسی حکم میں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سوال: میں ایک مسجد کے وقف میں خدمت دے رہا ہوں، وقف کے قانون کے اعتبار سے آمدنی بینک میں رکھتے ہیں، اس آمدنی کا معتد بہ سود بینک میں جمع ہوا ہے، اب سود کی رقم کرایہ پر دیے ہوئے مسجد کی ملکیت کے وقف مکانات کے ہاؤس ٹیکس میں میونسپلٹی کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سرکاری بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم غیر واجبی ٹیکس میں سرکار ہی کو دے دی

جائے، یا پھر محتاج کو دے دی جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۲۰۳) ہاؤس ٹیکس کو غیر واجبی ٹیکس میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان الدار لا مؤنة فیها اصلا. (شامی) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مکان وغیرہ بنانے کے لیے سرکار سے لون لینا

سوال: مکان بنانے یا جانور خریدنے کے لیے سرکار کی طرف سے لون کی رقم ملتی ہے ان میں سے دو حصے واپس کرنے پڑتے ہیں اور ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے تو اس رقم کے متعلق کیا حکم ہے لینا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمد علی (راجستھان)

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

لون کی واپس کی جانے والی کل مقدار اس کی ملنے والی مقدار کے برابر یا اس سے کم ہے تو اس کا لینا درست ہے، ورنہ سود ہے جو جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سودی آمدنی سے دی ہوئی تنخواہ حلال نہیں

سوال: ہم کسی مکتب یا لائبریری میں دینی تعلیم دیتے ہیں، لائبریری چلانے والا تاجر ہے مگر سودی لین دین کرتا ہے تو کیا وہ تنخواہ ہمارے لیے حلال ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر آپ کی تنخواہ سودی آمدنی سے دی جاتی ہے تو وہ حلال نہیں ورنہ حلال ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سود کی رقم مسجد کے طہارت خانہ میں استعمال کرنا جائز نہیں

سوال: ایک مسلمان کا روپیہ بینک میں جمع ہے، اس روپیے پر ملنے والے سود کا استعمال مسجد کے طہارت خانہ میں کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مالک کو اپنی اصل رقم سے زائد جو رقم سود کے نام سے ملی ہے وہ واجب التصدق ہے۔ اور شرع میں صدقہ جب مطلق بولا جائے تو صدقہ تملیک پر محمول ہوتا ہے، جس کا مصرف فقراء اور مساکین ہیں، تعمیری کاموں میں اس کا صرف کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس میں تملیک نہیں پائی جاتی۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ "اشباع الکلام فی مصرف الصدقة من المال الحرام" جو فتاوی دارالعلوم، امداد المفتیین میں ہے اس کا مطالعہ کرلیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سود کی رقم سے بیت الخلاء بنوانا درست نہیں

سوال: ایک بستی ہے وہاں چار پانچ گھر ہیں، یعنی وہ بستی غریب کی ہے تو اپنی سود کی رقم سے بیت الخلاء بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اس بستی کے لوگ آٹھ سو، ہزار تک مہینہ کماتے ہیں، اگر سود کی رقم مذکورہ مصرف میں استعمال نہیں کر سکتے تو کہاں استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سود کی رقم بلا نیت ثواب اس کا وبال دور کرنے کے لیے کسی محتاج فقیر، مسکین کو دے دی جائے، وہ مالک بننے کے بعد جہاں چاہے اپنی مرضی سے خرچ کرسکتا ہے آپ ابتداءً کسی بھی تعمیری کام میں نہیں لگا سکتے۔ (اشباع الکلام للمفتی محمد شفیع) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بینک سے حاصل شدہ سود سے بیت الخلاء بنانا کیسا ہے؟

سوال: بنکوں سے جو سود ملتا ہے اس سود کی رقم سے مسجد، مدرسہ یا خود کے مکان کے بیت الخلاء، غسل خانہ اور حمام وغیرہ بنا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بینک سے بطورِ سود حاصل ہونے والی رقم کا صدقہ کردینا ضروری ہے، یعنی ثواب کی نیت کے بغیر کسی محتاج کو دیدی جاوے، اس کے بعد وہ اپنے طور پر جہاں چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سود کی رقم سے مسجد کا بیت الخلاء بنانا درست نہیں

سوال: زید نے سود کے پیسوں سے مسجد کا بیت الخلاء بنوایا، اب زید مسجد میں معتکف ہے تو قضائے حاجت کے لیے اس بیت الخلاء میں جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سود کی رقم اس کا وبال دور کرنے کی نیت سے ثواب کی امید کے بغیر کسی غریب محتاج کو بطورِ تملیک دی جائے۔ اس رقم سے مسجد کے بیت الخلاء کی تعمیر درست نہیں۔ (اشباع الکلام) فقط واللہ تعالیٰ أعلم وعلمہ أتم وأحکم.

مسجد کی رقم پر ملنے والے سود کا مصرف کیا ہے؟

سوال: ایک مسجد کا روپیہ بینک میں جمع ہے اس رقم پر ملنے والے سود کا کیا مصرف ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس کا مصرف فقراء ومساکین ہیں، اس پر مسجد کی ملک ثابت ہی نہیں ہوتی ہے؛ البتہ اگر وہ سود حکومتی بینک سے حاصل ہوا ہے تو حکومت کی طرف سے عائد ہونے والے غیر واجبی ٹیکس کی ادائیگی میں دیا جاسکتا ہے، وہ بھی اس لیے کہ اس نام سے وہ اصل کی طرف واپس ہورہا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بیمہ درحقیقت قمار اور ربا پر مشتمل ہے

سوال: زید اپنے گھر کا ایک قابل شخص ہے کہ بظاہر اسی کی کمائی پر اس کے اہل

خانہ، والدین وغیرہ کا گزر ہے؛ نیز اس کے اور اس کے والدین کے ذمہ غیر معمولی قرض بھی ہے، جو سوال یا اشراف کا موجب ہوسکتا ہے، زید کا ایک ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہو گیا اور اس میں زید کا انتقال ہو گیا، اب زید کے گھر والوں کے لیے سرکاری قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ٹرک کا جس بیمہ کمپنی سے ربط ہے بیمہ پاس کروانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بیمہ کی اصل حقیقت قمار اور ربوٰ پر مشتمل ہے، جو ناجائز اور حرام ہے؛ البتہ اگر زید کی موت ٹرک کی ٹکر سے واقع ہوئی ہے تو ٹرک کا ڈرائیور ضامن ہوگا، اور اس سے زید کی دیت وصول کی جاسکتی ہے۔ والظاهر ان سائق السيارة ضامن لمااتلفه في الطريق سواء اتلفه من القدام او من الخلف. (تکملة فتح الملهم ۲/۵۲۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

رفاہی کاموں میں سود کی رقم دینا جائز نہیں

سوال: جو روپیہ بینک میں رکھا جاتا ہے اس پر جو سود ملتا ہے اس کا استعمال کہاں کہاں جائز ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں دھرم پور میں نگر پنچایت کی طرف سے گاؤں کا پانی نکالنے کے لیے گٹر بنوایا جارہا ہے جس میں ہر گھر والے سے کچھ رقم لی جارہی ہے تو کیا بینک سے ملا ہوا سود گٹر یوجنا میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ایک جنرل گٹر ہوگا جس میں ہر گھر والے کا کنکشن جوڑا جائے گا تو اپنے گھر کے باڑے سے جنرل پائپ تک اپنے روپیے سے خرچ ہو، اور جنرل میں سود کی رقم دی جائے یا دونوں میں سود کی رقم دی جائے گی تو کیا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی ضرورت شدیدہ کے پیش نظر بینک میں رکھی ہوئی رقم پر جو سود ملتا ہے اس کو

اس کے وبال کو دور کرنے کی نیت سے (بلا نیت ثواب) غرباء ومساکین کو بطور تملیک دے دیا جائے، گٹر یوجنا میں یہ رقم نہ دی جائے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مقروض آدمی کو سود کی رقم دے سکتے ہیں

سوال: ایک صاحب ملازم ہے اور ذرائعِ آمدنی ملازمت کے سوا کچھ نہیں اور وہ صاحب مقروض ہے اور بال بچوں کا خرچ بھی زیادہ ہے، تو کیا ایسے آدمی کو سود کی رقم دی جاسکتی ہے تا کہ وہ قرض ادا کرے، اور یہ سود کی رقم حکومت دے رہی ہے، وہ اس طرح کہ تقریباً آٹھ سال قبل بھینسوں کے مالکین اور حکومت کے درمیان تنازع تھا کہ حکومت ریلوے میں بھینسوں کو بمبئی سے گجرات، اور گجرات سے بمبئی لے جانے کا کرایہ زیادہ مانگتی تھی، اور مالکین کم دینا چاہتے تھے؛ بہرحال حکومت نے زبردستی کرایہ زیادہ لیا مگر آج آٹھ سال کے بعد مالکین مقدمہ جیت گئے تو حکومت وہ زائد کرایہ جو اس نے اب تک لیا سود کے ساتھ لوٹا رہی ہے، اسی سود کے متعلق سوال ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایسے آدمی کو وہ رقم بطور تملیک دے دی جائے، اس کے بعد وہ اس سے اپنا قرض ادا کرسکتا ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

جیون بیمہ میں ملی ہوئی رقم کا صدقہ کرنا ضروری ہے

سوال: ایک لڑکے کا انتقال ہوا، اس نے اپنی زندگی میں جیون بیمہ پالیسی اختیار کی تھی، اب اس کی موت کے بعد جیون بیمہ پاس ہوا ہے، کمپنی کی طرف سے اس کے گھر والوں کو جیون بیمہ کی رقم ملی ہے، اور اس کے گھر والے پیسہ والے مال دار ہیں؛ لہٰذا جیون بیمہ میں ملی ہوئی رقم کو اس کے گھر والے کہاں کہاں خرچ کرسکتے ہیں؟ واضح رہے کہ اس

کے ورثاء میں ماں، باپ، بیوی اور ایک لڑکا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جان کا بیمہ ہر حالت میں حرام و ناجائز ہے، اب جو رقم ملی ہے اس میں سے اتنی رقم جو اس نے بیمہ کمپنی کو ادا کی تھی وہ تو اس کے ورثاء میں (بعد ادائے دین و نفاذِ وصیت از ثلث) بقدر حصص تقسیم کر دی جائے، (یعنی کل چوبیس سہام بنا کر زوجہ کو تین، باپ کو چار، ماں کو چار اور لڑکے کو تیرہ سہام دیے جائیں) اور جو رقم زائد ملی ہے یعنی اس کی دی ہوئی رقم سے زائد کا صدقہ کر دیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

سرکاری ٹیکس سے بچنے کے لیے سودی قرض لینا کیا درست ہے؟

سوال: آج کل سرکاری ٹیکسوں سے بچنے کے لیے عام طور پر بڑے تاجر کاروبار کے منافع میں بہت تھوڑا سا حصہ پکے حساب میں ظاہر کرتے ہیں، اور زیادہ تر حصہ چھپاتے ہیں تاکہ سرکار کو ٹیکس کم ادا کرنا پڑے، اس طرح کے چھپائے ہوئے حصے کو آج کل کی اصطلاح میں بلیک (سیاہ) رقم کہتے ہیں، جس کو دوسرے لفظوں میں غیر قانونی بھی کہہ سکتے ہیں، اور پکے حساب میں ظاہر کی ہوئی رقم کو وہائیٹ (سفید) رقم کہا جاتا ہے، اس طرح کی سیاہ رقم کو سفید رقم بنانے کی کچھ صورتیں بھی ہیں جن کو کاروباری حضرات جانتے ہیں، ان میں سے ایک شکل بینک سے لون لینے کی ہے جس میں سود بھی دینا پڑتا ہے؛ لیکن دقت کم ہوتی ہے اور دیگر صورتوں میں بھی فی صد کچھ رقم تو دینی پڑتی ہے؛ لیکن دقت زیادہ ہوتی ہے۔

بینک سے لینے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ایک لاکھ روپے کا کاروبار کرنا ہے اس کے پاس اتنی بلکہ اس سے زائد رقم موجود بھی ہے؛ لیکن سب قانونی نہیں ہے؛ اس لیے اس کو ظاہر نہیں کر سکتا؛ لہذا بینک سے رقم سود پر لیتا ہے جس کو پھر وہ مع سود ادا کر دیتا ہے۔

اور بینک کے علاوہ قانونی بنانے کی شکل یہ ہے کہ مثلاً ایک تاجر کے پاس سفید رقم کافی مقدار میں موجود ہے اس سے قرض لیا جائے؛ لیکن اس صورت میں اس تاجر کو حکومت کو ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے؛ اس لیے یہ تاجر بھی اپنے مقروض سے فی صد کچھ رقم (سود) لیتا ہے، اور بعض بڑے تاجر تو اس کو مستقل کاروبار کے طور پر ہی کرتے ہیں۔

اب سوال طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں قسموں کی شکلوں میں سے شرعاً جائز کون سی شکل ہے؟ بالفرض اگر دونوں کا حکم ایک ہی ہے تو بہتر کون سی شکل ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سیاہ رقم کو سفید بنانے کے لیے بینک سے یا کسی بڑے تاجر سے رقم قرض لینے کی صورت میں سود دینا پڑتا ہے، تو ٹیکس میں چوری کر کے جو رقم بچائی تھی وہ اس راہ سے گئی، فرق صرف اتنا ہے کہ سود والی صورت اپنی پسند فرمودہ اور اختیار کردہ ہے گویا اپنی مرضی سے سود دینے کے لیے آمادہ ہوا، اور ٹیکس والی صورت اضطراری یعنی غیر اختیاری ہے جس کی وجہ سے اس کا وبال خود پر نہیں پڑتا ہے، تو پھر رقم کو سیاہ اور سفید بنانے کا مکر کرنے کے بجائے شروع ہی سے سفید بنانے کی صورت کیوں نہ اختیار کی جائے؛ اس لیے آپ نے سفید بنانے کی جو دو صورتیں تحریر فرمائی ہیں دونوں ہی ناجائز ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

بینک سے حاصل شدہ سود کو نفع کا نام دینے سے سود کی حقیقت بدل نہیں جاتی

سوال: یہاں ایک صاحب کہتے ہیں کہ بینک سے حکومت ہم کو جو سود دیتی ہے وہ ہمارا نفع ہے؛ اس لیے کہ اگر لوگ بینک میں روپیے جمع نہ کریں تو حکومت اپنے کام نہیں کر سکتی مثلاً حکومت روڈ کا کام کرتی ہے، بڑے بڑے بریج (پل) بناتی ہے، اسی طرح بڑے بڑے کارخانے اور بلڈنگ بناتی ہے، تو حکومت بینک سے روپیہ لیتی ہے اور کام

کرتی ہے گویا ہمارا روپیہ تجارت میں لگ گیا؛ اس لیے یہ پیسہ جو حکومت ہمیں سود کے نام سے دیتی ہے وہ دراصل ہمارا منافع ہے، ان صاحب کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو حضرات بینک سے حاصل ہونے والے سود کو نفع کا نام دے رہے ہیں، یہ وہی نظریۂ جاہلیت ہے جس کو قرآن پاک نے ﴿إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا﴾ سے بیان کیا ہے، نفع کا نام دینے سے سود کی حقیقت نہیں بدل جاتی، یہ سود ہی ہے اور حرام ہے اس سلسلہ میں تفصیل مطلوب ہو تو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ مسئلہ سود (جو اس موضوع پر ہے اور مفصل ہے) کا مطالعہ فرمائیں، نیز معارف القرآن میں بھی اس کی بقدر ضرورت تفصیل فرمائی گئی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

گروی رکھی ہوئی زمین سے انتفاع درست نہیں

سوال: (۱) زید نے احمد کے پاس اپنی زمین گروی رکھ دی، تو کیا احمد اس زمین سے فصل حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟

(۲) کیا گروی رکھی ہوئی زمین سے باجازت مالک نفع حاصل کرنا سود میں داخل ہے؟

(۳) اگر یہ معاملہ سودی ہوگیا تو پھر اس معاملہ کو کس ترکیب سے حلال کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱/۲) انتفاع مرہون سے اگر مشروط یا معروف ہو جیسا کہ آج کل ہے اور ربوا حرام ہے، اور ربوا اذن سے حلال نہیں ہوتا۔ (امداد الفتاویٰ ۳/۴۵۴)

قال ط. قلت: والغالب من احوال الناس انهم انما يريدون عند الدفع الانتفاع الخ. (شامی ۵/۳۴۳)

(۳) مرتہن (احمد) اس سے فصل حاصل نہ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایل، آئی، سی (.L.I.C) کی رکنیت لینا درست نہیں

سوال: ایک صاحب .L. I.C کی رکنیت لیے ہوئے ہیں، یعنی انہیں ہر ماہ ساٹ سو پینتیس روپیے کے حساب سے چھ سال تک رقم جمع کرانی ہے، جو مجموعی اعتبار سے پچاس ہزار کے قریب قریب ہوتی ہے اور جب وہ رقم نکالیں گے تو پچاس ہزار سے بڑھ کر انہیں ستتر ہزار (۷۷۰۰۰) روپیے ملیں گے تو کیا یہ زائد رقم لینا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زندگی کا بیمہ ناجائز ہے، اس میں قمار (جوا) اور سود دونوں قسم کے گناہ ہیں، اور گناہ بھی بڑے سنگین گناہ، حدیث میں سود دینے والے اور لینے والے اور سودی معاملہ لکھنے والے اور اس کے گواہ بننے والوں پر لعنت آئی ہے۔ (مشکوٰۃ)

اور ایک روایت میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ سودی معاملہ کرنے والے کو ستر قسم کے گناہ لاحق ہوتے ہیں، جن میں ادنی درجہ کا گناہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر ہے، نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ سود کے ایک درہم کا کھانا (اپنے استعمال میں لانا) اللہ تعالیٰ کے یہاں چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ (مشکوٰۃ ۲۴۶)

جس مسلمان کے دل میں حضور ﷺ کے فرمانِ مبارک کی عظمت و وقعت ہو وہ کبھی ایسا معاملہ کرنے کی جرأت نہ کرے گا۔ (ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ ۲/۲۰۰)

اس میں جو زائد رقم ملتی ہے اس کا اپنے استعمال میں لانا حرام ہے، وہ رقم اس کا وبال دور کرنے کی غرض سے بلانیت ثواب فقراء اور مساکین کو بطور تملیک دے دینا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

فکس ڈپازٹ سے حاصل شدہ رقم کا استعمال، سودی رقم سے بنائی گئی عمارت میں نماز ومکتب کا حکم

محترم ومکرم مفتی صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاته

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، دیگر عرض کہ مندرجہٗ ذیل صورت مسئلہ پر غور وخوض فرما کر تحریر کردہ سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں۔

صورتِ مسئلہ: ہمارے بستی والوں کا بمبئی میں ایک روم ہے، جو ایک مدت تک گاؤں ہی کے چند حضرات کے ماتحت تھا، اس کمرہ کی آمدنی بینک میں جمع کرتے گئے، ایک بڑی رقم ہونے کے بعد وقفہ وقفہ سے تقریباً تین مرتبہ وہ رقم فکس ڈپازٹ میں ڈالی جس کی ایک بڑی رقم ہاتھ آئی، اب ان بزرگوں نے سوچا کہ اس رقم سے کوئی بڑا کام کریں جو ''جماعت المسلمین مراد پور'' کے کچھ کام آسکے، چنانچہ گاؤں ہی میں ایک شخص نے اپنی ایک زمین ''جماعت المسلمین مرادپور'' کو وقف کی تھی، اس زمین پر انھوں نے ایک دو منزلہ عمارت تعمیر کرائی، جس میں نچلے حصہ میں امام صاحب کے لیے فلیٹ، ایک روم جماعت کے سامان رکھنے کے لیے اور دو کمرہ تجارت کرنے والوں کے لیے مختص کردیے، جن سے بھاڑا وصول ہوتا رہے گا، اور اوپر والے حصہ میں ایک وسیع وعریض ہال بنایا جہاں گاؤں کا مدرسہ (مکتب) شروع کرنا چاہتے ہیں، اور بوقت ضرورت اس میں نمازیں بھی ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ قابلِ استفسار امور یہ ہیں کہ:

(١) فکس ڈپازٹ کے ذریعہ حاصل شدہ رقم کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو مکمل وضاحت درکار ہے تاکہ چند معاندین کو مطمئن کرسکیں۔

(۲) کیااس عمارت میں مکتب شروع کر سکتے ہیں؟ نیز گاؤں میں موجودہ مسجد (تعمیرِ نو کے خاطر) شہید کرنے پر عارضی طور پر اس ہال میں نمازیں ادا کرنا درست ہوسکتا ہے؟

(۳) تعمیر تقریباً مکمل ہونے کے بعد اس کا پتہ چلا کہ اس کے لیے اس نوعیت کی رقم صرف کی گئی ہے، تو آپ سے التماس ہے کہ اسلامی و فقہی نقطۂ نظر سے ہماری رہنمائی فرمائیں کہ اس تعمیر شدہ عمارت کو کیا کیا جائے؟ عین نوازش ہوگی۔ بینوا و توجروا.

الجواب حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) قرآن اور احایث میں سود لینے اور دینے پر بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے سود کے لینے والے، اور دینے والے، اور اس کا رقعہ لکھنے والے، اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے؛ نیز جانتے ہوئے سود کے ایک درہم کھانے کو چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت بتلایا گیا ہے، اس کے علاوہ بھی بہت ساری وعیدیں سود لینے اور دینے پر قرآن وحدیث میں موجود ہیں، اسی لیے سود کا لینا اور دینا سخت حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

بینک کا سارا کاروبار یہی ہے، یعنی وہ سود پر رقم لیتی اور دیتی ہے؛ اس لیے بینک میں رقم جمع کرانا حرام ہے، البتہ اگر قانونی مجبوری کی وجہ سے رقم جمع کرانے کی نوبت آئی تو اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ اس پر بینک کی طرف سے جو سود ملتا ہے وہ لے کر اس کا وبال دور کرنے کی غرض سے بلانیت ثواب غرباء اور مساکین کو صدقہ کر دیا جائے، اپنے استعمال میں لانا ناجائز اور حرام ہے۔

سود حاصل کرنے کی غرض سے رقم کو بینک میں جمع کرانا نہایت خطرناک اور سخت ترین گناہ ہے، فکس ڈپازٹ کے طور پر بینک میں جو رقم رکھی جاتی ہے، اس کا مقصد بھی سود کا حاصل کرنا ہی ہوتا ہے جس کی حرمت منصوص اور قطعی ہے۔

(۲) مسلمان بچوں کو قرآن پاک اور دیگر اسلامی احکام کی تعلیم کے لیے جو عمارت بنائی جاتی ہے جس کو مکتب کے نام سے پہچانا جاتا ہے، یہ عمارت بھی خالص دینی مقصد کے لیے بنائی جانے کی وجہ سے قابل احترام اور دینی شعائر کا ایک حصہ ہے، نماز کی ادائیگی کے لیے جو عمارت تعمیر کی جائے، اس میں اگر مسجد کی نیت کی گئی ہے تب تو اس کا شعائر میں سے ہونا ظاہر و باہر ہے، اور اگر مسجد کی نیت نہیں بھی کی گئی صرف جماعت خانہ کے طور پر استعمال کی جارہی ہے، تب بھی چونکہ نماز کے لیے مختص کی گئی ہے؛ اس لیے یہ بھی شعائر دین کا ایک حصہ ہے، ایسی عمارتیں سود کی رقم سے تعمیر کرنا کسی حال میں جائز اور درست نہیں، اور ایسی عمارت میں دینی تعلیم کے سلسلہ کو جاری کرنا یا نمازیں ادا کرنا جائز نہیں۔

(۳) ایسی رقم سے جو عمارت تعمیر کی گئی ہے، اس کو غرباء اور مساکین کے استعمال کے لیے مختص کر دیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۱۸/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

کیا ہاؤس ٹیکس میں سود کی رقم دے سکتے ہیں

سوال: ہاؤس ٹیکس جو میونسپلٹی کی طرف سے لیا جاتا ہے کیا اس میں سود کی رقم دینا جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے جو رقم حکومت کے بینک میں جمع رکھی گئی اور اس پر جو زائد رقم بینک نے بطور سودی دی ہے اس رقم سے ہاؤس ٹیکس (جو حکومت کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے) ادا کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

رشوت اور این۔اے کی کاروائی میں سود کی رقم دینا

سوال: جن زمینوں میں کھیتی کی جاتی ہے، ان میں مکانات بنانے کے لیے حکومت کی طرف سے N-A کی کاروائی کرنی پڑتی ہے، جس میں حکومت اور آفیسر حضرات خوب پریشان کرتے ہیں، حکومت این۔اے کی کاروائی کے لیے رقم لیتی ہے اور آفیسر حضرات بھی رشوت مانگتے ہیں تو کیا ان دونوں جگہوں میں سود کی رقم دے سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

این۔اے کی کاروائی میں جتنی رقم قانونی طور پر حکومت وصول کرتی ہے اس میں حکومتی بینک سے ملی ہوئی سود کی رقم ادا کر سکتے ہیں؛ لیکن افسران کو دی جانے والی رشوت میں نہیں دی جاسکتی؛ اس لیے کہ اس صورت میں وہ رقم حکومت کے پاس نہیں جاتی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

كتاب الهبة

زندگی میں جائیداد اپنی اولاد میں کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کرنا

سوال: ایک ساٹھ سالہ بیوہ ہے جو صحت مند اور تندرست ہے، وہ اپنی تمام جائداد اپنی حیاتی میں اپنے پانچ لڑکے اور دو لڑکیوں میں قبضہ کے ساتھ تقسیم کرنا چاہتی ہے؛ البتہ کسی کو اس کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے زیادہ دینا چاہتی ہے اور کسی کو کم تو کیا وہ اس طرح کرسکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تفریق اور ترجیح بلا وجہ شرعی گناہ ہے، یعنی ایک کو نقصان پہنچانا مقصود ہو اور دوسرے کو نفع پہنچانا مقصود ہو، اور کوئی وجہ شرعی اس نفع اور نقصان کی نہ ہو تو ایسا کرنا گناہ ہے، تاہم ایسا کرنے سے ہبہ صحیح ہوجائے گا، یعنی جس کو کم ملا ہے اس کو شرعاً حق نہیں ہے کہ زیادہ والے سے نزاع کرے، اور اگر کوئی وجہ شرعی ہے۔ مثلاً یہ کہ جس کو زیادہ دیتی ہے وہ صالح اور دیندار ہے اور اسی وجہ سے اس کو زیادہ دیتی ہے، اور جس کو کم دیتی ہے وہ بدچلن اور غیر متدین ہے اور اسی وجہ سے اس کو کم دیتی ہے تو ایسا کرنا گناہ نہیں بلکہ جائز ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۵/ ۶۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اگر زندگی میں ہی مال تقسیم کرنا ہو تو تمام کو یکساں دے

سوال: باپ اپنی حیاتی میں ہی سب تقسیم کرنا چاہتا ہے اور اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا تو پھر وراثت کا سوال رہتا ہے یا نہیں؟ ترکہ تو ورثہ ہی میں تقسیم ہوتا ہے، اگر کسی باپ کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی ہو اور ماں بھی حیات ہو اور اپنی زندگی میں ہی تقسیم کرنا چاہتا ہو تو اس صورت میں تقسیم کیسے کرے؟ اور اس کا کیا نام رہے گا پھر میراث رہے گی یا نہیں؟ اور باپ نے اب تک بیٹی کو جو دیا ہے وہ شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آدمی اپنی وفات کے بعد جو مال اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے جس کو اصطلاح شرع میں ترکہ کہتے ہیں، وہ اگر حقوق العباد سے فارغ ہو تو اس میں وراثت جاری ہوگی، اب اگر کسی آدمی نے اپنی زندگی ہی میں اپنا مال تقسیم کر دیا اور بوقتِ وفات اس کی ملک میں کچھ بھی نہیں تو پھر وراثت جاری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، زندگی میں اگر تقسیم کرنا چاہتا ہے تو بیٹا، بیٹی میں تفریق نہ کرے بلکہ ہر ایک کو یکساں دے۔اس صورت میں باپ بیٹی کو اب تک جو کچھ دے چکا ہے اس کو بھی شمار میں لے۔شامی.(فتاویٰ رحیمیہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مشترک چیز کا ہبہ کیا یا قانونی مجبوری سے بخشش پتر لکھا یا رقم کو سونے میں تبدیل کر دیا تو کیا حکم ہے؟

سوال: (۱) کیا فرماتے ہیں علماءِ دین کہ کیا کوئی شے جب کہ دو لوگوں میں مشترک ہو، تو کیا اسے کوئی ایک اکیلا فریق بغیر دوسرے فریق کی اجازت کے وہ کسی کو ہبہ کر سکتا ہے؟ زید کا کہنا ہے کہ میرے والد نے ۲۲/ سال قبل مجھے فلاں فلاں شے ہبہ کر دی تھی، جب کہ وہ خود اس بات کا اقراری ہے کہ وہ تمام اموال اس کے چچا اور اس کے والد کا مشترکہ مال ہے، صورت مسئلہ میں قابلِ توضیح تین امور ہیں:

اول: ہبہ واقع ہوا یا نہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

دوم: اگر ہبہ نہیں ہوا تو اس مال کو اس کے اصل حق دار کی جانب لوٹایا جائے گا یا نہیں؟

سوم: وہ رقم جو اس جائیداد کے ذریعہ ۲۲/ سال کے عرصے میں کمائی گئی ہے اس کا کیا کیا جائے گا؟

(۲) مزید یہ کہ کیا کسی قانونی مجبوری کے تحت بخشش پتر لکھنے سے وہ شرعی طور پر

ہبہ مانا جائے گا، دراں حالیکہ لکھنے والا حیات ہو اور اس کا کہنا ہو کہ میری ایسی کوئی نیت نہیں تھی صرف قانونی مجبوری کے تحت ایسا کیا گیا، مزید براں یہ کہ وہ اکیلا اس کا حق دار نہ ہو بلکہ وہ شے اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان مشترک ہو؟

(۳) اگر قانونی کاروائی کے ڈر سے کوئی شخص سونا بنا کر اپنی املاک اپنی بیوی کے پاس رکھے، اور بعد میں تقسیم کرنا چاہے تو کیا وہ اس تقسیم کا حق دار نہیں؟

نیز میرے دونوں بیٹے گمراہ کن احوال بیان کر کے؛ نیز حقائق کی پردہ پوشی کر کے فتویٰ طلب کرتے ہیں، کیا انہیں اس طرح فتوے طلب کرنے چاہیے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) مشترکہ چیز میں اپنے دوسرے شریک کے حصہ کو اس کی اجازت کے بغیر ہبہ نہیں کیا جا سکتا، خود اپنا حصہ بھی اگر وہ چیز قابل تقسیم ہے تو تقسیم سے پہلے ہبہ کرنا درست نہیں، اور اگر کیا تو وہ معتبر نہیں، اگر دوسرے کی چیز کسی کو ہبہ کر دی گئی تو ہبہ درست نہ ہونے کی وجہ سے شے موہوب پر موہوب لہ کی ملکیت ثابت نہیں ہوئی، وہ چیز اصل مالک کو حوالہ کرنا ضروری ہے، اس جائیداد کے ذریعہ سے جو رقم کمائی گئی ہے اس کی تفصیل جب تک معلوم نہ ہو وہاں تک اس کا حکم بتلایا نہیں جا سکتا۔

(۲) اگر کسی قانونی مجبوری کی وجہ سے کسی آدمی نے اپنی جائیداد کا بخشش پتر کسی کے نام کا لکھ دیا؛ لیکن با قاعدہ ہبہ کر کے وہ چیز اس کی ملک اور قبضہ میں نہیں دی گئی تو محض بخشش پتر لکھنے کی وجہ سے وہ دوسرا آدمی جس کے نام کا بخشش پتر لکھا گیا ہے اس کا مالک نہیں بن جاتا، خصوصاً جب کہ وہ چیز مشترکہ ہو۔

(۳) اگر کسی آدمی نے قانونی مجبوری یا اور کسی مصلحت کے پیش نظر اپنے پاس

جمع رقم کا سونا خرید کر یا اپنی جائیداد فروخت کر کے اس سے حاصل شدہ قیمت سے سونا خرید کر اپنی بیوی کے پاس امانت کے طور پر رکھا، تو ایسا کرنے سے وہ بیوی اس کی مالک نہیں بن جاتی بلکہ وہ شخص ہی اس کا مالک ہے بعد میں وہ اپنے اس مملوکہ سونے میں جس قسم کا تصرف کرنا چاہے کر سکتا ہے، چاہے تقسیم کرے، چاہے فروخت کرے، چاہے صدقہ کرے اس کو اختیار ہے۔

آپ کے بیٹوں کا گمراہ کن احوال بیان کر کے اور حقائق کی پردہ پوشی کر کے فتویٰ طلب کرنا جائز نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۱۸/ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

كتاب الإجارة

دلالی کے دو مسئلے

سوال: (۱) ہمارا بھینسوں کا اصطبل ہے، جانوروں کے لیے گھاس، دانہ دلالوں کے واسطہ سے کمپنی سے خریدا جاتا ہے، دلال دونوں طرف سے دلالی وصول کرتے ہیں، کمپنی سے جو بھی مال خریدا جاتا ہے ثمن کی ادائیگی میں چالیس دن کی مہلت ہوتی ہے، یہ کمپنی کا عام دستور ہے کمپنی مہلت ہی کے حساب سے بھاؤ طے کرتی ہے کمپنی یا دلال کے پوچھنے پر وہی بھاؤ بتایا جاتا ہے، اور اکثر خریدار چالیس دن پر ہی ثمن ادا کرتے ہیں؛ لیکن اگر کوئی خریدار نقد ثمن ادا کردے تو کمپنی کی طرف سے دلال کو اجازت ہوتی ہے کہ دو فیصد ثمن کم لے یہ بھی کمپنی کا عام دستور ہے جو معروف ہے، چنانچہ نقد ثمن ادا کرنے پر دلال اگر پورا ثمن وصول کرے تو خریدار کو اعتراض بھی ہوتا ہے، تو کیا مذکورہ صورت میں خریدار کے لیے دو فیصد ثمن کم کردینا جائز ہوگا یا نہیں؟ اور یہ رقم خریدار کے لیے حلال ہوگی یا نہیں؟

(۲) نوٹ: بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دلال کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ فلاں مال کی قیمت بڑھنے والی ہے تو وہ اپنے لیے کافی مقدار میں کمپنی سے مال خرید لیتا ہے، پھر جب اصطبل والے دلال کے پاس مال کا آرڈر لکھواتے ہیں تو دلال اپنا مال موجودہ بھاؤ سے خریدار کے پاس بھیج دیتا ہے؛ جبکہ دلال نے کم قیمت میں خریدا ہوتا ہے اور اس صورت میں نقد ثمن ادا کرنے پر دو فیصد کم لیتا ہے تو کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) صورت مسئولہ میں دلال کمپنی کی طرف سے وکیل بالبیع ہے، اور نقد ثمن ادا کرنے کی صورت میں کمپنی کی ہدایت کے بموجب دو فیصد ثمن کم لینا چاہیے؛ اس لیے اگر خریدار نقد قیمت ادا کرنے کی صورت میں دو فیصد ثمن کم دیں گے تو ان کو ایسا کرنے کا حق ہے۔

(۲) دلال کی حیثیت جب وکیل بالبیع کی ہے تو اس کے لیے کمپنی سے جس قیمت سے مال لیا ہے اس سے زیادہ قیمت وصول کرنا درست نہیں۔ ہاں اگر خریدار کو وہ یہ بتلادے کہ یہ مال میں خرید چکا ہوں، کمپنی کا وکیل ہونے کی حیثیت سے نہیں تب ایسا کرنے کی گنجائش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

گیسٹ ہاؤس میں آنے والے جوڑے کا تعارف نہیں کہ میاں بیوی ہیں یا اجنبی اس کا کرایہ وصول کرنا

سوال: زید ایک گیسٹ ہاؤس کا مالک ہے، اس گیسٹ ہاؤس میں قیام کے لیے مختلف لوگ عورتوں کے ساتھ آتے ہیں، صاحب گیسٹ ہاؤس کو یہ معلوم نہیں کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں یا نہیں، تو مالک کے لیے اس کا کرایہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورت مسئولہ میں اگر وقتِ قیام اجرت کی تعیین کے ساتھ عقد اجارہ کیا ہے تو گیسٹ ہاؤس کے مالک کے لیے کرایہ وصول کرنا جائز ہے۔ تصح اجارة حانوت ای دکان و دار بلابیان مایعمل فیھا لصرفھا للمتعارف. (درمختار) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کرایہ دار کا سرکاری قانون کا سہارا لے کر مسجد کی دکان خالی نہ کرنا حرام ہے۔

سوال: ہم ہمارے شہر کی مسجد کے پیچھے کے حصہ پر واقع دو پلاٹ (۱x۵) پر تقریباً تین ساڑھے تین سال سے بحیثیت کرایہ داری کے قابض تھے۔ حال ہی میں متولی مسجد نے کہا کہ مسجد کا B.U.C. (بلڈنگ یوزرس سورٹ) پاس نہیں ہورہا ہے۔ تو آپ مسجد کا B.U.C. پاس ہوجانے دو۔ پھر بعد میں یعنی بی یوسی پاس ہوجائیگا پھر ہم آپ کو دو پلاٹ میں سے ایک پلاٹ واپس دے دیں گے، اسی لیے ہم نے کوئی قانونی کارروائی

نہیں کی، ان کے مشورہ میں دو گواہوں کے سامنے یہ بات طے ہوئی تھی کہ دو پانچ ماہ بعد جب بھی اس جگہ دکان بنے گی تو ہم دو میں سے ایک دکان ضرور آپ کو دینگے۔

ہم نے متولی مسجد کے زبانی وعدہ پر بھروسہ کیا، اور کسی طرح کا قانونی سہارا (کارروائی) نہیں لیا؛ لیکن دو ماہ کے بعد مسجد کے جو دو پلاٹ چار سال سے ہمارے قبضہ میں تھے، اور ہم مسجد کے کرایہ دار تھے، اور ہم سے جو وعدہ کیا تھا اسکے مطابق ہم ایک دکان کے مستحق ہوتے ہیں یا نہیں؟ حالانکہ ہم نے متولی مسجد کو دو پلاٹوں کا قبضہ دیا ہے اور متولی مسجد کے وعدہ کے مطابق ہی ہم نے قبضہ دیا تھا، اور کوئی قانونی کارروائی اختیار نہیں کی تھی۔ کیا وہ وعدہ کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب عنایت فرما کر رہنمائی فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شریعت میں کرایہ داری کے معاملہ کو عقد اجارہ کہتے ہیں۔ اسکی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ عقد اجارہ کے وقت کرایہ داری کی مدت متعین کر دی جائے۔ مثال کے طور پر کسی آدمی نے دکان یا مکان کرایہ پر لیا، اور عقد اجارہ کے وقت مالک کے ساتھ یہ طے ہوا کہ یہ دکان یا مکان دس سال کے لیے کرایہ پر لے رہا ہوں، اس صورت میں دکان یا مکان کے مالک کے لیے اسکو دس سال سے پہلے خالی کروانا جائز نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عقد اجارہ کے وقت کرایہ داری کی مدت متعین نہیں کی گئی، بس صرف اتنا طے ہوا کہ ماہانہ اتنے کرایہ پر یہ دکان آپکو کرایہ سے دی جارہی ہے، اس صورت میں نیا مہینہ شروع ہونے پر وہ معاملہ آگے بڑھتا رہیگا؛ لیکن دکان یا مکان کا مالک اگر نیا مہینہ شروع ہونے سے پہلے کرایہ دار کو بتلا دے کہ آئندہ مہینہ سے کرایہ داری کا معاملہ ختم کر رہا ہوں، آپ دکان یا مکان خالی کر دیں، اس صورت میں کرایہ دار کے لیے ضروری ہے کہ وہ نیا مہینہ شروع

ہونے پر دکان یا مکان خالی کر کے مالک کے حوالہ کر دے۔

ہمارے یہاں سرکاری قانون کی وجہ سے قبضہ کی بنیاد پر کرایہ دار دکان یا مکان خالی کرنے سے انکار کرتا ہے، یہ صورت شرعی اعتبار سے ناجائز اور حرام ہے، آپ کے پاس مسجد کے دو پلاٹ کرایہ کے طور پر تھے اس کی کرایہ داری کا معاملہ بھی اوپر بتائی ہوئی دوسری صورت کے مطابق ہونے کی وجہ سے مسجد کے متولی کو حق پہنچتا ہے کہ نیا مہینہ شروع ہونے سے پہلے آپ کو آگاہ کر کے وہ پلاٹ آپ سے خالی کروالیں، آپ جو لکھتے ہیں ''ہم نے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی'' یہ کوئی آپ نے احسان نہیں کیا، بلکہ شرعی اعتبار سے آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اگر آپ قانونی کارروائی کر کے اس کا قبضہ اپنے پاس روک لیتے، جیسا کہ آج کل عام طور پر لوگ کرتے ہیں، تو آپ شرعی اعتبار سے مسجد کی جگہ کے غصب کرنے والے ہو کر حرام کے مرتکب ہوتے اور آپ کا یہ اقدام آپ کی عاقبت کے لیے مہلک ثابت ہوتا۔

پلاٹ خالی کروانے کے لیے مجبوری کی وجہ سے مسجد کے متولی نے آپ کے ساتھ جو صلح کی، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ صلح شرعی اصول کے خلاف ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں، اور اس کی بنیاد پر ایک دکان کے آپ مستحق نہیں ہوتے۔ اگر آئندہ بھی آپ کوئی قانونی کارروائی کریں گے تو اپنی عاقبت برباد کرنے والے ٹھہریں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۱۵/ جمادی الاولی ۱۴۲۶ھ

غیر مسلموں کے غیر شرعی لباس سینے کی اجرت کا کیا حکم ہے؟

سوال: اگر کوئی مسلمان درزی، ہندوؤں کے غیر شرعی کپڑے بناتا ہے تو ایسے

کپڑے سینے کی اجرت لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے؛ البتہ احتیاط اولیٰ ہے۔ وفی المحیط لا یکرہ بیع الزنانیر من النصرانی والقلنسوۃ من المجوسی ...... الخ. (شامی ۵/ ۲۷۷)

کرایہ دار دکان میں شراب کا گڑ بیچتا ہو تو بھی کرایہ لینا درست ہے

سوال: اگر کوئی آدمی اپنی دکان کسی کو کرایہ پر دے، اور کرائے دار اس دکان میں شراب کا گڑ بھی بیچے تو کیا مالک مکان کے لیے کرایہ لینا درست ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درست ہے؛ اس لیے کہ دینے والے نے اس نیت سے نہیں دیا۔

لان الاجارۃ علی منفعۃ البیت ولھذا یجب الاجر بمجرد التسلیم ولا معصیۃ فیہ ...... الخ. (شامی ۵/ ۲۷۷)

مزدور کے لیے کھیتی کی پیداوار میں سے اجرت (مزدوری) طے کرنا

سوال: کھیتی کی پرندوں وغیرہ سے حفاظت کے لیے ایک شخص اجرت پر رکھا جاتا ہے، اور اس کی اجرت اسی فصل کا ایک حصہ مثلاً دسواں یا پانچواں حصہ طے کیا جاتا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ اجارہ فاسد ہے، اگر محافظ نے اپنا کام انجام دے دیا ہے تو وہ اجرت مثلی کا حق دار ہوگا جو مقررہ حصۂ فصل سے زیادہ نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

باپ اپنے بیٹے کو کاروبار میں اجرت پر رکھے تو جائز ہے

سوال: زید اور بکر دونوں نے بھیسوں کا اصطبل خریدا، زید کا لڑکا بمبئی میں

اصطبل کا کاروبار سنبھالتا ہے، اور زید کا لڑکا زید کے ساتھ ہی رہتا ہے کھانا، پینا سب کچھ ساتھ میں ہے، زید کے لڑکے کو کاروبار سنبھالنے کی وجہ سے ماہانہ پندرہ سو روپیہ تنخواہ دی جاتی ہے، جو زید کا لڑکا اپنے باپ یعنی زید کو لوٹا دیتا ہے تو کیا یہ ماہانہ تنخواہ دینا درست ہے؟

سوال: دوسرا سوال یہ ہے کہ زید کا لڑکا زید سے الگ ہے اس کا کھانا، پینا سب کچھ الگ ہے، اور زید کا لڑکا اپنی تنخواہ اپنے ہی پاس رکھتا ہے، زید باپ کو نہیں دیتا تو کیا یہ تنخواہ دینا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ اجارہ درست اور جائز ہے۔

وان استاجر الرجل ابنه ليخدمه فى بيته لم يجز ولا اجر عليه لان خدمة الاب مستحق على الابن دينا الخ. (مبسوط ٥٦/١٦) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قرض کی بنیاد پر اجرت کم مقرر کرنا درست نہیں

سوال: کھیتی کے کاموں کے لیے ایک شخص کو سال بھر کے لیے اجرت کو رکھا اور اس پر کچھ رقم بطور قرض دی گئی، اب مالک نے اس کو قرض دینے کی وجہ سے اس کی اجرت کم مقرر کی، تو اس طرح قرض دینے کی وجہ سے اجرت میں کمی کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قرض کی بنیاد پر اجرت میں کمی رکھنا درست نہیں ہے۔ ”كل قرض جر نفعا فهو حرام“ کا مصداق ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

تعلیم قرآن پر اجرت

سوال: (الف) گھر گھر جا کر قرآن کی تعلیم دینا اور اس پر اجرت مقرر کرنا کیسا ہے؟

(ب)قرآن خوانی کی اجرت لینا کیسا ہے،اوراجرت طے کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف)تعلیم قرآن پراجرت لینادرست ہے،چاہےاپنے گھر بیٹھ کرتعلیم دے، چاہے پڑھنے والے کے گھر جا کرتعلیم دے۔

(ب)قرآن خوانی کی اجرت جائزنہیں۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ:العبداحمدخانپوری

الجواب صحیح:عباس داؤدبسم اللہ　　یکم صفرالمظفر ۱۴۲۵ھ

دلال کی اجرت

سوال: بمبئی شہرمیں گھروں کی دلالی ہوتی ہے،اگرکسی مکان کوفروخت کرنا ہوتو دلال کو بتاناپڑتاہے،اوردلال کاریٹ ہے کہ ایک لاکھ میں ایک ہزار،اگرمکان دس لاکھ کا ہوتودس ہزاردلالی لیتاہے۔اوراسی طرح جوخریدارہےاس سےبھی اتنی ہی رقم لیتاہے۔کیا دوطرفہ دلالی لیناجائزہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگردونوں طرف سےدلالی لینےکاعرف ورواج ہوتودرست ہےورنہ نہیں۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ:العبداحمدخانپوری

الجواب صحیح:عباس داؤدبسم اللہ　　یکم صفرالمظفر ۱۴۲۵ھ

مضاربت اوراجارہ کوخلط کرنادرست نہیں ہے

سوال:ایک صاحب کی ایک دکان ہے،اس نےایک آدمی سےکہاکہ پوری رقم اورخرچ میرااورتم صرف محنت کرواورتجارت کرو،منافع میں پچاس فیصدنفع تمھاراہوگا،اور

ماہانہ اتنی تنخواہ بھی ہوگی تو کیا یہ معاملہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب اس کو منافع میں حصہ دیا تو اب تنخواہ مقرر کرنا درست نہیں ہے، اور اگر تنخواہ مقرر کرنا ہے تو صرف تنخواہ ہی رکھے؛ اس لیے کہ منافع میں حصہ مقرر کرنے کی صورت میں معاملہ مضاربت کا ہے اور تنخواہ مقرر کرنے کی صورت میں معاملہ اجارہ کا ہے، دونوں کو خلط کرنا درست نہیں، کوئی ایک صورت تجویز ہونی چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

شراب پینے والے غیر مسلم کو ہوٹل میں ملازم رکھنا

سوال: زید کی ہوٹل میں ایک ہندو کاریگر کام کرتا ہے، زید اس کو ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد روزانہ روکڑا روپیہ دے دیتا ہے، اور زید کا وہ ہندو نوکر اسی روپیہ سے شراب پی کر ہوٹل میں سوتا ہے اور صبح اپنی نوکری شروع کر دیتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زید کو دوسرا کاریگر بھی ہوٹل کے لیے نہیں ملتا ہے تو زید کیا کرے؟ اور زید اپنی ہوٹل میں خلافِ سنت کھانا کھلاتا ہے تو اس صورت میں زید کی آمدنی کا کیا حکم ہے؟ ہوٹل میں کھانے والا ہندو آتا ہے جو شریعت کا مکلّف نہیں ہے، اور اگر مسلمان کھانے والا ہو تو کیا حکم ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب وہ ملازم غیر مسلم ہے تو چاہے وہ اپنی اس تنخواہ سے شراب نوشی کرتا ہو، زید پر کوئی گناہ نہیں ہے، چارپائی پر کھانا جائز ہے، زید کی آمدنی پر اس کی وجہ سے کوئی حرمت نہیں آتی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

دلال کا باہم معاملہ کرا دینا اور بغیر دیکھے مال روانہ کرنا کیا درست ہے؟

سوال: آج کل عام طور پر منڈیوں پر غیروں کے قبضہ وتسلط کی وجہ سے کاروبار

میں شرعی اصول کی رعایت نہیں رکھی جاتی، اور کوئی ان اصول کی رعایت کرنا چاہے تو بھی بہت مشکل ہوتا ہے اور تمام تجار کے عادی ہو جانے کی وجہ سے تنازع بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم چھوٹے تجار کو جب بھی کوئی مال، اناج، کپڑا وغیرہ خریدنا ہو تو دلال کو آرڈر دینا ہوتا ہے، پھر یہ دلال بڑے تاجر کو آرڈر دیتا ہے، وہ بڑا تاجر جو دلال کے آرڈر کے مطابق ہم کو مال روانہ کر دیتا ہے، اور دلال کا کمیشن اس پر لگ جاتا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ دلال کا اس طرح بغیر دیکھے، بغیر تولے اور بغیر قبضہ کیے ہوئے مال روانہ کر دینا اور ہمارا اس طرح خریدنا درست ہے؟ واضح رہے کہ بڑے تجار براہِ راست ہمیں مال نہیں دیتے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دلال بائع (بیچنے والے) ومشتری (خریدنے والے) کے درمیان معاملہ کرا دیتا ہے، اور اپنے کام کی اجرت بصورت کمیشن وصول کرتا ہے یہ درست ہے۔ (ماخوذ از فتاوی محمودیہ ۱۷۰/۴، شامی ۴۴/۵) جو مال خریدا جاتا ہے اس کا نمونہ دیکھا جاتا ہے اس کی قیمت بھی متعین ہوتی ہے اور مقدار بھی، گویا معاملہ بڑے تاجر اور چھوٹے تاجر کے درمیان ہوا، دلال نے دونوں کے درمیان رابطہ کا کام دیا؛ اس لیے یہ معاملہ درست ہے؛ البتہ اگر خریدا ہوا مال نمونہ کے مطابق نہ ہو یا اس میں کوئی عیب ہو تو مشتری کو خیار رویت یا خیار عیب حاصل ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

نوٹ: خیار رویت: کسی چیز کو خریدنے کے بعد اسے دیکھنے پر پسند نہ آئے تو خریدار کے لیے وہ چیز لوٹانے کا اختیار ہونے کو کہتے ہیں۔

خیارِ عیب: کسی چیز کو خریدنے کے بعد اس چیز کے عیب دار ہونے کی اطلاع ہونے پر خریدار کے لیے وہ چیز لوٹانے کا اختیار ہونے کو کہتے ہیں۔ (اللباب فی شرح الکتاب) از: مرتب عفی عنہ

ڈپازٹ دے کر بغیر کرایہ کے گھر میں رہنا جائز نہیں

سوال: زید نے بکر کو اس شرط پر اپنا فلیٹ رہنے کے لیے دیا کہ تم مجھے دو لاکھ روپے بطور ڈپازٹ دے دو اور فلیٹ میں بغیر کرایہ کے رہو، صرف فلیٹ کا مینٹیننس آپ کے ذمہ رہے گا جس میں لائٹ کا بل، پانی کا بل اور فلیٹ کا ٹیکس وغیرہ شامل ہے جو بکر کو فلیٹ استعمال کرنے کے عوض ادا کرنا ہے، ساتھ ہی زید نے کہا کہ جب آپ کو فلیٹ خالی کرنا ہوگا میں آپ کا پورا دو لاکھ واپس کروں گا اور آپ فلیٹ خالی کر دینا، اب سوال یہ ہے کہ کیا ڈپازٹ دے کر بغیر کرایہ کے فلیٹ دینا اور لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مالک مکان کا کرایہ دار سے ڈپازٹ کے نام پر رقم لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ اس کا مدار اس رقم کی حیثیت کی تعیین پر ہے، اس کی شروعات تو ضمانت اور رہن کے نام پر ہوئی تھی، بسا اوقات کرایہ دار مکان یا دکان کا کرایہ باقی چھوڑ کر غائب ہو جاتا تھا اور مالک مکان کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا، اس مصیبت سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ عقدِ اجارہ کرتے وقت کرایہ دار سے متعینہ رقم ایڈوانس لی جانے لگی کہ خدانخواستہ آئندہ چل کر اگر کرایہ دار کرایہ کی رقم باقی چھوڑ کر غائب ہو گیا، تو اس ایڈوانس یا ڈپازٹ کے نام سے لی گئی رقم سے وہ بقایا کرایہ وصول کیا جا سکے، اس صورت میں اس رقم کی حیثیت رہن کی ہو جائے گی اور شرعاً اس طرح رہن لینا درست ہے۔ ولو استأجر داراً او شيئا و اعطى بالاجر رهنا جاز. (هنديه ٥/ ٤٣٥) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کرایہ دار مکان کو نقصان پہنچا دیتا ہے یا بجلی وغیرہ کے واجبات چھوڑ کر چلا جاتا ہے جو بعد میں مالک مکان کو ادا کرنے پڑتے ہیں، اس مقصد کے لیے بھی کرایہ دار سے ڈپازٹ کے نام پر ایک رقم ایڈوانس

وصول کی جاتی ہے، گویا یہ ایک نوع کا زرِضمانت ہے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ (دیکھئے: آپ کے مسائل اوران کا حل ۱۴۰/۶)

جہاں تک میرا اندازہ اور معلومات ہیں ڈپازٹ لینے دینے کی اصل بنیاد مندرجۂ بالا دو میں سے ایک وجہ ہے۔ بعد میں لوگوں نے جب دیکھا کہ ڈپازٹ کے نام پر وصول کی جانے والی یہ رقم مالک مکان کے پاس یوں ہی پڑی رہتی ہے کسی استعمال میں نہیں آتی، تو مالکان مکان جن کے قبضہ میں یہ رقم تھی، انھوں نے بلا اجازت اس رقم کو استعمال کرنا شروع کیا، جب اس کا رواج عام ہونے لگا تو دینی ذہن رکھنے والے مالکان مکان کو یہ بات کھٹکی کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کو کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ ایسے لوگوں نے کرایہ دار سے اجازت لینا شروع کیا اور انھوں نے بھی اجازت دینا شروع کیا، کرایہ داروں میں سے کچھ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ ہماری اس رقم سے جو بطور امانت وضمانت مالک مکان کے پاس جوں کی توں محفوظ رہنی چاہیے، مالک مکان ہماری اجازت سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو ہم کیوں نہ اس کو دی جانے والی اجازت سے فائدہ اٹھائیں؟ چنانچہ انھوں نے اس شرط پر اجازت دینا شروع کیا کہ اس اجازت کی بنیاد پر کرایہ میں کچھ کمی کردی جائے، یعنی عام طور پر اس جیسے مکان کی جو اجرت مثل ہونی چاہیے اس کے بجائے ڈپازٹ کے طور پر دی گئی رقم کو استعمال کرنے کے بدلہ میں اس اجرت مثل کی مقدار میں کمی کی شرط لگائی جائے، آج کل جو معاملات ہو رہے ہیں اس کی بنیاد یہی ذہنیت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ معاملہ درست کہلایا جاسکتا ہے؟ کچھ لوگوں نے ڈپازٹ کی رقم خوب بڑھا کر اور اس کے استعمال کی اجازت دے کر مالک مکان سے پورا کرایہ ہی ساقط کروالیا، گویا یہ صاحب اپنی رقم ایک مدت کے لیے مالک مکان کو استعمال کے لیے

دے رہے ہیں، اوراس کے بدلہ میں اسی مدت کے لیے مکان یادکان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، ظاہر ہے ان کی طرف سے جورقم دی گئی ہے وہ قرض کی حیثیت رکھتی ہے اوراس کے بدلہ میں یہ آدمی قرض لینے والے کے مکان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اورقرض پر دی گئی رقم کے بدلہ میں فائدہ اٹھانا سود وحرام ہے۔

درمختار میں علامہ حصکفیؒ نے ''الاشباہ والنظائر'' کے حوالہ سے لکھا ہے: کل قرض جرنفعا فھو حرا م، فکرہ للمرتھن سکنی المرھو نة باذن الراھن. (درمختار)

یعنی ہروہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے وہ حرام ہے، اسی لیے گروی لیے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کرنا مکان کے مالک کی اجازت سے ممنوع ہے۔ (یعنی مرتہن کے لیے راہن کی اجازت کے بغیر تو حرام ہوگا ہی، اگر وہ اجازت دے دے تب بھی اس مکان سے استفادہ کرنا مکروہ ہوگا) علامہ شامیؒ نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر نفع اس قرض کے معاملہ میں مشروط ہو تو حرام ہے، اور عبداللہ ابن محمد بن اسلم سمرقندیؒ جو کبارعلماءِ سمرقند میں سے تھے، ان کا قول نقل کیا ہے کہ مال مرہونہ سے انتفاع کسی صورت میں جائز نہیں اگر چہ راہن نے اسے اجازت دے دی ہو؛ اس لیے کہ یہ سود خوری کی اجازت ہے چونکہ وہ اپنا پورا قرض وصول کرے گا ہی، پھر یہ نفع ایک زائد شے ہے جو اس سے یہ لے رہا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ (شامی ۵/۱۶۶، طبع دارالفکر)

اس لیے صورت مسئولہ میں زید کا بکر سے دولاکھ روپے بطور ڈپازٹ (جو قرض ہی ہے) لے کر اپنا فلیٹ بلا کرایہ رہنے کے لیے دینا اور بکر کا اس میں بلا کرایہ رہنا سود کے حکم میں ہے، جو ناجائز ہے؛ نیز صورتِ مسئولہ میں بکر پر اس فلیٹ کی اجرتِ مثل (یعنی عام طور پر اس فلیٹ کا جو کرایہ ہوتا ہو) واجب ہوگی۔

عالمگیری میں ہے: لو استقرض رجل دراھم من رجل وقال اسکن حانوتی ھذا الخ. (ھندیة ٤/٥٢١) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

اجرت متعین کیے بغیر فلیٹ میں رہنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ کے بارے میں:

میں نے ایک قریبی عزیز سے اس کا فلیٹ کرایہ پر لیا، کرایہ پر لینے سے قبل کرایہ متعین نہیں کیا تھا، ہم دونوں باہم کئی مرتبہ ملتے رہے؛ لیکن کرایہ کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی، اسی طرح سولہ مہینے گذر گئے اور ہم دونوں نے بیٹھ کر حساب بے باق کر دیا ماہانہ ڈیڑھ سو کے حساب سے، اس کے بعد آگے کے کرایہ کے متعلق کوئی بات نہیں، اور میں اس مکان میں رہتا رہا یہاں تک کہ سات سال کا عرصہ گذر گیا اور پھر ہم دونوں حساب کے لیے بیٹھے، میں نے وہی پرانا کرایہ ماہانہ ڈیڑھ سو کا حساب سامنے رکھ دیا، میرے عزیز نے وہ پرانا کرایہ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ کرایہ بڑھ گیا ہے قرب وجوار کے اس جیسے فلیٹوں کا کرایہ واقعی بڑھ گیا ہے؛ لہٰذا تم بھی کرایہ بڑھا کر دو، میں نے کہا جب سولہ مہینوں کا حساب کیا اس وقت تم کو کہنا تھا کہ آئندہ کرایہ اتنا ہوگا مجھ کو منظور ہوتا تو رہتا، نہیں تو میں خالی کر دیتا یا بیچ میں جب کبھی تمھارے دل میں کرایہ بڑھانے کا خیال آیا مجھ کو اطلاع کرنا تھا، اس درمیان ہم پچاسوں بار ملتے رہے یا مجھ کو فون کر دینا تھا، ٹیلیفون تمھارے پاس بھی ہے اور میرے پاس بھی؛ لیکن تم نے مجھے کسی ذریعہ سے کرایہ بڑھانے کی اطلاع نہ دی میں وہی سابقہ کرایہ دوں گا زیادہ نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ازروئے شریعت مجھے زیادہ کرایہ دینا ضروری ہے؟ پرانا کرایہ میرا عزیز لینے پر تیار نہیں اور میں زیادہ دینے پر تیار نہیں۔ بینوا وتوجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شروع اجارہ سے ہی جب اجرت کا تعین نہیں ہوا تھا تو یہ اجارہ فاسد ہے، اور اس میں اجرت مثل واجب ہوگی۔

وتفسد بعدم التسمية اصلا او بتسمية خمر او خنزير، فان فسدت بالاخيرين بجهالة المسمى وعدم التسمية وجب اجر المثل، يعنى الوسط منه.

(در مختار مع الشامی ۵/۳۳)

سولہ مہینے گذرنے کے بعد آپس میں بیٹھ کر گذشتہ مدت کا جو حساب ڈیڑھ سو کے حساب سے بے باق کیا گیا اتنی بات آئندہ کے لیے تعیین اجرت کی دلیل نہیں بن سکتی؛ اس لیے آپ جس فلیٹ میں رہتے ہیں اس جیسے فلیٹوں کا جو کرایہ اس مدت میں رہا ہو اس کے حساب سے ادائیگی ضروری ہے۔ اور آئندہ کے لیے اجرت نیز مدت اجارہ کا تعین کر لیا جائے تا کہ دونوں گناہ سے محفوظ رہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۱۳/ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

كتاب الأضحية

قربانی کس پر واجب ہے؟

سوال: قربانی کس پر واجب ہے؟ جو عورت صاحبِ نصاب نہ ہو؛ لیکن اس کے پاس ضرورت سے زائد برتن کپڑے اور چارپائی وغیرہ ہو اور غیر مستعمل ہو تو اس کے اوپر قربانی واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وہ مسلمان مقیم جو دو سو درہم (ساڑھے باون تولہ چاندی) یا اس کے برابر قیمت کے ایسے سامان کا مالک ہو جو اس کی حاجاتِ اصلیہ (رہائش کا مکان، پہننے کے کپڑے اور ضروری سامان وغیرہ) سے زائد ہو وہ اس حالت میں ایام قربانی کو پالے تو اس پر قربانی واجب ہوگی۔ (درمختار شامی ۵/ ۲۱۹)

اس عورت کے پاس ضرورت سے زائد جو اشیاء موجود ہے ان کی قیمت اگر بقدرِ نصاب ہو تو اس پر قربانی واجب ہے۔

قربانی کس پر واجب ہے

سوال: پارسال زید نے قرض لے کر کاروبار شروع کیا اسی وقت یہ نیت بھی کر لی تھی کہ میں آئندہ سال بقرعید کو قربانی کروں گا اس نیت کے مطابق وہ امسال قربانی کرنا چاہتا ہے تھوڑا سا قرض باقی ہے، اب تک اس نے جانور خریدا نہیں ہے اس صورت میں شریعت مطہرہ کا حکم کیا ہے؟ اگر وہ کرے تو نفل ہوگی یا واجب ادا ہوگا۔ بلا تاخیر جلد از جلد جواب سے مطلع فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر زید کے پاس اس کی ضروریات زندگی اور قرض کی ادائیگی کے علاوہ اتنا

سامان موجود ہے جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہوتی ہے، یا اتنی رقم نقد موجود ہے، یا اتنی چاندی موجود ہے یا ساڑھے سات تولہ سونا موجود ہے تو اس پر قربانی واجب ہے ورنہ قربانی تو پھر بھی کرسکتا ہے؛ البتہ نفل ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ذوالقعدہ ۱۴۰۷ھ

مرحوم کی طرف سے قربانی انفراداً

سوال: زید نام کا ایک شخص انتقال کرگیا اور اس کے پیچھے بیٹے اپنے مرحوم باپ کی طرف سے بغیر وصیت کے قربانی کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ مرتے وقت زید نے قربانی کی وصیت نہیں کی تھی تو ان کا قربانی کرنا اپنے مرحوم باپ کی طرف سے صحیح ہے یا نہیں؟

اگر جواب اثبات میں ہو تو مرحوم کے ورثاء اس قربانی سے گوشت کھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر میت نے وصیت نہیں کی ہے تو ورثہ پر میت کی طرف سے قربانی کرنا واجب نہیں ہے، پھر بھی اگر کوئی وارث بالغ ہو اور اپنے روپئے سے حصہ لے کر یا پورا جانور خرید کر میت کو ثواب پہنچائے تو شرعاً درست ہے، اور اس کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی دے سکتا ہے۔ (شامی ۵/ ۲۲۹)

یہ یاد رہے کہ تمام بیٹے مجموعی طور پر ایک حصہ یا جانور خرید کر باپ کی طرف سے نہیں کرسکتے، ہر ایک یا کوئی ایک انفرادی طور پر کرسکتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/ ذوالقعدہ ۱۴۰۷ھ

خنثیٰ جانور کی قربانی اور اس کا کھانا

سوال: ماکول اللحم جانوروں میں جو جانور خنثی ہوتا ہے اس کی قربانی اور اسی

طرح عام حالت میں ذبح کرکے کھانا صحیح ہے یانہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ماکول اللحم جانور اگر خنثیٰ ہوتو اس کو ذبح کرکے کھانا جائز ہے، اس کی قربانی جائز نہیں بشرطیکہ وہ خنثیٰ مشکل ہو۔

و لا بالخنثى لان لحمها لا ينضج. شرح وهبانية. (درمختار) قوله (لان لحمها لا ينضج) من باب سمع، و بهذا التعليل اندفع ما اورده ابن وهبان من انها لا تخلو اما ان تكون ذكرا او انثى وعلى كل تجوز. (شامی ۵/۲۰۴)

اگر کسی نے اتفاقاً خنثیٰ جانور کی قربانی کرلی اور اس کا گوشت اچھی طرح پک گیا تو وہ قربانی صحیح ہوجائے گی۔ (امدادالفتاویٰ ۳/۵۷۱)

خنزیر کے دودھ سے پلے ہوئے جانور کی قربانی

سوال: اگر بکری کا بچہ کسی خنزیر کا دودھ پی لے اور اس کے دودھ سے اس بچے کی پرورش ہوئی ہے تو کیا ایسے بچوں کی قربانی کرنا جائز ہے یانہیں؟ یعنی جبکہ وہ بچہ ایک سال کا ہوجائے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایسے بچے کو چندروز باندھ دیا جائے اور چارہ کھلا دیا جائے اس کے بعد اس کی قربانی کی جاسکتی ہے۔ الجدى اذا كان يربى بلبن الاتان و الخنزير ان اعتلف اياما فلا باس لانه بمنزلة الجلالة، و الجلالة اذا حبست اياما فعلفت لاباس بها فكذا هذا، كذا فى الفتاوى الكبرىٰ. (عالمگیری ۵/۲۹۰)

كتاب الحظر والإباحة

معاشرت کے متعلق دین کی اصولی تعلیم، ماں باپ پر اولاد کے حقوق، بہو سے خدمت لینے کا حق، لڑکے کا اپنی بیوی کے ساتھ والدین سے علیحدہ رہنا ہزاروں مفاسد کے انسداد کا ذریعہ ہے، والدین سے علیحدہ رہنے میں عزت بڑھتی ہے، والدہ کے کہنے سے بیوی کو طلاق دینا وغیرہ وغیرہ۔

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسائل ذیل کے بارے میں:

بندہ کافی الجھنوں اور اختلافات کا شکار ہے، جس کی کچھ حقیقت آپ کے سامنے پیش کر کے کچھ سوالات عرض کر رہا ہے آپ تسلی بخش جوابات سے نوازیں۔ میری شادی ہونے کو کچھ مہینہ ہی گزرے ہیں؛ لیکن شادی کے کچھ ایام کے بعد میری والدہ اور میری بیوی کا آپس میں کچھ باتوں کی بناء پر ٹکراؤ شروع ہو گیا ہے (گھریلو مسائل مثلاً کھانا، کپڑے وغیرہ) میری والدہ ہر بات پر میری بیوی کو ٹوکتی رہتی ہیں، جس کی بناء پر ہم دونوں تنگ آ گئے ہیں، میرے والد صاحب نے میری والدہ کو بارہا سمجھایا؛ لیکن والدہ ماننے کو تیار نہیں ہیں، اور میری بیوی نے ایک مرتبہ میری عدم موجودگی میں غلط قدم اٹھانے کا ارادہ بھی کیا تھا اور کچھ حرکت کر بھی چکی تھی (گولیاں کھا کر خودکشی کرنے کی)؛ لیکن میرے سمجھانے کی بنا پر وہ اس حرکت سے باز آ گئی، اور آپس کا یہ ٹکراؤ میں اپنے والد صاحب کے سامنے چار مہینہ تک پیش کرتا رہا، پھر جب رمضان کا مہینہ آیا تو میرے والد صاحب کے کہنے کی بناء پر میں نے اپنی بیوی کو کچھ ایام کے لیے میرے سسرال/ یا میکے بھیج دیا، جب گھر پر پہنچی تو ان کے والدین نے ان کی نازک حالت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اپنی لڑکی کو آپ کے گھر نہیں بھیجیں گے، جب تک آپ اور آپ کی بیوی دونوں آپ کے والدین سے جدا نہ رہیں، اور ابھی تک میری بیوی اورنگ آباد میں ہے، پھر والد صاحب

نے رمضان کے بعد ایک مہینہ کے لیے مجھے اپنی رفیقۂ حیات کے پاس بھیجا، ابھی تک میں اورنگ آباد ہی میں ہوں، میرے والدین مجھ پر اصرار کرر ہے ہیں کہ آپ اپنی بیوی کو لیکر گھر آجائیں؛ لیکن والدہ کی کچھ شدید غلطیوں کی بناء پر میں گھر آنے کو منع کرر ہا ہوں اور ابھی فی الحال میں اورنگ آباد میں اپنے ایک بھائی کے یہاں مقیم ہوں، اور سسرال والے بھی اپنی لڑکی بھیجنے کو اس وقت تک تیار نہیں ہیں جب تک میرے والدین مجھے الگ نہ رہنے دیویں، تو اب اس سلسلہ میں کچھ امور دریافت کرر ہا ہوں۔

(۱) لڑکے کا حق والدین پر کیا ہے؟ اور بہو کا حق ساس اور خسر پر کیا ہے؟

(۲) میری والدہ اور میری بیوی کے آپس میں نہ بننے کی وجہ سے میں اپنے والدین سے الگ رہنا چاہتا ہوں تو میں رہ سکتا ہوں یا نہیں؟ اور مجھے امید ہے کہ الگ رہنے کی صورت میں آپس کی محبت بڑھے گی۔

(۳) میرے والد صاحب کا یہ کہنا کہ الگ رہنے کی صورت میں ہماری عزت پر دھبہ پڑتا ہے، تو کیا کرنا چاہیے؟

(۴) میرے والد صاحب کا یہ جملہ استعمال کرنا کہ لڑکی والوں کو دب کر رہنا پڑتا ہے، کچھ نہیں کہہ سکتے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

(۵) میری والدہ میری بیوی پر جھوٹی جھوٹی تہمتیں لگا کر پریشان کرتی ہیں، ان کا یہ رویہ کہاں تک صحیح ہے؟

(۶) آپسی ٹکراؤ کی بناء پر میری والدہ نے مجھ سے بارہا کہا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو، تو والدہ کے کہنے پر اپنی بیوی کو طلاق دینا کیسا ہے؟ اور بیوی کو طلاق کن کن امور کی بناء پر دینا جائز ہے اور کن کن امور کی بناء پر نا جائز ہے؟

(۷) میری والدہ اس موقع پر میرے لیے بددعائیہ جملے استعمال کرتی ہیں تو یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور کیا اس موقعہ پر ان کی بددعاء میرے حق میں قبول ہوگی؟

(۸) والدین کے جمائے ہوئے کچھ کاروبار ہیں، میرے الگ ہونے کی صورت میں مجھے اس میں سے کچھ نہ دیویں تو یہ صحیح ہے یا نہیں؟ حالانکہ سارے بھائیوں کو ماہانہ خرچ بھی دیتے ہیں اور کاروبار میں ان کے حصہ طے کر دیے ہیں تو انصاف کیا ہے؟ دوسری بات یہ کہ اگر وہ اپنی زندگی میں مجھے کچھ نہ دیویں؛ لیکن ان کے مرنے کے بعد اس کاروبار میں میرا حق وراثت لگے گا یا نہیں؟

(۹) ساس کا اپنی بہو کے بیمار ہونے پر یہ جملے استعمال کرنا (کہ یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے) کیسا ہے؟

(۱۰) میری والدہ اپنے گھر والوں کو تابع کرنے کے لیے پانی وغیرہ پڑھا کر پلاتی ہیں؛ تاکہ ہم ان کی طرفداری کرنا شروع کر دیں، اور ان کی ہر بات پر لبیک کہنا شروع کر دیں، حقیقت کچھ ایسی ہی ہوئی کہ والد صاحب اور جن بھائی، بہنوں نے یہ پانی پیا وہ ان کے ہو گئے، اور ان کی ہر بات پر لبیک کہنا شروع کر دیا اور ناحق طرفداری شروع کر دی، تو میری والدہ کا یہ فعل صحیح ہے یا نہیں؟ براہ کرم آپ یہ بھی بتا دیں کہ تعویذ کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس طرح کے تعویذ بنا کر دینا اور لینا صحیح ہے یا نہیں؟۔فقط

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے سوالات کے الگ الگ جوابات دینے سے پہلے دین کی ایک اصولی تعلیم اور ہدایت پیش کی جاتی ہے، اس کو ذہن نشین کر لیں:

شریعت میں ہر شخص کو اس بات پر متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض اداء

کرے، حقوق کے مطالبہ پر زور نہیں دیا گیا ہے، آج کی دنیا حقوق کے مطالبہ کی دنیا ہے، ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے، اور اس کے لیے مطالبہ کر رہا ہے، تحریکیں چلا رہا ہے، مظاہرے کر رہا ہے، ہڑتال کر رہا ہے گویا کہ اپنا حق مانگنے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے کے لیے دنیا بھر کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ انجمنیں قائم کی جا رہی ہیں، جن کا نام ''انجمنِ تحفظ حقوق فلاں'' رکھا جاتا ہے؛ لیکن آج ''ادائیگی فرض'' کے لیے کوئی انجمن موجود نہیں، کسی بھی شخص کو اس بات کی فکر نہیں ہے کہ جو فرائض میرے ذمہ عائد ہیں وہ ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ مزدور کہتا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہیے، سرمایہ دار کہتا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہیے؛ لیکن دونوں میں سے کسی کو یہ فکر نہیں ہے کہ میں اپنا فریضہ کیسے ادا کروں، مرد کہتا ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں، اور عورت کہتی ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں، اور اس کے لیے کوشش اور جد وجہد جاری ہے، لڑائی ٹھنی ہوئی ہے، جنگ جاری ہے؛ لیکن کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ جو فرائض میرے ذمہ عائد ہو رہے ہیں وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ کرے۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض ادا کرنے لگے تو سب کے حقوق اداء ہو جائیں، اگر مزدور اپنے فرائض ادا کر دے تو سرمایہ دار اور مالک کے حقوق ادا ہو گئے، اگر سرمایہ دار اور آجر اپنے فرائض ادا کر دے تو مزدور کے حقوق اداء ہو گئے۔ شوہر اگر اپنے فرائض اداء کرے تو بیوی کا حق ادا ہو گیا، اور اگر بیوی اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کا حق ادا ہو گیا۔ شریعت کا اصل مطالبہ یہی ہے کہ تم اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر کرو۔

آج ہمارے زمانے میں عجیب الٹی گنگا بہنی شروع ہو گئی ہے کہ جب کوئی شخص

اصلاح کا جھنڈا اٹھاتا ہے تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اپنی اصلاح کا آغاز کرے، اپنی فکر نہیں کہ میرے اندر بھی کچھ کوتاہی ہے، میں بھی غلطی کا شکار ہوں، میں اس کی فکر کروں حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ﴿یأیها الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذااهتدیتم﴾ (سورة المائدة/۱۰۵) اے ایمان والو! اپنے آپ کی فکر کرو کہ تمہارے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے تم سے کیا مطالبات ہیں؟ شریعت، دیانت، امانت، اور اخلاق کے تم سے کیا مطالبات ہیں؟ ان مطالبات کو بجالاؤ، دوسرا شخص اگر گمراہی میں مبتلا ہے اور اپنے فرائض انجام نہیں دے رہا ہے تو اس کا نقصان تمہارے اوپر نہیں ہوگا بشرطیکہ تم اپنے فرائض صحیح طور سے انجام دے رہے ہو۔

حضور ﷺ کی تعلیم کی بات دیکھئے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں لوگوں سے زکوۃ وصول کرنے کے لیے عامل جایا کرتے تھے، جو لوگوں سے زکوۃ وصول کرتے تھے، اور اس زمانے میں زیادہ تر مال مویشیوں یعنی اونٹ، بکریاں، گائے وغیرہ کی شکل میں ہوتا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب عاملوں کو بھیجتے تو ان کو ایک ہدایت نامہ عطاء فرماتے کہ تمہیں وہاں جاکر کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟ اس ہدایت نامہ میں یہ بھی تحریر فرماتے کہ "لاجلب ولاجنب فی زکاة ولاتؤخذ زکوتهم إلادورهم" (ابو داؤد کتاب الزکوة، باب أین تصدق الأموال، حدیث نمبر/۱۵۹۱) یعنی تم خود لوگوں کے گھروں پر جاکر زکوۃ وصول کرنا، ایسا مت کرنا کہ تم ایک جگہ پر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کو اس بات کی تکلیف دو کہ وہ زکوۃ کا مال تمہارے پاس لاکر دیں، اور یہ بھی ہدایت فرماتے کہ "المعتدي فی الصدقة کمانعها (ابو داؤد، کتاب الزکوة، باب زکوة السائمة، حدیث نمبر/۱۵۸۵) یعنی جو شخص زکوۃ وصول کرنے میں زیادتی کر رہا ہے، مثلاً جتنی زکوۃ واجب تھی مقدار میں اس سے زیادہ وصول کر رہا ہے، یا کیفیت میں

زیادہ وصول کر رہا ہے اس کے بارے میں فرمایا کہ ایسا شخص بھی اتنا ہی گنہگار ہے جتنا زکوۃ نہ دینے والا گنہگار ہے، لہذا ایک طرف عاملوں کو تو یہ تاکید کی جارہی ہے کہ تم لوگوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ اور جتنی زکوۃ واجب ہوتی ہے اس سے ایک ذرہ بھی زیادہ وصول نہ کرو، اگر ایسا کروگے تو قیامت کے دن تمہاری پکڑ ہوگی۔ دوسری طرف جن لوگوں کے پاس زکوۃ وصول کرنے کے لیے ان عاملوں کو بھیجا جارہا تھا ان سے خطاب کر کے فرمایا ''إذا جاء کم المصدق فلا یفارقنکم إلا عن رضی (ترمذی، کتاب الزکوۃ، باب ماجاء فی رضی المصدق. حدیث نمبر/٦٤٧) یعنی تمھارے پاس زکوۃ وصول کرنے والے آئیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے ناراض ہوکر جائیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان کو راضی کرو اور کوئی ایسی غلطی نہ کرو جس سے وہ ناراض ہوجائیں، کیونکہ درحقیقت وہ میرے فرستادہ اور میرے نمائندہ ہیں، اور ان کو ناراض کرنا گویا مجھے ناراض کرنا ہے لہذا عاملین کو یہ تاکید فرمائی کہ تم کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔ اور زکوۃ دینے والوں کو یہ تاکید فرمائی کہ جب عاملین تمھارے پاس آئیں تو وہ تم سے راضی ہوکر جائیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کا احساس دلایا جارہا ہے۔ آپ ﷺ نے زکوۃ دینے والوں کو یہ نہیں فرمایا کہ تم سب مل کر ایک تحریک چلاؤ کہ یہ جو عاملین زکوۃ وصول کرنے کے لیے آرہے ہیں وہ ہمارے حقوق پامال نہ کریں، اس کے لیے انجمن قائم کرو؛ اس لیے کہ یہ ایک لڑائی کا ذریعہ بن جاتا۔

شریعت میں سارا زور اس بات پر ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگہداشت کرے، فرائض کو بجالانے کی فکر کرے، اللہ تعالی کے سامنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے۔ اس کی فکر کرے کہ میں اللہ کے سامنے ٹھیک جواب دے سکوں گا یا نہیں؟ دین کا سارا فلسفہ یہ ہے، یہ نہیں کہ ہر شخص دوسروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہے، اور اپنے

فرائض کی ادائیگی سے غافل رہے۔ (اصلاحی خطبات ۲/۶۳ تا ۶۵)

حضور اکرم ﷺ نے صالح معاشرہ کے قیام کے لیے امت کی جو رہنمائی فرمائی ہے وہ ایسی واضح اور مکمل ہے کہ اگر اس کو پورے پورا عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ایک صالح اور معیاری معاشرہ قائم ہوگا بلکہ کسی کو کسی سے شکایت کا کوئی موقع نہیں رہیگا، آجکل لوگوں نے لینے اور دینے کے پیمانے الگ الگ بنا رکھے ہیں، اور یہی مزاج سارے فساد کی جڑ ہے۔ مثال کے طور پر جب بیٹے کا نکاح کروا کر بہو گھر لائی جاتی ہے تو بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کا حق بعد میں ہے اور ہمارا حق پہلے ہے؛ لہذا یہ بہو بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے ہماری خدمت ضرور کرے، بیٹے کی اطاعت کرے یا نہ کرے، ہماری اطاعت ضرور کرے؛ حالانکہ ان کا یہ نظریہ ہی بنیادی طور پر غلط اور اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، پھر مزید طرّہ یہ ہے کہ یہی ماں باپ اپنی بیٹی کا نکاح کروا کر دوسرے کے گھر بھیجتے ہیں اس وقت ان کی سوچ یہ نہیں ہوتی، وہاں تو ان کی بھی دلی تمنا اور خواہش بلکہ اس کے لیے سر توڑ کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمارا داماد اپنی بیوی یعنی ہماری بیٹی کو لیکر الگ گھر آباد کرے، جہاں ہماری بیٹی کو اپنے ساس، سسر کی خدمت نہ کرنا پڑے؛ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ" (تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے) اپنی اغراض اور مفادات ہی کو بنیاد قرار دے کر ہر آدمی دوسرے کے ساتھ پیش آتا ہے، اللہ تبارک وتعالی اور حضور اکرم ﷺ نے جو احکامات دیے ہیں اور طریقہ بتلایا ہے، اس کو بنیادی حیثیت دینے کے لیے کوئی تیار نہیں، مزید برآں رسم ورواج نے لوگوں کے

دل ودماغ پر ایسا تسلط جما رکھا ہے کہ اچھے اچھے دیندار لوگ بھی اس کے سامنے سپر ڈال دیتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قدم قدم پر شریعت مطہرہ کے معاشرتی احکام وہدایات کی خلاف ورزی میں کوئی باک محسوس نہیں کیا جاتا۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات پیش ہیں:

(۱) حضرت تھانویؒ اپنے رسالہ ''حقوق الاسلام'' میں اولاد کے حقوق کے عنوان کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں ''جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی طرح ماں باپ پر اولاد کے حقوق ہیں، وہ یہ ہیں: (۱) نیک بخت عورت سے نکاح کرنا تاکہ اچھی اولاد پیدا ہو (۲) بچپن میں محبت کے ساتھ ان کی پرورش کرنا کہ اولاد کو پیار کرنے کی بھی فضیلت آئی ہے؛ بالخصوص لڑکیوں سے دل تنگ نہ ہونا، انکی پرورش کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے، اگر انا کا دودھ پلانا پڑے تو خلیق اور دیندار انا تلاش کرنا کہ دودھ کا اثر بچہ کے اخلاق میں آتا ہے (۳) ان کو علم دین وادب سکھلانا (۴) جب نکاح کے قابل ہوں انکا نکاح کردینا، اگر لڑکی کا شوہر مرجائے تو نکاح ثانی ہونے تک اس کو اپنے گھر آرام سے رکھنا، اس کے مصارف ضروریہ کا برداشت کرنا''۔ (اصلاحی نصاب/۴۳۳)

سسرالی عزیزوں کے حقوق کے عنوان کے ماتحت اسی رسالہ میں لکھا ہے ''قرآن مجید میں حق تعالی نے نسب کے ساتھ علاقۂ مصاہرہ کو بھی ذکر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ساس، سسر اور سالے وبہنوئی اور داماد اور بہو اور ربیب یعنی بیوی کی پہلی اولاد کا بھی حق کسی قدر ہوتا ہے؛ اس لیے ان تعلقات میں بھی رعایت احسان واخلاق کے کسی قدر خصوصیت کے ساتھ رکھنا چاہیے۔ (اصلاحی نصاب/۴۳۶)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتھم فرماتے ہیں:

ایک بات اور سمجھ لیجیے جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے وہ یہ کہ جب عورت کے ذمہ شوہر کا اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں، تو شوہر کے جو ماں باپ اور بہن بھائی ہیں ان کے لیے کھانا پکانا اور ان کی خدمت کرنا بطریقۂ اولی واجب نہیں۔ ہمارے یہاں یہ دستور چل پڑا ہے کہ جب بیٹے کی شادی ہوئی تو اس بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کا حق بعد میں ہے اور ہمارا حق پہلے ہے، لہذا یہ بہو ہماری خدمت ضرور کرے چاہے بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے، اور پھر اس کے نتیجہ میں ساس، بہو، بھاوج اور نندوں کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جھگڑوں کے نتیجہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

خوب سمجھ لیجیے اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہے تو لڑکے کے ذمہ واجب ہے کہ وہ خود ان کی خدمت کرے، البتہ اس لڑکے کی بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی خوش دلی سے اپنی سعادت اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے؛ لیکن لڑکے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کرنے پر مجبور کرے جبکہ وہ خوش دلی سے ان کی خدمت پر راضی نہ ہو، اور نہ والدین کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی بہو کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہماری خدمت کرے؛ لیکن اگر وہ بہو خوش دلی سے اپنی سعادت مندی سمجھ کر اپنے شوہر کے والدین کی جتنی خدمت کرے گی انشاء اللہ اس کے اجر میں بہت اضافہ ہوگا، اس بہو کو ایسا کرنا بھی چاہیے تاکہ گھر کی فضاء خوش گوار رہے؛ لیکن ساتھ ہی دوسری جانب ساس، سسر اور شوہر کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر یہ خدمت انجام دے رہی ہے تو یہ اس کا حسن سلوک ہے، اس کا حسن اخلاق ہے، اس کے ذمہ یہ خدمت فرض وواجب نہیں ہے۔ لہذا ان کو چاہیے کہ وہ بہو کی اس خدمت کی قدر کریں اور

اس کا بدلہ دینے کی کوشش کریں، ان حقوق اور مسائل کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں آج گھر کے گھر برباد ہو رہے ہیں، ساس بہو کی اور بھاوج اور نندوں کی لڑائیوں نے گھر کے گھر اجاڑ دیے، یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ ان حقوق کی وہ حدود جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں وہ ذہنوں میں موجود نہیں ہیں۔ (اصلاحی خطبات ۲/ ۴۱، ۴۲)

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں ''بعضے آدمی اس کو بڑی سعادت مندی سمجھتے ہیں کہ بی بی کو اپنی ماں کا محکوم و مغلوب بنا کر رکھیں، اور اس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہیے کہ بی بی پر فرض نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے، تم سعادت مند ہو خود خدمت کرو، خدمت کے لیے نوکر لاؤ''۔ (اصلاح انقلاب امت ۲/ ۱۸۸)

(۲) حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں ''اور نفقہ ہی کا ایک جز و بی بی کو رہنے کے لیے گھر دینا ہے، اس کے متعلق ایک عام غلطی میں اکثر مرد مبتلا ہیں کہ جداگانہ گھر دینا اپنے ذمہ واجب نہیں سمجھتے، بس اپنے عزیزوں میں عورت کو لا ڈالتے ہیں، سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر شامل رہنے پر عورت بخوشی راضی ہو تب تو خیر ورنہ اگر وہ سب سے جدا رہنا چاہے تو مرد پر اس کا انتظام واجب ہے، اور یہاں بھی راضی ہونے کے معنی وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، یعنی طیب خاطر سے راضی ہو، حتی کہ اگر مرد کو قرائن قویہ سے معلوم ہو جائے کہ وہ جدا رہنا چاہتی ہے مگر زبان سے اس کی درخواست نہ کر سکے تب بھی مرد کو شامل رکھنا جائز نہیں، البتہ اتنی گنجائش ہے کہ اگر پورا گھر جدا نہ دے سکے تو بڑے گھر میں سے ایک کوٹھری یا کمرہ ایسا دینا کہ اس کی ضروریات کو کافی ہو سکے اور اس میں اپنا مال واسباب مقفل کر کے (تالا وغیرہ لگا کر) رکھ سکے، اور آزادی کے ساتھ اپنے میاں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ اٹھ سکے، بات چیت کر سکے، یہ واجب کے ادا کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

اور آج کل کے طبائع وواقعات کا مقتضاء تو یہ ہے کہ اگر عورت شامل رہنے پر راضی بھی ہو اور جدا رہنے سے سب اعزہ (رشتہ دار) ناخوش بھی ہوں تب بھی مصلحت یہی ہے کہ جدا ہی رکھے، اس میں ہزاروں مفاسد کا انسداد (ہزاروں خرابیوں کی روک تھام) ہے، اور گو اس میں چند روز کے لیے عزیزوں کا ناک منہ چڑھے گا مگر اس کی مصلحتیں جب مشاہد ہوں گی سب خوش ہو جائیں گے، خصوصاً چولہا تو ضرور ہی علیحدہ ہونا چاہیے، زیادہ تر آگ اس چولہے ہی سے بھڑکتی ہے۔

فقہاء نے یہاں تک فرمایا ہے کہ مرد کی اگر پہلی بیوی سے کچھ اولاد ہو، دوسری بی بی کو اس کے ساتھ بھی شامل رہنے پر مجبور نہیں کرسکتا، اور آجکل واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بالخصوص دوسری اولاد کے ساتھ شامل رہنا بڑے بڑے فسادوں کی جڑ ہے کہ دوسرے عزیزوں کے ساتھ اتنا فساد نہیں ہوتا۔ (اصلاح انقلاب امت ۲/ ۱۸۷، ۱۸۸)

حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں ”اگر بیوی مالدار ہو تو اسے الگ مکان دینا واجب ہے، متوسط درجہ کی ہو تو اسی مکان میں ایک مستقل کمرہ کے علاوہ باورچی خانہ، غسل خانہ، اور بیت الخلاء بھی مستقل ہونا ضروری ہے، مسکین ہو تو صرف ایک کمرہ کافی ہے، باورچی خانہ، غسل خانہ اور بیت الخلاء مشترک ہوں تو مضائقہ نہیں۔ (احسن الفتاوی ۵/ ۴۷۶)

(۳) شریعت کی ہدایت اور حکم پر عمل کرنے میں آدمی کی عزت بڑھتی ہے، آپ کے والد صاحب کا اس کو اپنی عزت پر دھبہ پڑنے سے تعبیر کرنا درست نہیں، ممکن ہے ان کو یہ خیال ہو کہ علیحدہ کرنے کی صورت میں لوگ یہ سوچیں گے کہ بہو کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ ہوا ہوگا؛ اس لیے علیحدگی کی نوبت آئی اور عموماً لوگ بھی اس طرح کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں، اس کا حل یہ ہے کہ والد صاحب خود ہی آپ دونوں کو علیحدہ رہنے کا

فیصلہ کریں اور علیحدگی کے بعد بھی آپ میاں بیوی کی طرف سے کوئی ایسی بات جو لوگوں کی مندرجۂ بالا غلط قیاس آرائیوں کی تائید کرتی ہو پیش نہیں آنی چاہیے، آپ والد صاحب کو اس کا اطمینان دلائیں۔

(۴) ان کا یہ جملہ غیر اسلامی تہذیب کی پیداوار ہے۔

(۵) جھوٹی تہمت لگانا گناہ کبیرہ ہے، اس سے توبہ لازم ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو شخص کسی مسلمان پر ایسی بات لگائے جو اس میں نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخیوں کے لہو اور پیپ کے جمع ہونے کی جگہ رہنے کو دیں گے، یہاں تک کہ اپنے کہے سے باز آئے اور توبہ کرے۔ (اختری بہشتی زیور ساتواں حصہ/ ۳۸)

(۶) فتاوی رشیدیہ سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: اگر والدین نفسانیت سے یا بوجہ اپنی اطاعت نہ کرنے کے طلاق زوجہ کو کہیں نہ بوجہ عذر شرعی کے تو پسر کو طلاق دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: طلاق دے دینا چاہیے وہ خواہ کیسے ہی کہیں۔ (تالیفات رشیدیہ/ ۲۲۴)

فتاوی دار العلوم (عزیز الفتاوی مکمل مبوب) سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا ایک فتوی نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: زید اپنے بیٹے عمر کو کہتا ہے کہ تو اپنی زوجہ منکوحہ ہندہ کو طلاق دیدے پس اس صورت میں اگر ہندہ صالحہ ہے یا فاجرہ ہے، بہر حال کیا حکم ہے زید کو طلاق دینا باپ کے کہنے سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: وعن ابن عمر قال كانت تحتي امرأة احبها و كان عمر يكرهها فقال لي طلقها فابيت فاتى عمر رسول الله ﷺ فذكر ذلك له، فقال له

رسول الله ﷺ: طلقها. (رواہ الترمذی وابو داؤد)

قال فی اللمعات قوله طلقها ان كا ن الحق فی جانب الوالدين فطلاقها واجب للزوم العقوق، وان كان فی جانب المرأة فان طلقها لرضا الوالدين فهو جائز ...... الخ

حدیث مذکور سے واضح ہے کہ باپ کے حکم کو مقدم سمجھے اور عورت کو طلاق دے دے۔اور صاحب لمعات کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ عورت اگر واقع میں فاجرہ، بدزبان وغیرہ ہے اور باپ حق پر ہے تو طلاق اس صورت میں واجب ہے ورنہ جائز وافضل ہے۔(۱/۱۵۳،۱۵۴)

(۷): حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ ''معارف القرآن'' میں تحریر فرماتے ہیں ''دعائے خیر اور اچھی دعاء کے متعلق تو حق تعالی کی یہ عادت ہے کہ اکثر جلد قبول کر لیتے ہیں اور کبھی کسی حکمت ومصلحت سے قبول نہ ہونا اس کے منافی نہیں ،مگر جو انسان کبھی اپنی نادانی سے اور کبھی کسی غصہ اور رنج سے اپنے لیے یا اپنے اہل وعیال کے لیے بد دعاء کر بیٹھتا ہے یا انکار آخرت کی بناء پر عذاب کو کھیل سمجھ کر اپنے لیے دعوت دیتا ہے اسکو فوراً قبول نہیں کرتے بلکہ مہلت دیتے ہیں تا کہ منکر کو غور وفکر کر کے اپنے انکار سے باز آنے کا موقع ملے اور اگر کسی وقت رنج وغصہ یا دل تنگی کے سبب بد دعاء کر بیٹھا ہے تو اس کو اس کی مہلت مل جائے کہ اپنے بھلے برے کو دیکھے اور انجام پر نظر ڈال کر اس سے باز آجائے۔

امام ابن جریر طبریؒ بروایت قتادہؒ اور بخاریؒ ومسلمؒ نے بروایت مجاہد رحمہ اللہ تعالی نقل کیا ہے کہ اس جگہ بد دعاء سے مراد یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی انسان غصہ کی حالت میں اپنی اولاد یا مال ودولت کے تباہ ہونے کی بد دعاء کر بیٹھتا یا ان چیزوں پر لعنت کے الفاظ کہہ ڈالتا ہے اللہ تعالی اپنے لطف وکرم سے ایسی دعا قبول کرنے میں جلدی نہیں فرماتے۔

امام قرطبیؒ نے اس جگہ ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اللہ جل شانہ سے دعاء کی ہے کہ وہ کسی دوست عزیز کی بددعاء اس کے دوست عزیز کے متعلق قبول نہ فرماویں۔ اور شہر بن حوشبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ جو فرشتے انسانوں کی حاجت روائی پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان کو یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ میرا بندہ جو رنج وغصہ میں کچھ بات کہے اس کو نہ لکھو۔ (قرطبی)

اس کے باوجود بعض اوقات کوئی قبولیت کی گھڑی آتی ہے جس میں انسان کی زبان سے جو بات نکلے فوراً قبول ہو جاتی ہے؛ اس لیے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنی اولاد اور مال کے لیے کبھی بددعاء نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ وقت قبولیت دعاء کا ہو اور یہ بددعاء فوراً قبول ہو جائے (اور تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے) صحیح مسلم میں یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے غزوۂ بواط کے واقعہ کے تحت نقل کی گئی ہے۔

ان سب روایات کا حاصل یہ ہے کہ آیت مذکورہ کا اصل خطاب اگرچہ منکرین آخرت اور ان کے فوری مطالبۂ عذاب سے متعلق ہے؛ لیکن اس کے عموم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو کسی رنج وغصہ کی وجہ سے اپنے یا اپنے مال واولاد کے لیے بددعاء کر بیٹھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عادت اس کے فضل وکرم کی وجہ سے دونوں کے ساتھ یہی ہے کہ ایسی بددعاؤں کو فوراً نافذ نہیں فرماتے تاکہ انسان کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل جائے۔ (۴/۵۱۷)

(۸) والدین اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو جو کچھ دیتے ہیں اس کی حیثیت ہبہ اور بخشش کی ہے، اور اس کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ اس میں تمام اولاد کے ساتھ برابر کا سلوک کیا جائے، کسی کو دینا اور کسی کو نہ دینا یا کسی کو زیادہ دینا اور کسی کو کم دینا نامناسب ہے، البتہ اولاد میں سے کسی کی نیکی یا اس کی خدمت واطاعت یا اس کی احتیاج کے پیش نظر

زیادہ دے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

والدین میں سے کوئی اپنے انتقال کے وقت اپنی ملک میں جو کچھ چھوڑ کر جاتا ہے اس میں انکی تمام اولاد کو حق وراثت ملتا ہے ان میں کی کوئی اولاد اپنی نافرمانی یا والدین کی ان سے ناراضگی کی وجہ سے حق وراثت سے محروم نہیں ہوتی۔

(نوٹ) آپ کو حق وراثت کا تو فکر لگا ہے، لیکن آخرت میں والدین کی ناراضگی کی وجہ سے جو معاملہ پیش آنے والا ہے اس کا فکر نہیں۔

(۹) قرآن پاک میں باری تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم ویعفو عن کثیر﴾ (اور جو پڑے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا تمہارے ہاتھوں نے اور معاف کرتا ہے بہت سے گناہ)۔

(۱۰) کیا واقعۃً آپ نے اس طرح کرتے ہوئے والدہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ یا آپ کے پاس اس کا کوئی شرعی ثبوت ہے؟ اگر نہیں تو یہ ایک بہتان ہے جو آپ والدہ پر لگا رہے ہیں اور بہت ہی ناشائستہ قسم کی بدگمانی ہے جو والدہ کے ساتھ کی جارہی ہے، اسی طرح کا الزام وہ بھی اپنی بہو وغیرہ پر لگا سکتے ہیں، اور یہی وہ بدگمانیاں ہیں جس نے آپ کی ازدواجی زندگی کو بے چین کر رکھا ہے، والدین کے اولاد پر بڑے حقوق ہیں اور ان کی فرماں برداری اور خدمت کے سلسلہ میں قرآن وحدیث میں بڑی تاکید آئی ہے، والدین خواہ کیسے ہی برے ہوں ان کی بے ادبی وگستاخی نہ کی جائے، والدین اگر ماریں، پیٹیں، گالی گلوچ کریں، برا بھلا کہیں یا طعن وتشنیع کرتے رہیں، تو ان کی ایذاؤں کو برداشت کیا جائے اور ان کو الٹ کر جواب نہ دیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: احمد خانپوری، ۱۰/ جمادی الاولی ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ — الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

S.M.S میڈیا کمپنی کا بذریعۂ موبائل اشتہار کے معاوضہ کا حکمِ شرعی

سوال: کچھ عرصہ قبل ایک کمپنی بنام ایس ایم ایس میڈیا، بمبئی اور دیگر بڑے شہروں میں رائج ہوئی ہے، اس کا طریقِ کام اس طرح ہے کہ یہ کمپنی بہت سی بڑی کمپنیوں سے معاہدہ کرتی ہے کہ ہم تمہاری ایڈوٹائز (اشتہار) بذریعہ SMS لوگوں کے موبائل پر کرینگے۔ اس طرح تمہارا کاروبار فروغ پائیگا؛ چنانچہ تقریباً ۲۰۰/ دوسو سے زائد کمپنیوں سے یہ معاہدہ ہے۔ اور یہ مذکورہ SMS میڈیا کمپنی ان کے اشتہار اپنے کلائنٹ کے موبائل پر SMS کررہی ہے، پس منظر اس کا یہ ہے کہ بڑی بڑی کمپنیوں سے ایڈوٹائزنگ کے لیے بڑی بڑی شخصیات سے کروڑوں روپیہ میں اشتہار کے لیے معاہدہ ہوتا ہے اور پھر ٹی۔ وی پر دکھانے کی الگ رقم لگائی جاتی ہے۔ غرض بہت بڑی رقم اس کام میں صرف ہوتی ہے۔ لیکن اس کمپنی کی سوچ یہ ہے کہ صرف ۲۵ فیصد لوگ ہی ٹی۔ وی پر ان کو دیکھتے ہیں؛ کیونکہ نوجوان بوڑھے اپنے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو ٹی۔ وی دیکھنے کا وقت کم ملتا ہے۔ برخلاف اس کے اب عام طور پر لوگوں کے پاس موبائل ہیں، جس میں بچے، لڑکے، بوڑھے؛ سب شریک ہیں، اور SMS کا عام رواج ہے، تو اس کے ذریعہ ایڈوٹائز آسان اور زیادہ لوگوں تک پیغام رسانی کا ذریعہ ہوتی ہے، لہذا یہ SMS میڈیا کمپنی بڑی کمپنیوں سے اس کام کی ایک بڑی رقم اجرت کے لیے لیتی ہے، اور اس کے بعد عوام میں اپنے کلائنٹ بنا کر اپنا معاملہ شروع کرتی ہے۔ اس معاملہ میں بطور رجسٹریشن بمبئی میں ۵۰۰/ پانچ سو روپیہ اور دیگر شہروں میں ۶۵۰/ ساڑھے چھ سو روپیے لیتی ہے۔ اور ایک ماہ بعد وہ ۵۰۰/ پانچ سو روپیے لوٹا دیتی ہے، اور یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ رجسٹریشن اس لیے ہے کہ قانوناً کوئی آدمی SMS بار بار کرے اور سامنے والا اس

کی شکایت کرے کہ اس کے اس عمل سے مجھے تکلیف ہوتی ہے تو عدالتی کارروائی ہوسکتی ہے۔ یہ جرم سے بچنے کے لیے یہ کمپنی گویا آپ سے رجسٹریشن کے ذریعہ اجازت حاصل کرکے آپ کو اشتہار کے SMS کرتی ہے۔ یہ تین سال کا معاہدہ ہوتا ہے کہ تین سال تک آپ کو SMS آئینگے۔ اب یہ ممبر اپنا وقت اسکو پڑھنے میں لگائے گا اور ذہنی طور پر بھی کچھ الجھن ہوگی وغیرہ...... اس کے بدلہ میں یہ کمپنی جو ایک خطیر رقم ایڈوٹائز کے لیے وصول کرچکی ہے اس میں سے طے شدہ رقم مثلاً ۱۶ ماہ میں تاریخ طے کرکے دس ہزار روپیہ نفع میں سے ممبران کو دے گی، اور باقی وہ سارا نفع اپنے پاس رکھے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ شرکت جائز ہے؟ سود وغیرہ کی بات اس میں ہے تو نہیں؟ اور اس کام کے لیے ایجنٹ بنکر کمیشن کمانا کمپنی سے جائز ہے؟

نوٹ: اس کمپنی کے طریقۂ کار کے متعلق پوری تفصیل بس یہی ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اولاً بنیادی طور پر یہ سمجھ لیں کہ SMS میڈیا کمپنی اگر دوسری کمپنیوں سے ان کی چیزوں کے اشتہار کا جو معاملہ کرتی ہیں، اگر وہ چیزیں جن کا اشتہار دیا جارہا ہے جائز اور مباح چیزیں ہیں کہ شرعاً ان کے استعمال میں کوئی ممانعت نہیں؛ نیز اشتہار کے لیے SMS میڈیا کمپنی جو طریقۂ کار اختیار کررہی ہے، وہ بھی شرعاً درست ہو، مثلاً اشتہار میں جاندار کی تصاویر یا کسی ایسی چیز کا استعمال جو شرعاً ممنوع ہو، نہیں کرتی تب تو SMS میڈیا کمپنی کا یہ معاملہ درست ہے۔ اور اسکے لیے اشتہار کے معاوضہ کے طور پر رقم لینا درست ہے، ورنہ خود اس کے لیے ہی یہ رقم درست نہ رہے گی تا بدیگراں چہ رسد؟ پہلی صورت میں جو لوگ دلال اور ایجنٹ بنکر مالکین موبائل سے اجازت لینے کا کام کرتے ہیں، ان کے

لیے بھی اپنی دلالی کی اجرت درست ہوگی۔ نیز موبائل کے مالکان جوان اشتہارات کے لیے اپنے موبائل کی اسکرین کو استعمال کرنے نیز ان کو پڑھنے کی زحمت (بقول سائل) گوارا کرتے ہیں ان کے لیے بھی مقررہ اصول اجارہ کے مطابق معاوضہ لینا درست ہوگا؛ البتہ جب انہوں نے یہ عقد کرلیا تو ان کے لیے ضروری ہے کہ اس نوع کے SMS کو پڑھنے سے پہلے محو نہ کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ یکم رمضان ۱۴۲۷ھ

سائبر کافے اور گیم پارلر کھولنے کا شرعی حکم

سائبر کافے میں مختلف کام ہوتے ہیں۔

(۱) نیٹ نوفون یعنی فون لگا کر دوسرے ممالک میں بات کی جاتی ہے۔

(۲) لڑکے لڑکی بیٹھ کر اس پر دوستی قائم کرتے ہیں۔

(۳) انٹرنیٹ لائن ہوتی ہے۔

(۴) ویب سائٹ ہوتی ہے: اچھی بھی، بری بھی۔

(۵) گانے سنے جاسکتے ہیں۔

(۶) فلم بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

سوال (۱) دو چار کمپیوٹر فٹ کرا کر انٹرنیٹ لائن جوڑ دی جاتی ہے، پھر آنے والے آتے ہیں اور مثلاً ایک گھنٹہ کا کرایہ ۱۵ یا ۲۰ روپیے ہوتا ہے وہ دیگر آدمی اس کیبن میں جا کر جو دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے اس دوکان کو سائبر کافے کہا جاتا ہے، کیا اس کو کھول سکتے ہیں؟ اور اس سے حاصل کردہ روزی حلال ہوگی یا حرام؟

(۲) گیم پالر کھول سکتے ہیں؟اس میں بچوں کے کھیلنے کی گیم ہوتی ہے کمپیوٹر پر یا دوسرے مشین پر، اس میں بھی کرایہ دیکر کھیلنا ہوتا ہے کیا یہ درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) سائبر کافے میں وہاں پر فٹ کیے گئے کمپیوٹر سے اجرت دے کر فائدہ اٹھانے کے لیے جو لوگ آتے ہیں، ان کے متعلق اگر یہ یقین ہو کہ وہ اس کو ناجائز کام میں استعمال کریں گے مثلاً لڑکے لڑکی دوستی قائم کرنے کے لیے استعمال کریں یا گانا سننے کے لیے یا فلم دیکھنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے یا بری ویب سائٹ دیکھنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے، تو یہ معاملہ ''تعاون علی الاثم'' ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿و لا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾ (سورۂ مائدہ)

اور اس سے حاصل کردہ آمدنی بھی خبیث (ناپاک) ہے، اور اگر یقین ہو کہ وہ اس کو جائز کام میں استعمال کریں گے مثلاً فون لگا کر جائز بات چیت یا ویب سائٹ سے جائز معلومات حاصل کرنے کے لیے وغیرہ تو یہ معاملہ درست ہے، اور اس سے حاصل کردہ آمدنی حلال اور پاک ہے، اور جہاں یقینی طور پر معلوم نہ ہو وہاں غالب گمان کو بھی یقین کا درجہ دیا جاتا ہے اور وہی حکم اس پر جاری کیا جاتا ہے۔

(۲) گیم پارلر جس میں بچوں کے لیے ویڈیو گیم کھیلنے کا انتظام ہوتا ہے، اس کے متعلق حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ کا جواب پڑھ لیں:

''ویڈیو گیم اور دیکھنے والوں کے مشاہدہ سے جہاں تک پتہ چلا اور حقیقت معلوم ہوئی، یہ کھیل چند وجوہات سے شرعاً جائز نہیں:

اول: اس کھیل میں دینی اور جسمانی کوئی فائدہ مقصود نہیں ہوتا اور جو کھیل ان

دونوں فائدوں سے خالی ہو وہ جائز نہیں۔

دوم: اس میں وقت اور روپیہ ضائع ہوتا ہے اور ذکر اللہ سے غافل کرنے والا ہے۔

سوم: سب سے شدید ضرر یہ ہے کہ اس کھیل کی عادت پڑنے پر چھوڑنا دشوار رہتا ہے۔

چہارم: بعض گیم تصویر اور فوٹو پر مشتمل ہوتے ہیں جو کہ شرعاً ناجائز ہے۔

پنجم: اس کھیل سے بچوں کو اگر چہ دلی فرحت اور لذت حاصل ہوتی ہے؛ لیکن ناجائز چیزوں سے لذت حاصل کرنا بھی حرام ہے، بلکہ بعض فقہاء نے کفر تک لکھا ہے۔

علاوہ ازیں اس سے بچوں کا ذہن خراب ہوتا ہے اور اس سے بامقصد تعلیم میں خلل واقع ہوتا ہے، پھر بچوں کو پڑھائی اور دوسرے فائدہ والے کاموں میں دلچسپی نہیں رہتی وغیرہ۔

ان مذکورہ وجوہات کی بناء پر یہ کھیل باری تعالیٰ کے ارشاد کا مصداق ہے ’’بعض لوگ اپنی جہالت سے کھیل تماشے اختیار کرتے ہیں اور اس میں پیسے خرچ کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالی کی راہ سے لوگوں کو بھٹکا دیں، اور دین کی باتوں کو کھیل تماشہ بناتے ہیں، انہیں لوگوں کے لیے اہانت والا عذاب ہے‘‘ (سورۂ لقمان آیت نمبر ۶)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ ﴿لهو الحديث﴾ کے متعلق فرماتے ہیں کہ آیات مذکورہ میں لہوالحدیث سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے ہٹانے والی ہو، مثلاً فضول لہوولعب، فضول قصہ گوئی، ہنسی مذاق کی باتیں، واہیات مشغلے اور گانا بجانا وغیرہ، واضح رہے کہ مذکورہ آیات کا شان نزول اگر چہ خاص ہے مگر عموم الفاظ کی وجہ سے حکم عام رہے گا یعنی جو کھیل فضول اور وقت و پیسہ ضائع کرنے والا ہے وہی آیات مذکورہ کی وعید میں داخل ہے۔ چونکہ ویڈیو گیم میں یہ ساری قباحتیں موجود ہیں؛ اس لیے یہ گیم ناجائز ہے اس میں وقت اور پیسہ لگانا ناجائز ہے اور اس کو ترک کردینا لازم ہے۔ (آپ کے مسائل اوران کا

حل ۷/ ۳۳۶، ۳۳۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

۴/ جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ

مروّجہ بالواڑی کی شرعی حیثیت

سوال: آج کل شہروں میں مروجہ بالواڑی الگ الگ مقاصد کے تحت مختلف زبانوں میں چلتی ہے، اسی طرح ہم بھی ایک بالواڑی اردو زبان کے لیے چلانا چاہتے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان کا فروغ ہو جو ہماری دینی، تہذیبی زبان ہے تا کہ ہمارا رشتہ اسلامی تعلیمات سے اور پوری دنیا کے مسلم برادران سے قائم رہے۔

تو اس سلسلہ میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ بالواڑی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بالواڑی میں عموماً تین/ ساڑھے تین سال سے لیکر پانچ سال کی عمر کے بچوں کو روزانہ ڈیڑھ گھنٹہ تعلیم دی جاتی ہے۔ تو کیا اس عمر میں شرعی اعتبار سے تعلیم دینا بچوں پر نا قابل تحمل بوجھ سمجھا جائیگا؟ اس صورت حال میں بالواڑی کے منتظمین عنداللہ ماٴخوذ ہونگے؟

حسب بالا عمر والے بچوں کو بالواڑی میں داخلہ دیا جاتا ہے تو کیا اس عمر میں بچوں کو تعلیم دینے کی شرعاً کوئی ممانعت ہے نیز ابتدائے تعلیم کے لیے شرعاً کونسی عمر سے ابتداء کر سکتے ہیں۔ او پر درج شدہ عمر میں کوئی کمی بیشی ہوسکتی ہے ہم ایک بالواڑی شروع کرنا چاہتے ہیں؛ اس لیے ضرور رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں جو ہدایت اور رہنمائی شریعت کی طرف سے دی گئی ہے اس کے لیے کسی عمر کی تحدید نماز اور ان کے بستر الگ کرنے والے حکم کے علاوہ امور میں میری نظر سے نہیں گزری، تعلیم صرف لکھانے پڑھانے کا نام نہیں،

بلکہ زبانی طور پر ہدایت دے کر اسلامی تعلیمات ان کے ذہن نشیں کرانا بھی تعلیم ہی کا ایک حصہ ہے۔ اور اس کی ابتداء تو بچہ میں جہاں شعور پیدا ہونے لگے تب ہی سے ہو جاتی ہے، دور نبوت میں اسی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ حکایات صحابہ میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے نقل کیا ہے حضرت ربیع بنت معوذ کہتی ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ اعلان کرایا کہ آج عاشوراء کا دن ہے سب کے سب روزہ رکھیں۔ ہم لوگ اسکے بعد سے ہمیشہ روزہ رکھتے اور اپنے بچوں کو بھی روزہ رکھواتے تھے، جب وہ بھوک کی وجہ سے رونے لگتے تو روئی کے گالے کے کھلونے بنا کر ان کو بہلانے لگتے اور افطار کے وقت تک اسی طرح انکو کھیل میں لگائے رکھتے۔

آگے ''فائدہ'' کے عنوان کے ماتحت لکھا ہے۔ بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ مائیں دودھ پیتے بچوں کو دودھ نہیں پلاتی تھیں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس وقت قوی نہایت قوی تھے اور اب بہت ضعیف، وہ لوگ اور وہ بچے اس کے متحمل تھے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جتنے کا اب تحمل ہے وہی کہاں کیا جاتا ہے، تحمل کا دیکھنا تو نہایت ضروری ہے مگر اب جس کا تحمل ہو اس میں کوتاہی یقیناً نامناسب ہے۔ (حکایات صحابہ ص ۱۴۷/۱۴۸)

تین سال سے لیکر پانچ سال تک کی عمر کے بچوں کو روزانہ ڈیڑھ گھنٹہ تعلیم کی غرض سے مشغول رکھنا بظاہر ناقابل تحمل بوجھ نہیں خصوصاً مروجہ بالواڈیوں میں اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو اس عمر کے بچے لغو کھیلوں میں اپنا وقت ضائع کریں یا ٹی وی پر کارٹون فلمیں دیکھتے رہیں، اس کے مقابلہ میں بہت مناسب بلکہ مستحسن کام ہے۔ بزرگوں سے علم کی تحصیل کے سلسلہ میں ایک جملہ سنتے چلے آرہے ہیں ''اطلبوا العلم من المهد الى اللحد'' اگرچہ اس وقت اس کا مأخذ تلاش کرنے کا نہ

وقت ہے نہ ہمت لیکن اہل علم کے درمیان یہ چیز معروف ہے، اس جملہ کا خلاصہ یہ ہے کہ علم کے حصول کا سلسلہ گہوارے سے لے کر قبر تک جاری رہنا چاہیے، اس سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر اور اسلاف کے یہاں تعلیم کے لیے کسی عمر کی تحدید نہیں۔ ھذا ما عندی. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

عصر حاضر میں رائج کھیلوں (کرکٹ، فٹ بال وغیرہ) اور لہو ولعب کا حکم

حامداً و مصلیاً و مسلماً: -

بخدمت گرامی جناب مفتی صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام مسئلۂ ذیل میں:

مسلمانوں کا کھیلوں (Sports) میں مشغول ومصروف ہونا عام ہو رہا ہے اس کے متعلق حسب ذیل سوالات ہیں:

(۱) اگر کسی کھیل میں کوئی ناجائز اور خلاف شرع امر کا ارتکاب نہ ہوتا ہو تو وہ جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کیا مذکورہ کھیل میں (جو غیر شرعی امور پر مشتمل نہ ہو) ورزش کا مقصود ہونا ضروری ہے یا تفریح کے طور پر بھی کر سکتے ہیں؟ (صورت جواز میں)

(۳) اگر فی نفسہ جائز ہو تو کیا مالی منفعت کے لیے اس میں شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کو کسب معاش کا ذریعہ بنانا کیسا ہے؟

(۴) بعض حضرات اس کو تشبہ بالغیر اور لا یعنی فرما کر مطلقاً ناجائز قرار دیتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

(۵) جواز وعدم جواز کے علاوہ اولویت وعدم اولویت، منفعت ومضرت کے اعتبار سے بھی اس مسئلہ کے متعلق آراء سے مشرف فرمائیں۔

(۶) جائز کھیلوں میں جولوگ منہمک رہتے ہیں ان کے متعلق کیا حکم ہے؟

(۷) ان کھیلوں کی تماشائی (spectate) کا کیا حکم ہے؟ نیز ریڈیو پر اس کی کومینٹری (commentary) سننا یا ٹیلیویژن پر اس کو دیکھنا جبکہ اسی وقت کھیلا جاتا ہو (live transmission) کیسا ہے؟

مفصل جواب بحوالۂ کتب عنایت فرمائیں، بے حد امتنان ہوگا۔

نوٹ: کھیلوں سے خاص طور پر کرکٹ (cricket) فٹ بال (football) ٹینس (Tennis) اور عمومی لحاظ سے سب کھیل مراد ہیں۔

فقط والسلام مع درخواست دعا:

محمد الیاس بن یوسف پٹیل غفرلہٗ

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشیں رہے کہ کھیل کے سلسلہ میں دورِ حاضر کے نظریہ اور اسلامی نظریہ میں بنیادی اختلاف ہے، دورِ حاضر میں کھیل برائے کھیل اور کھیل بحیثیت ایک فن والا نظریہ رائج ہے، جبکہ اسلام نہ تو کھیل برائے کھیل کا قائل ہے، اور نہ ہی اسکی نئی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، دورِ حاضر کے نظریہ کے اعتبار سے کھیل مقصود بنتا ہے جبکہ اسلام کسی بھی ایسی صورت کی اجازت نہیں دیتا جس میں کھیل کو مقصود قرار دیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں کھیل کا تذکرہ عموماً مذمت کے انداز میں کیا گیا ہے، آپ پورے قرآن مجید کا مطالعہ فرمائیے، لہوولعب کے الفاظ کا استعمال موقع مذمت میں کیا گیا ہے۔

وما الحیوۃ الدنیا الا لعب و لھو (الانعام ۳۲) **اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور جی بہلانا۔** (معارف القرآن ۳/۳۰۵)

وما ھذہ الحیوۃ الدنیا الا لھو ولعب (العنکبوت ٦٤) **اور یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیل ہے۔** (معارف ٦/۷۱۱)

انما الحیوۃالدنیا لعب ولھو (محمد ٣٦) **یہ دنیا کا جینا تو کھیل ہے اور تماشہ۔** (معارف ۸/۴۵)

اعلموا انماالحیوۃ الدنیا لعب ولھو (الحدید ٢٠) **جان رکھو کہ دنیا کی زندگانی یہی ہے کھیل اور تماشہ۔** (ایضاً ۸/۳۱۳)

فذرھم یخوضوا ویلعبوا حتی یلقوا یومھم الذی یوعدون (الزخرف ٨٣، المعارج ٤٢) **سو چھوڑ دے ان کو کہ باتیں بنائیں اور کھیلا کریں یہاں تک کہ مل جائیں اپنے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ ہے۔** (ایضاً ۸/۵۵۱)

ولئن سألتھم لیقولن انما کنا نخوض ونلعب (التوبہ ٦٥) **اور اگر تو ان سے پوچھے تو کہیں گے ہم تو بات چیت کرتے تھے اور دل لگی** (ایضاً ۴/۴۱۴)

قل اللّٰہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون (الأنعام ٩١) **پھر چھوڑ دے ان کو اپنے خرافات میں کھیلتے رہیں** (ایضاً ۳/۳۹۰)

فویل یومئذٍ للمکذبین الذین ھم فی خوض یلعبون (الطور ١٢) **سو خرابی اس دن جھٹلانے والوں کو جو باتیں بناتے ہیں کھیلتے ہوئے۔** (ایضاً ۸/۱۷۴)

واذا نادیتم إلی الصلوۃ اتخذوھاھزواً ولعباً (المائدۃ ٥٨) **اور جب تم پکارتے ہو نماز کے لیے تو وہ ٹھہراتے ہیں اس کو ہنسی اور کھیل** (ایضاً ۳/۱٦۷)

ومن الناس من يشترى لهو الحديث(لقمان ٦) **اور ایک وہ لوگ ہیں کہ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے۔**(۷/۱۷)

قل ما عند الله خير من اللهو (الجمعة ١١) **تو کہہ جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے تماشہ سے۔**(ایضاً ۸/۴۳۹)وغير ذلك من الآيات.

البتہ بعض وہ کھیل جو صورۃً کھیل ہیں؛ لیکن اپنے دینی و دنیوی فوائد کے پیش نظر مقاصدِ شرع کے حصول میں مانع بننے کے بجائے اس کے حق میں ممد و معاون ہیں ان کی یہ کہہ کر اجازت دی گئی ہے کہ اپنے انجام اور مقصود کے اعتبار سے اس کا کھیل والا پہلو مغلوب ہو کر ایسا دب گیا کہ اب وہ کھیل نہ رہا بلکہ مقاصدِ شرع کے حصول کا ذریعہ بن گیا، چاہے اپنی ظاہری شکل و صورت کی وجہ سے اس کو کھیل کا نام دیا جائے۔ سنن أبوداؤد و ترمذی وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی نشاندہی فرمائی گئی ہے:

ليس من اللهو ثلاث تأديب الرجل فرسه وملاعبته اهله ورميه بقوسه ونبله (نصب الراية ٤/٢٧٣) **"تین چیزیں کھیل میں سے نہیں ہیں، آدمی کا اپنے گھوڑے کو سدھانا اور اس کا اپنے اہل کے ساتھ دل لگی کرنا اور اپنے تیر و کمان سے تیر چلانا"۔**

اس کے برخلاف عصر حاضر میں کھیلوں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ کھیل کو بحیثیت کھیل ہی خصوصی اہمیت دی جا رہی ہے اس کو ایک فن کے طور پر معراج کمال پر پہنچانے کے لیے ہر نوع کے اسباب اختیار کیے جا رہے ہیں، اس کے نام کی مستقل وزارت قائم ہے، ملکی بجٹ میں اس کے لیے مستقل حصہ الگ رکھا جاتا ہے، اس کے لیے الگ بورڈ قائم کیے جاتے ہیں، اس نام سے ممالک سے روابط قائم کیے جاتے ہیں اس کے لیے نظام ہائے سفر طے ہوتے ہیں (وغير ذلك من الخرافات) بلکہ

اس کے ورزش ہونے کا پہلو جو خالص دنیوی طور پر بھی تمام کھیلوں میں قدرِ مشترک ہونا چاہیےٗ وہ بھی ایسا نظر انداز کیا جارہا ہے کہ وہ نہ کھیلنے والوں کے پیش نظر ہوتا ہے، نہ دیکھنے والوں کے، نہ اس کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کے۔

اسلام نے تجارت کو نہ صرف جائز اور مباح قرار دیا بلکہ اس کی ترغیب یہ کہہ کر دی گئی کہ "تسعة أعشار الرزق" (روزی کے دس حصوں میں سے نو حصے) اس میں رکھے گئے ہیں؛ لیکن جب اس میں بھی لہو کا پہلو شامل ہوا اور عین اس وقت جب کہ لوگ اپنی بنیادی ضروریات کے فقدان کی وجہ سے پریشان تھے اور اسی کے خاطر بوقت خطبہ دوڑ پڑے تو ﴿وإذا رأوا تجارة أو لهوا انفضوا إليها﴾ (الجمعة ۱۱) ''اور جب دیکھیں سودا بکتا یا کچھ تماشہ متفرق ہو جائیں اس کی طرف'' (معارف القرآن ۸/۴۳۹) نازل فرما کر ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی گئی جن کی شان میں ﴿رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله واقام الصلوة﴾ (النور ۳۷) ''وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے (معارف ۶/۴۱۸) وارد ہوا ہے۔

بھلا جب تجارت کے ساتھ اس کی معمولی آمیزش کو جو وقتی حالات وضروریات کی وجہ سے ذکر اللہ سے غفلت کا باعث بنی اسلام برداشت نہیں کرتا تو اس کو مستقل ایک ذریعۂ معاش کی حیثیت سے اختیار کرنے کی تو کیسے اجازت دیگا جس کے نتیجہ میں نہ صرف وہ شخص جو کھیل کو ذریعۂ معاش بنائے ہوئے ہے بلکہ کلمہ پڑھنے والوں کے ایک بڑے طبقہ کو عین نماز جمعہ کے وقت ٹی وی اور کھیل کے میدان پر مشغول رکھتا ہے، شارجہ ٹورنامنٹ کے مناظر ایک صاحب ایمان کی غیرت ایمانی کو چیلنج دینے کے لیے کافی ہیں۔

موجودہ تہذیب وتمدن نے کھیلوں کو جو درجہ دیا ہے اس کے نتیجہ میں دورِ حاضر

کے کھیلوں کے ساتھ لوگوں کا معاملہ بھی یکسر بدل چکا ہے، ایک زمانہ تھا کہ عرب میں شعر وشاعری کا انہماک اس حد تک ہو چکا تھا کہ بعض لوگوں نے اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا، جس کے نتیجہ میں وہ افراد اپنے مقصد زندگی سے دور و بے خبر اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگے تو حضور اکرم ﷺ نے اس انہماک کو یہ فرما کر ممنوع قرار دیا کہ ﴿لأن يمتلي جوف أحدكم قيحاً خير له من أن يمتلي شعراً۔ لأن يمتلي جوف الرجل قيحاً حتى يريه خيراً من أن يمتلي شعراً﴾ (بخاری شریف ۲/۹۰۹) یعنی کسی آدمی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے اور پیپ اس کو کھا کر ختم کردے یہ اچھا ہے بنسبت اس کے کہ اس کے سینے میں شعر بھرے ہوئے ہوں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر یہ باب قائم فرما کر" باب ما يكره أن يكون الغالب على الإنسان الشعر حتى يصده عن ذكر الله والعلم والقرآن "(یہ باب اس بات کے ناجائز ہونے میں کہ آدمی پر شعر اتنا غالب آجائے کہ اس کو اللہ کی یاد اور علمی مشاغل اور قرآن سے روک دے) اس پر تنبیہ فرمائی کہ شعر کے متعلق یہ وعید اس وقت ہے جب کہ وہ انسان کے دل و دماغ پر ایسا حاوی ہو جائے کہ اس کے نتیجہ میں وہ آدمی یاد الٰہی، تحصیل علم وقرآن سے غافل ہو جائے ورنہ اسی شعر کے متعلق آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے ﴿إن من الشعر حكمة﴾ (بخاری شریف ۲/۹۰۸) (یعنی بعض اشعار حکمت والے ہوتے ہیں)۔

بعض کھیلوں کی حدیث میں جو ممانعت آئی ہے اس کی وجہ بھی شراح نے یہی بتلائی ہے کہ اسکے بعض دنیوی فوائد کے باوجود اس کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی جب اس میں لگتا ہے تو وہ کھیل آدمی کو اپنی طرف ایسا کھینچ لیتا ہے کہ بالآخر وہ شخص اسی کھیل کی نذر ہو جاتا ہے اور وہ کھیل اپنے کھیلنے والوں کے دل و دماغ پر ایسا حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ

اپنے مقاصد زندگی سے دور اور اپنے فرائض منصبی سے غافل ہو جاتے ہیں، مثلاً شطرنج کی جو ممانعت آئی ہے اسکی علت یہی بتلائی گئی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أو الإكثار من المسليات بحيث يفضى إلى إهمال المعاش و المعاد كالمزامير و الشطرنج و الصيد و اقتناء الحمام و نحوها (حجة الله البالغه ۱/۴۹) و منها الاشتغال بالمسليات وهي ما يسلى النفس عن هم آخرته و دنياه و يضيع الاوقات كالمعازف و الشطرنج و اللعب بالحمام و اللعب بتحريش البهائم و نحوها فان الانسان اذا اشتغل بهذه الأشياء لها عن طعامه و شرابه و حاجته و ربما كان حاقناً و لا يقوم للبول فان جرى الرسم بالاشتغال بها صار الناس كلاً على المدينة و لم يتوجهوا الى اصلاح نفوسهم (حجة الله البالغه ۲/۱۹۲)

تفریحات میں اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ امور معاش و آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں مثلاً مزامیر شطرنج، شکار اور کبوتر بازی وغیرہ (مترجم ۱/۱۳۱) ان میں سے ہے ایک یہ کہ بے غم کرنے والی چیزوں میں مشغول رہیں جو کہ اسے آخرت اور دنیا سے بے فکر بنا دیتی ہیں، اوقات کو ضائع کرتی ہیں مثلاً باجے، شطرنج، کبوتر بازی اور چوپایوں کو لڑانا وغیرہ، جب انسان ان چیزوں میں مشغول ہو جاتا ہے تو کھانے پینے اور ضروری کاموں سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اسے پیشاب کی حاجت ہوتی ہے مگر نہیں اٹھتا، اگر ان کاموں کی رسم چل پڑے تو یہ لوگ شہر پر بوجھ بن جائیں گے اور اصلاح نفس کی طرف توجہ بھی نہیں کریں گے۔ (مترجم ۲/۴۹۲)

حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ حضرت علامہ انور شاہؒ نے درس بخاری شریف میں نقل

فرمایا ہے: شعر، شکار اور شطرنج ایسی چیزیں ہیں کہ انسان جب ان میں مشغول ہوتا ہے تو وہ ذکر اللہ، نماز وغیرہ سے غافل ہو جاتا ہے۔

قال مولانا: ان الشعر والشطرنج والاصطیاد من اقبح الاشیاء لان الانسان یشتغل بھا فیغفل عن ذکر اللّٰہ وعن الصلاۃ (فیض الباری ٤/٣٩٧) ”حضرت مولانا (شیخ الھندؒ) نے فرمایا کہ شعر اور شطرنج اور شکار بدترین چیزیں ہیں اس لیے کہ آدمی جب ان میں مشغول ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے“۔

دورِ حاضر میں ایک تو کھیل کے معاملہ میں نظریاتی جو تبدیلی آئی ہے اس کی وجہ سے اور ساتھ ہی ساتھ عصر حاضر کے معروف کھیل (کرکٹ، فٹ بال وغیرہ) جن علاقوں میں رائج ہیں وہاں کے باشندوں کا ان میں انہاک جس نوع کا ہے اس کی بنیاد پر کہنا پڑیگا کہ یہ کھیل ان علاقوں کے لوگوں کے دل ودماغ پر ایسے حاوی ہیں کہ ان کی مشغولیت ان لوگوں کے حق میں غفلت عن ذکر اللہ اور فرائض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کا باعث ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہندوستان و پاکستان ودیگر ممالک میں کرکٹ کے ساتھ اور مغربی یوروپ میں فٹ بال کے ساتھ، بعض دیگر یوروپی ممالک میں رگبی کے ساتھ اور امریکہ میں ٹینس کے ساتھ جو تعلق ہے وہ مذکورہ بالا نوعیت سے بھی بڑھ کر ہے، جس کے نتیجہ میں صرف اتنا ہی نہیں کہ ان کی مشغولیت وقت اور مال کا ضیاع ہو بلکہ یہی تعلق بہت سی مرتبہ آپسی ٹکراؤ اور فسادات کا باعث ہوتا ہے اور قرآن پاک میں خمر ومیسر کے جو مفاسد بیان فرمائے ہیں ﴿انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر و المیسر﴾ (المائدۃ ۹۱) ”شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں دشمنی اور بیر بذریعۂ شراب اور جوئے کے“ (معارف القرآن) وہ ان کھیلوں پر صادق آتے جا رہے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ''الناهي عن الملاهي'' نامی ہے جو ''أحكام القرآن للتهانوي''(۳/۱۸۶تا۲۰۲) میں ایک جز کے طور پر شامل ہے اس میں تمام آیات قرآنیہ اور روایات حدیث وفقہ پر کلام فرماکر آخر میں جو خلاصہ اور ضابطہ تحریر فرمایا ہے وہ انہی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں:

فالضابطة في هذاالباب۔ عند مشائخنا الحنفية۔ المستفادة من أصولهم وأقوالهم المذكورة آنفا: إن اللهو المجرد الذي لا طائل تحته وليس له غرض صحيح مفيد في المعاش ولاالمعاد حرام أو مكروه تحريماً. وهذا أمر مجمع عليه في الأمة، متفق عليه بين الأئمة. وما كان فيه غرض ومصلحة دينية أو دنيوية. فإن ورد النهي عنه من الكتاب أو السنة كان حراماً أو مكروهاً تحريمياً، وألغت تلك المصلحة والغرض لمعارضتها النهي المأثورة حكماً، بأن ضرره أعظم من نفعه، وليس من الضرورات أن يكون كل غرض ونفع يكتسبه الإنسان جائزاً مباحاً. كيف؟ والشئ إذا غلب شره على خيره وضرره على نفعه عد من المضرات عند العقلاء قطعاً. وإلا فلا شئ من السموم و المهلكات لا يكون فيه نفع ما و فائدة ولكن لما غلب ضرره على نفعه عدوه من المضرات، فكذلك لما وردالشرع بالنهي عنه مع ما فيه من بعض الفوائد والمنافع علمنا أن ضرره أعظم من نفعه والغيت تلك المنافع والمصالح في جنب ما يتولد منه من المضار والمفاسد، ألا ترى فيه قوله عز وجل ﴿فيهما اثم كبير ومنافع للناس واثمهما اكبر من نفعهما﴾ فلم ينكر القرآن العزيز المنافع المودعة فيها، ولكن ورد على أسلوب الحكيم حيث وضع المنافع والمضار في ميزان الحكمة

وغلب غالبها. وهذا أيضاً متفق عليه بين الأئمة غير أنه لم يثبت بعض النهي عند بعضهم فجوزه و رخص عنه وثبت عند غيره فحرمه و كرهه، وذلك كالشطرنج فإن النهي الوارد فيه المتكلم فيه من جهة الرواية والنقل، فثبت عند الحنفية وعامة الفقهاء فكرهوه، ولم يثبت عند ابن المسيب وابن المغفل. وفي رواية: عندالشافعي أيضاً ـ فأباحوه. وأمَّا مالم يرد فيه النهي عن الشارع وفائدة ومصلحة للناس فهو بالنظر الفقهي على نوعين: الأول: ماشهدت التجربة بأن ضرره أعظم من نفعه، ومفاسده أغلب على منافعه، وأنه من اشتغل به ألهاه عن ذكر الله وحده وعن الصلوات والمساجد التحق ذلك بالمنهي عنه لاشتراك العلة فكان حراماً أو مكروهاً. والثاني: ما ليس كذلك فهو أيضاً إن اشتغل به بنية التلهي والتلاعب فهو مكروه، وإن اشتغل به لتحصيل تلك المنفعة وبنية استجلاب المصلحة فهو مباح، بل قد يرتقي إلى درجة الاستحباب أو أعظم منه. و فذلكة الكلام أن اللهو على أنواع: لهْو مجرَّد، ولهو فيه نفع وفائدة ولكن ورد الشرع بالنهي عنه، ولهو فيه فائدة ولم يرد في الشرع نهي صريح عنه ولكنه ثبت بالتجربة أنه يكون ضرره أعظم من نفعه ملتحق بالمنهي عنه، ولهو فيه فائدة ولم يرد الشرع بتحريمه ولم يغلب على نفعه ضرره، ولكن يشتغل فيه بقصد التلهي، ولهو فيه فائدة مقصودة ولم يرد الشرع بتحريمه وليس فيه مفسدة دينية واشتغل به على غرض صحيح لتحصيل الفائدة المطلوبة لا بقصد التلهي، فهذه خمسة أنواع لا جائز فيها إلا الأخير الخامس فهو أيضاً ليس من إباحة اللهو في شئ، بل إباحة ما كان لهواً صورة ثم خرج عن اللهوية

بقصد صالح و غرض صحيح فلم يبق لهواً. (أحكام القرآن للتهانوي ۳/۱۹۹ تا ۲۰۱)

ہمارے مشائخ حنفیہ کے اصول اور مذکورہ اقوال سے جو ضابطہ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے: لہوِ محض جس کا کوئی دینی یا دنیوی فائدہ اور کوئی صحیح، مفید غرض نہ ہو وہ حرام یا مکروہ تحریمی ہے اور یہ بات امت میں مجمع علیہ اور ائمہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔ اور جس میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ اور غرض ہو اگر قرآن و حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے تو وہ بھی حرام یا مکروہ ہوگا اور اس کا وہ فائدہ اور غرض شریعت میں وارد شدہ ممانعت کے مقابلہ میں کالعدم سمجھے جائیں گے بایں طور کے اس کا نقصان فائدہ سے بڑا ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ انسان جس فائدہ اور غرض کو حاصل کرنا چاہے وہ جائز و مباح ہی ہو حالانکہ کسی چیز کی برائی اس کی بھلائی پر اور اس کا نقصان اس کے فائدے پر غالب ہو تو عقلاء کے نزدیک بھی مضر ہی شمار ہوتی ہے ورنہ تو مہلک اور زہریلی اشیاء میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس میں کوئی فائدہ نہ ہو؛ لیکن جب اسکا ضرر اسکے نفع پر غالب ہے تو عقلاء نے اس کا شمار مضر اشیاء میں کرلیا، اسی طرح جب شریعت میں اس کھیل کی ممانعت وارد ہوئی تو اسکے بعض فوائد و منافع کے باوجود ہم نے اسکے ضرر کو اس کے نفع سے بڑا سمجھا اور اس سے ہونے والے نقصانات و مفاسد کے مقابلہ میں وہ فوائد و منافع کالعدم قرار دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فيهما اثم كبير و منافع للناس و اثمهما اكبر من نفعهما" "ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لوگوں کو اور انکا گناہ بہت بڑا ہے انکے فائدے سے"۔ (معارف القرآن، ج اول)

دیکھئے! قرآن کریم نے اس میں موجود منافع کی نفی نہیں کی؛ لیکن حکیمانہ انداز میں اس کے منافع اور نقصانات کو حکمت کے ترازو میں رکھ کر ان میں جو غالب تھا اس کو

غالب بتلا دیا، اور یہ بھی ائمۂ اربعہ کے درمیان متفق علیہ بات ہے۔ البتہ بعض ائمہ کے نزدیک بعض کھیلوں کی ممانعت ثابت نہیں، اس لیے انہوں نے ان کو جائز قرار دیکر اس کی اجازت دیدی اور بعض کے نزدیک ان کی ممانعت ثابت ہے اس لیے انہوں نے اس کو حرام اور مکروہ گردانا مثلاً شطرنج کہ اس کے بارے میں وارد شدہ ممانعت روایت وثبوت کے اعتبار سے مختلف فیہ ہے، چنانچہ حنفیہ اور عام فقہاء کے نزدیک وہ ثابت ہے؛ اس لیے انہوں نے اسکو مکروہ کہا اور سعید بن مسیّب اور ابن مغفل کے نزدیک اور امام شافعیؒ کی ایک روایت کے مطابق وہ ممانعت ثابت نہیں اسلیے انہوں نے اسکو جائز قرار دیا البتہ صاحب شریعت کی طرف سے جن کے متعلق صراحتاً ممانعت نہیں آئی اور اسمیں لوگوں کا فائدہ اور مصلحت ہے تو فقہی اصول کے اعتبار سے اسکی دو قسمیں ہیں:

(پہلی) تجربہ جس کے متعلق شہادت دیتا ہو کہ اس کا نقصان اسکے نفع سے بڑا اور اسکے مفاسد اسکے منافع پر غالب ہیں اور جو آدمی اسمیں مشغول ہوتا ہے اسکو وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر کے نماز ومساجد سے روکتا ہے وہ بھی اشتراک علت کے پیش نظر ممنوع کے ساتھ ملحق قرار دے کر حرام ومکروہ ہوگا۔ اور (دوسری) قسم وہ ہے جسمیں یہ بات نہ ہو اسمیں بھی اگر لہو ولعب کی غرض سے مشغول ہوتا ہے تو وہ بھی مکروہ ہے، اور اگر اس میں اس منفعت کی تحصیل کے لیے اور فوائد کے حصول کی غرض سے مشغول ہوتا ہے تو وہ جائز ومباح ہے؛ بلکہ کبھی استحباب یا اسکے اوپر کے درجہ تک پہنچ سکتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کھیل کی چند اقسام ہیں: (۱) لہو محض۔ (۲) وہ کھیل جسمیں فائدہ بھی ہے نقصان بھی؛ لیکن شریعت میں اسکی ممانعت آئی ہے۔ (۳) وہ کھیل جس میں فائدہ تو ہے اور شریعت میں اسکی صریح ممانعت بھی نہیں آئی؛ لیکن تجربہ سے اسکا ضرر اسکے

نفع سے زیادہ ہونا ثابت ہو چکا ہو وہ بھی ممنوع کے حکم میں ہے۔(۴) ایسے کھیل جن میں فائدہ ہے اور شریعت میں اسکی صریح ممانعت بھی نہیں آئی اور اسکا ضرر بھی اسکے نفع سے زیادہ نہیں؛ لیکن ان میں محض بنیت لہو مشغول ہوتا ہے۔(۵) ایسے کھیل جن میں منفعت مقصودہ ہے اور شریعت میں اسکی صریح ممانعت بھی نہیں آئی اور انمیں کوئی دینی نقصان بھی نہیں ہے اور انمیں مطلوبہ فائدہ حاصل کرنے کی غرض صحیح سے مشغول ہوتا ہے، بغرض لہو نہیں۔ان پنجگانہ اقسام میں سے آخری پانچویں قسم کے علاوہ کوئی جائز نہیں ہے وہ بھی لہو کے جواز کی قبیل سے نہیں ہے بلکہ ایسی چیز مباح کی جارہی ہے جو صورۃً لہو ہے؛ لیکن نیت صالحہ اور غرض صحیح کی وجہ سے وہ لہو نہیں رہا۔(احکام القران)

آپ کے قائم فرمودہ اکثر سوالات (۱۔۲۔۴۔۵۔۶) کے جوابات عبارات بالا میں آگئے ہیں، اب یہ سوال کہ اسکو کسب معاش کا ذریعہ بنانا، تو ظاہر ہے کہ کھیل کر تو آدمی پیٹ بھر نہیں سکتا۔اس میں اجارہ ہی کرنا ہوگا، اب وہ کس بات پر اجارہ منعقد کریگا۔معقود علیہ مجہول ہے، اس لیے کہ کھلاڑی کے عمل کو ضبط کرنا مشکل ہے وقت کی تعیین بھی دشوار ہے اس لیے کہ کبھی مقررہ وقت سے پہلے ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔نیز فقہاء نے تصریح فرمائی ہے "ولا لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی" (درمختار) (اور گناہ کے کاموں کے لیے اجارہ درست نہیں ہے مثلاً گانا، نوحہ کرنا اور کھیل) اور اگر مقصود تماشائیوں کی تفریح ہے تو یہ غیر مقدور التسلیم ہے "کما عللوا فی عسب التیس" (شامی ۵/۳۸) (گابھن کرانے کی اجرت کے ممنوع ہونے کی جو علت بتلائی گئی ہے)؛ اس لیے اس کو کسب معاش کا ذریعہ قرار دینا شرعاً درست نہیں ہے، خصوصاً جبکہ اسکی بنیاد دورِ حاضر کا وہ نظریہ ہو جو شروع جواب میں گزر چکا ہے۔

آپ نے آخری سوال میں جو دریافت فرمایا ہے اس کی حیثیت بھی اب صاف ہوچکی جبکہ خود کھیل کے سلسلہ میں حکم معلوم ہو چکا، خود میدان میں جا کر اس کو دیکھنا تو آج کل وہاں جو خرافات ہوتے ہیں سب کو معلوم ہیں۔ نیز جن صورتوں میں وہ کھیل ممنوع ہوگا اس کا دیکھنا بھی ناجائز ہوگا، اور کھیل کی آخری صورت جو جائز ہے کون اس کو دیکھنے جاتا ہے؟ جب میدان پر تماشہ بینی کا یہ حکم ہے تو ٹی وی پر بطریقۂ اولی ممنوع ہے اسی وقت وہ شائع ہورہا ہو تب بھی وہ تصویر ہی کا حکم رکھتا ہے اس لیے اس میں قباحت بڑھ جاتی ہے کومینٹری میں بھی ضیاع وقت کے ساتھ دور حاضر کے نظریۂ کھیل کی حوصلہ افزائی کے سوا کچھ نہیں اس لیے وہ بھی ممنوع ہی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ

الجواب صحیح:

ماشاء اللہ! بہت عمدہ اور قابل عمل جواب ہے اس کی خوب اشاعت کی جائے، احقر کا بھی اس کے متعلق ایک جواب فتاوی رحیمیہ ہفتم ص ۲۷۵ تا ۲۸۰ پر موجود ہے. مناسب معلوم ہو تو اسے بھی شامل فرمالیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

احقر الانام سید عبد الرحیم لاجپوری غفرلہ، ۲۳/ ذی قعدۃ الحرام ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

فتوی حضرت مفتی سید عبد الرحیم لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ (صاحب فتاوی رحیمیہ)

سوال: ایک امام صاحب کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق ہے اور کافی انہماک رکھتے ہیں۔ میچ کی کومینٹری بڑے شوق سے سنتے ہیں ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ بحوالۂ کتب جواب عنایت فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

درمختار میں ہے"(و) کرہ (کل لھو) لقوله علیه السلام کل لهو المسلم حرا م إلا ثلاثة ملاعبته أهله و تأديبه لفرسه و مناضلته بقوسه" (درمختار) ہر کھیل مکروہ ہے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ مسلمان کا ہر کھیل حرام ہے سوائے تین کے، آدمی کا اپنے اہل سے کھیلنا اور گھوڑے کو سدھانا اور تیر اندازی کرنا۔

شامی میں ہے:(وقوله و كره كل لهو)أي كل لعب وعبث إلى قوله والتصفيق وضرب الأوتار......فإنها كلهامكروهةلأنها زَي الكفار" (درمختارو شامی ۳۴۷/۵، ۳۴۸ کتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع) (یعنی لہو سے مراد ہر کھیل اور عبث کام ہیں)

شامی میں ایک اور جگہ ہے: وفي القهستاني عن الملتقط من لعب بالصولجان يريد الفروسية يجوزوعن الجواهر قد جاء الأثر في رخصة المصارعة لتحصيل القدرةعلى المقاتلة دون التلهي فإنه مكروه(شامی ۳۵۵/۵ کتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع)

قہستانی میں ملتقط کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جو آدمی صولجان سے اس لیے کھیلتا ہے کہ اس کے ذریعہ ہی گھوڑے سواری میں مہارت حاصل ہو تو جائز ہے اور الجواہر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حدیث میں اکھاڑے کی اجازت آئی ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے دشمنوں کے مقابلہ پر قدرت حاصل کی جائے البتہ محض لہو کے طور پر ہو تو مکروہ ہے۔

"ہدایہ اخیرین" میں ہے:ويكره اللعب بالشطرنج والنرد والأربعة عشر وكل لهو لأنه إن قامر بها فالميسر حرام بالنص وهو اسم لكل قمار وإن لم يقامر بها فهوعبث ولهو وقال عليه الصلاة والسلام لهو المؤمن باطل إلا الثلاث

تـأديـه لفرسه ومناضلته عن قوسه وملاعبته مع أهله...ثم إن قامر به (أي بالشطرنج) تسقط عدالته وإن لم يقامر لاتسقط لأنه متأول فيه(ھدایہ اخیرین ص ٤٥٩)

شطرنج اور نرد اور چوسر اور ہر لہو کے ذریعہ کھیلنا مکروہ ہے اس لیے کہ اس میں بازی لگاتا ہے تو میسر حرام ہے اور میسر ہر قسم کے جوئے کو کہتے ہیں اور اگر بازی نہیں لگاتا ہے تو یہ عبث اور لغو ہے اور حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ مومن کا ہر کھیل لغو اور باطل ہے سوائے تین باتوں کے، اس کا اپنے گھوڑے کو سدھانا، تیر اندازی اور اپنے اہل کے ساتھ دل لگی کرنا۔

خلاصۂ تفاسیر میں ہے: کھیل سے اگر وہ سب امور مراد لیے جائیں جو محض دل خوش کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور ان میں کوئی دینی یا دنیوی نفع نہیں تو حرام باعتبار اضاعت وقت کے ہے اور یہ حرام بجائے ترک اولی کے ہے اور اگر وہ کھیل مراد لیے جائیں جن میں جوا یا کسی اور قسم کی شرعی ممانعت ہو یا ایسی محویت غالب ہو کہ آدمی تدبیر معاش وفکر سے بے پرواہ یا معطل رہے جس طرح کنکوہ یا کبوتر وغیرہ میں آدمی محو اور خود فراموش ہو جاتا ہے تو ان کے حرام یا مکروہ ہونے میں کچھ تردد نہیں (خلاصۂ تفاسیر ا/۱۵۶،۱۵۷)

نیز فرماتے ہیں: ہر ایسا کھیل جس میں ہار جیت ہو قمار میں داخل ہے اور نص قرآن سے حرام ہے۔ (خلاصۂ تفاسیر ا/۱۵۶ اتحت آية يسئلونك عن الخمر والميسر پارہ ۲/)

مذکورہ حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ:

(۱) ایسے کھیل جس میں قمار جوا کی صورت ہو وہ بالکل حرام ہے، جیسا کہ ہدایہ اخیرین اور خلاصۃ التفاسیر کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

(۲) ایسا کھیل جس میں کوئی دینی، دنیوی نفع نہیں ہے وہ بھی اس وجہ سے ناجائز ہے کہ اس میں قیمتی وقت کو ضائع کرنا ہے جیسا کہ خلاصۃ التفاسیر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

(۳) اور ایسا کھیل جس میں قمار نہ ہو اور اس میں دینی یا دنیوی نفع ہو اس کی گنجائش ہے جیسا کہ قہستانی کی عبارت سے جسے شامی نے نقل کیا ہے مفہوم ہوتا ہے؛ لیکن یہ گنجائش اس شرط کے ساتھ ہے کہ اس میں کوئی ناجائز اور خلاف شرع عمل نہ ہو، چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں:

(ب) جس کھیل سے دینی یا دنیوی کوئی فائدہ معتد بہا مقصود ہو وہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی امر خلاف شرع ملا ہوا نہ ہو اور منجملہ امور خلاف شرع کے تشبہ بالکفار بھی ہے۔

(ج) جس کھیل سے کوئی فائدہ دینی یا دنیوی مقصود ہو؛ لیکن اس میں کوئی ناجائز اور خلاف شرع امر مل جائے تو وہ بھی ناجائز ہوتا ہے جیسے تیراندازی، گھوڑ دوڑ وغیرہ جبکہ اس میں قمار کی صورت پیدا ہو جائے، دونوں طرف سے کچھ مال کی شرط لگائی جائے تو وہ بھی ناجائز ہو جاتی ہے (فتاوی دارالعلوم قدیم ج ۷، ۸ ص ۲۸۵، امداد المفتیین)

موجودہ زمانہ میں کرکٹ ایک ایسا کھیل بن گیا ہے کہ عموماً اس میں خلاف شرع امور پائے جاتے ہیں، نمازوں کا قضا کر دینا، اس پر ہار جیت اور قمار کھیلنا، فجار، فساق اور غافل قسم کے لوگوں کا اسے اختیار کرنا۔ غفلت کی حد یہ ہو چکی ہے کہ دن تو دن، اب تو راتوں میں بھی اس میں انہماک رہتا ہے۔ کرکٹ کے وقت نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کا میدان میں جمع ہونا اور نہ معلوم کون کون سی اخلاقی اور شرعی خرابیاں اس میں آ چکی ہیں، اور تجربہ ہے کہ جس قدر اس کا شوق اور انہماک بڑھتا ہے غفلت میں اسی قدر اضافہ ہوتا رہتا ہے، رات دن بس اسی کی فکر سوار رہتی ہے حتی کہ مسجد میں آنے کے بعد وضو کرتے ہوئے وضو سے فارغ ہو کر اور بہت سے شوقین تو جماعت خانہ میں بھی اسی کے چرچے میں

مشغول رہتے ہیں، حد یہ ہے کہ اگر کسی موقع میں رمضان المبارک میں تراویح کے وقت میچ کی کومینٹری آرہی ہو تو اس کے بہت سے شوقین تو اس پر تراویح قربان کردیتے ہیں، اور جو شوقین مسجد میں آئے ہیں ان کی توجہ اور دھیان بس اسی طرف، ترویحہ میں تسبیح پڑھنے کے بجائے یہی فکر سوار رہتی ہے کہ میچ کا حال معلوم کیا جائے، ہار جیت پر پٹاخے پھوڑے جاتے ہیں جس میں غیر قوم سے مشابہت کے ساتھ ساتھ اضاعت مال بھی ہے اور بسا اوقات یہ حرکت قومی فساد کا سبب بن جاتی ہے، اور مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان بھی ہوتا ہے۔ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے ایسے کھیل کو اب کس طرح جائز کہا جاسکتا ہے؟

چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں: آج کل چونکہ عموماً یہ شرائط (جس کا بیان فتاوی دارالعلوم کے حوالہ سے مذکور ہوا) موجودہ کھیلوں (ٹینس، فٹ بال، کرکٹ) میں موجود نہیں ہیں اس لیے ناجائز کہا جاتا ہے۔ (فتاوی دارالعلوم قدیم ۷، ۲۸۵/۸ امداد المفتیین)

لہذا ایسا شخص جو امامت کے عظیم منصب پر فائز ہو اس کو اس قسم کے بدنام اور بے کار لغو کھیل میں مشغول ہونا، اس سے دل چسپی رکھنا، کومینٹری سننا، قطعاً اس کے شایان شان نہیں، غافلوں کے ساتھ تشبہ بھی لازم آتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں امام کا وقار بھی کم ہوجاتا ہے۔اور اگر ورزش اور بدن کی تقویت مقصود ہو تو دوسرے جائز طریقے اختیار کیے جائیں، اگر کوئی شخص کرکٹ میں اس قدر منہمک رہتا ہو کہ نماز قضا ہوجائے اور جماعت فوت ہوتی ہو تو پھر ایسا کھیل بالکل ناجائز اور موجب فسق ہوگا اور ایسے شخص کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہوگا۔

کبیری میں ہے: "وفيه إشارة الى أنهم لو قدموا فاسقاً يأثمون بناءً على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم" (كبيرى ص ٤٧٩ فصل في الإمامة) **وقت خدا تعالی کی بہت**

بڑی نعمت ہے اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے ایسے بے کار اور لغو کھیل میں مشغول ہونے یا کومینٹری سننے سے آخرت کا کونسا فائدہ ہوگا؟ بلکہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔اللہ کے ذکر سے غافل کرنے والی چیز ہے اور جو چیز انسان کو اللہ سے اور اس کے مقصد حیات سے غافل کردے وہ منحوس اور بے کار ہے۔حدیث میں ہے:”من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه“ (ترجمہ) انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس بات کو چھوڑ دے جس سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہ ہو (ترمذي شريف ج۲/۵۵باب ماجاء من تكلم بالكلمة ليضحك الناس) قیامت کے روز عمر اور خاص کر اپنی جوانی کے زمانہ کا جواب دینا ہوگا، کہ اسے کن کاموں میں خرچ کیا۔

حدیث میں ہے:”عن ابن مسعود رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تزول قدما ابن آدم يوم القيمة من عند ربه حتى يسأل عن خمس،عن عمره فيما افناه، وعن شبابه فيما ابلاه،و عن ماله من اين اكتسبه و فيما انفقه و ما ذا عمل فيما علم“

(ترجمہ)”حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کے دونوں قدم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس سے نہیں ہٹ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہ ہو:(۱) اس کی عمر کے متعلق کہ کن کاموں میں اسے ختم کی (۲) اسکی جوانی کے متعلق کہ کن مشغلوں میں اسے خرچ کی (۳) اس کے مال کے متعلق کہ کہاں سے مال حاصل کیا (۴) اور کن کاموں میں مال خرچ کیا (۵) اور اپنے علم پر کتنا عمل کیا۔(ترمذی شریف۲/۶۴،باب ماجاء في شأن الحساب والقصاص)

لہذا جو وقت ملا ہے اسے بہت بڑا قیمتی سرمایہ سمجھے اور بڑی ذمہ داری اور فکر کے ساتھ موت اور آخرت کی تیاری میں خرچ کرے، بے کار اور لغو کاموں میں ضائع نہ کرے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے:

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است　　　جز سرِ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

یادِ الٰہی کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونا عمر ضائع کرنا ہے، عشقِ الٰہی کے سوا جو کچھ کیا جائے بے کار ہے۔ فقط و اللہ اعلم بالصواب۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۷/ ۲۷۵ تا ۲۸۰)

ویڈیو گیم کے کلب قائم کرنا جائز نہیں

سوال: ویڈیو گیم جس میں پیسے ڈال کر وہ گیم کھیلا جاتا ہے، اس کی نوعیت یہ ہے کہ اس ویڈیو گیم میں سامنے ٹی وی رہتی ہے اور اس کے سامنے ایک اسکوٹر نما آلہ رہتا ہے جس پر بیٹھ کر وہ گیم کھیلا جاتا ہے اور جس طرح اسکوٹر کی تیزی بڑھائی جاتی ہے یا کم کی جاتی ہے بعینہ اس میں وہ ساری چیزیں ہوتی ہیں پھر وہ اسکوٹر پر بیٹھ کر پیسے ڈالتے ہیں، پیسے ڈالنے کے بعد اس ٹی وی میں تصویریں آتی ہیں گاڑیوں کی، پھر کھیلنے والا جتنی تیزی سے بچا کر گاڑی کو چلائیگا اتنے زیادہ اسے نمبرات ملتے ہیں۔ پس یہ کھیل کھیلنا یا اس کے کلب قائم کرنا بطور تجارت، شریعت کے نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ نے سوال میں پوری تفصیل تحریر نہیں فرمائی بلکہ صرف آخر میں اتنا کہہ دیا ہے کہ ”اتنے زیادہ اسے نمبرات ملتے ہیں“ اس کے بعد کیا ہوتا ہے وہ نہیں بتلایا، اگر ان نمبرات کی بنیاد پر رقم بھی ملتی ہے تو یہ قمار کی صورت ہے جو حرام ہے، اور اگر رقم نہیں ملتی تو صرف ایک کھیل ہے؛ لیکن ایسا کھیل ہے جو ان کھیلوں کے معیار پر پورا نہیں اترتا جس کی شریعت نے اجازت دی ہے اس لیے یہ بھی ناجائز ہے، اس کے کلب قائم کرکے اس کو ذریعۂ معاش بنانا بھی جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

فارمی مرغیوں کی خوراک و گوشت اور مغربی ممالک کی تیار غذا کا حکم

سوال: ہمارے یہاں ملک ملاوی میں آخری تین سالوں سے ایک تنظیم گوشت اور مرغیوں کی نگرانی کا کام کررہی ہے تاکہ عوام کو حلال گوشت اور مرغیاں مہیا ہوسکیں، ادھر چند سوالات اسی سے متعلق درپیش ہیں مہربانی فرما کر ہماری رہنمائی فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً

(۱) فارم کی مرغیاں یا فارم کی وہ گائیں جو خاص طور سے گوشت کے لیے تیار کی جاتی ہیں اگر ان کی غذا دم مسفوح سے تیار کی گئی ہو یا کسی مرے ہوئے گائے بکرے کے گوشت کا قیمہ اسی فارم کے جانوروں کے لیے بطور غذا کے استعمال کیا جائے تو اس کا کھانا شرعاً جائز ہے؟

(۲) سور (خنزیر) کا گوشت یا اس کا خون اسی مذکورہ طریقے پر دوسرے فارم کے حلال جانوروں کو بطور غذا یومیہ دیا جائے، پھر انہی حلال جانوروں کو شرعی طریقہ پر ذبح کیا جائے تو کیا اس کا کھانا مسلمان کے لیے جائز ہے؟

(۳) مغربی ممالک سے آنے والی فارم کے جانوروں کی تیار غذا کا کیا حکم ہے؟

مہربانی فرما کر مع ادلۂ شرعیہ کے اس کے حکم سے نوازیں تاکہ خود بھی مطمئن ہوں اور دوسروں کو بھی قابل اطمینان جواب دے سکیں نیز کتب فقہ میں جلالہ کا جو لفظ ہے اس کی بھی تشریح فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: ایسی غذا کی خرید و فروخت اور مرغیوں کو کھلانا جائز نہیں، البتہ ایسی مرغیاں حلال ہیں، گوشت کی حرمت کے لیے شرط یہ ہے کہ نجس غذا کی وجہ سے گوشت میں

بدبو پیدا ہوجائے جس کا مفقود ہونا یہاں مشاہد ہے۔

قال العلامة ابن عابدين تحت (قوله وكره لحم الجلالة التي تأكل العذرة): اي فقط حتى أنتن لحمها، قال في شرح الوهبانية: وفي المنتقى: الجلالة المكروهة التي اذا قربت وجدت منها رائحة فلا تؤكل ولا يشرب لبنها ولا يعمل عليها وتلك حالها ويكره بيعها و هبتها وتلك حالها وذكر البقالي أن عرقها نجس .اه. وقدمنا في الذبائح(رد المحتار ٥/٢١٦) وقال العلامة الحصكفي رحمه اللّٰه تعالى وتحبس الجلالة حتى يذهب نتن لحمها وقدر ثلاثة أيام لدجاجة، وأربعة لشاة، وعشرة لابل وبقر على الاظهر. ولو اكلت النجاسة وغيرها بحيث لم ينتن لحمها حلت كما حل أكل جدي غذي بلبن خنزير لأن لحمه لا يتغير وماغذي به يسير مستهلكاً لا يبقى له الأثر، وقال العلامة ابن عابدينؒ: (قوله حلت) وعن هذا قالوا لا بأس بأكل الدجاج لأنه يخلط ولا يتغير لحمه وروي أنه عليه الصلاة والسلام كان يأكل الدجاجة وما روي أن الدجاجة تحبس ثلاثة أيام ثم تذبح فذلك على سبيل التنزه. زيلعي. (ردالمحتار ۵/۲۱۷)(احسن الفتاوی ۸/۱۲۶)

(۲) حوالۂ بالا میں مذکورہ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سور کا گوشت یا خون بھی بطور غذا دیا گیا ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

(۳) مغربی ممالک سے آنے والی تیار غذا میں اگر دم مسفوح یا مردار اور سور کے گوشت کی ملاوٹ ہے تو اس کا خریدنا اور جانوروں کو کھلانا جائز نہیں ہے۔

جلاّلہ: یہ لفظ الجلّۃ سے ماخوذ ہے، الجلّۃ مینگنی اور لید کو کہتے ہیں المعجم الوسیط میں ہے (الجلة: البعر و الروث) (ص۱۳۱) جو جانور مینگنی اور پلیدی کھاتا ہو اس کو عربی زبان

میں جلاّلہ کہتے ہیں۔(الجلاّلة) من الماشية: التي تأكل الجلة و العذرة (ص۱۳۱)
قواعد الفقہ میں ہے: الجلاّلة: هي التي تأكل العذرة و لا تأكل غيرها حتى انتن لحمها. (ص۲۵۰)(یعنی وہ جانور جو پلیدی ہی کھاتا ہو دوسری چیز نہ کھاتا ہو یہاں تک کہ اس کے گوشت میں بد بو پیدا ہو جائے) خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء کے یہاں جلاّلہ کے گوشت میں کراہت (تحریمی) کی علت صرف نجاست کھانا نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے اتنا تغیر پیدا ہو جائے کہ بد بو آنے لگے اسی لیے جو جانور نجاست کے ساتھ دوسری غذا بھی کھاتا ہے تو اس میں چونکہ بد بو پیدا نہیں ہوتی اس لیے اس کا کھانا مکروہ نہیں ہے۔

بدائع میں ہے:أن الكراهة في الجلاّلة لمكان التغير و النتن لا لتناول النجاسة ولهذا اذا خلطت لا يكره وان وجد تناول النجاسه لأنها لا تنتن فدل أن العبرة للنتن لا لتناول النجاسة. (۵/۴۰)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفي عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۹/ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ

عصری تعلیمی ادارے، تصاویر وغیرہ کا شرعی حکم (اسکول سے متعلق ۲۱ سوالات)

سوال: (الف) موجودہ دور میں دنیا تحقیق و تفتیش وانکشافات کے میدان میں جس قدر آگے بڑھ رہی ہے وہ یقیناً آپ سے پوشیدہ نہیں ہوگا نت نئی ایجادات اور سائنسی تحقیقات کے ذریعہ سفر و حضر سے لیکر علاج و معالجہ ارضیات اور فلکیات تک کے لیے بیشمار ایسی اشیاء سامنے آئی ہیں جن سے بلا تفریق مذہب وملت مخلوق خدا فائدہ اٹھا رہی ہے، بیشک کہیں کہیں ان ایجادات کا غلط استعمال بھی ہو رہا ہے بلکہ بعض آلات کا استعمال زیادہ تر غلط ہی ہو رہا ہے تاہم ان کے صحیح استعمال سے جو فوائد حاصل ہو رہے ہیں یا ہو سکتے

ہیں ان کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، ان تمام ایجادات وتحقیقات، تفتیشات کے لیے چھوٹی عمر ہی سے بچوں کو کام میں لگا دیا جاتا ہے، جگہ جگہ ایسی اسکول، انسٹی ٹیوٹ اور ریسرچ سینٹرس قائم ہیں جہاں بچے اس طرح کے علوم حاصل کرتے ہیں۔عموما اس طرح کے ادارے غیر مسلم حضرات یا برائے نام مسلم یا گمراہ نظریہ والے نام نہاد مسلمان حضرات قائم کرتے ہیں۔ جہاں اسلامی تعلیمات اور تشخص کا کوئی خاطر خواہ خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ بعض جگہ پر تو اسلام مخالف ماحول بھی ہوتا ہے، اس کے علاوہ بچے بچیوں کی مخلوط تعلیم آگے چل کر اکثر انہیں بے راہ روی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ان حالات میں صحیح العقیدہ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بھی ایسے ادارے قائم کریں جہاں صحیح اسلامی تعلیمات اور ملی شناخت کے تحفظ کے ساتھ جدید علوم وفنون بھی سکھلائے جائیں، اگر ایسا نہ کیا گیا تو آج کے یہ مسلمان بچے کل زمانے سے بہت پیچھے رہ کر اقوام عالم کے مقتدا بننے کے بجائے انکے مقتدی بن جائیں گے، یا پھر اغیار کے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کیوجہ سے اسلامی تعلیمات اور تشخص سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

اسی کے پیش نظر کچھ مقتدر حضرات نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا ہے جہاں ڈھائی سال کی عمر سے ہی بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے، ان بچوں کے لیے جدید تعلیم، انگریزی اور سائنس کے ساتھ قران مجید نہایت صحت اور تجوید کے ساتھ حفظ، احادیث مبارکہ، روزمرہ کی دعائیں، سنن ومستحبات کی عملی مشق اور دین کے ضروری مسائل پر مشتمل ایک ایسا نصاب ترتیب دیا گیا ہے جس سے مسلمان بچے جدید عصری علوم وفنون میں اتنے ہی ماہر ہوسکیں، جتنے غیروں کے اداروں سے نکلنے والے ہوتے ہیں ساتھ ہی انکو دینی علوم کی وافر معلومات ہو وہ اسلامی تاریخ اور اسلاف کے کارناموں سے بھی واقف ہوں نیز ائمۂ مجتہدین

کے مسلک پر کار بند رہتے ہوئے پورے دینی تشخص اور ملی شناخت کے ساتھ دوسروں تک صحیح اسلامی تعلیمات پہنچا کر اپنی دعوتی ذمہ داریاں بھی پوری کرسکیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے ادارے کا قیام اور مذکورہ بالا طرز تعلیم کا شرع متین کی روشنی میں کیا حکم ہوگا؟

(ب) عموماً جدید علوم وفنون کی تعلیم جس انداز میں دی جاتی ہے شریعت کی روشنی میں اسکے کچھ مسائل قابل دریافت ہیں

(۱) شریعت میں جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے مگر ہاتھوں سے بنائی ہوئی تصویریں اور جدید کیمروں کے ذریعہ عکس سازی کا ایک ہی حکم ہوگا یا الگ الگ؟

(۲) ضرورت شرعی کا معیار کیا ہے؟ نیز تصویر جو حرام ہے تو اسکی حرمت کس درجہ کی ہے؟ کیا شراب نوشی کی حرمت اور جاندار کی تصویر کی حرمت کا ایک ہی درجہ ہے؟ شریعت کا جو بھی حکم ہو برائے کرم مدلل بیان فرمائیں۔

(۳) حج کے لیے تصویر کو حکومت کے قانون کی وجہ سے ضرورت شرعی قرار دیکر روا رکھا گیا ہے تو کیا بیرون ملک سفر کے لیے حکومت کی طرف سے اگر شراب یا الکحل پینا کسی سائنسی توجیہ کا سہارا لیکر ضروری قرار دیا جائے مثلاً آج کل سفر کے لیے ٹیکے لگانا ضروری ہے انکو ختم کر کے اس قسم کی کوئی دوا شراب میں ملا کر پینا ضروری قرار دیا جائے تو کیا وہ شراب نوشی روا ہو جائیگی؟

(۴) اسی کے ساتھ قابل توجہ امر یہ بھی ہے کہ فرض حج کے لیے تصویر ضرورتاً روا ہے مگر نفلی حج وعمرہ یا بلا ضرورت صرف تفریح کے لیے بیرونی سفر کس طرح ضرورت شرعی ہوگا؟

(۵) چھوٹے چھوٹے کمسن بچوں کی تعلیم کے لیے جاندار کی تصویروں کا استعمال کیسا ہے؟ واضح رہے کہ بچوں کو جدید عصری علوم میں ماہر بنانے کے لیے پچھلی تحقیقات

کے ساتھ ساتھ ساری دنیا سے متعلق عام معلومات حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے مثلاً جدید تحقیقات کے ذریعہ یہ بتایا جاتا ہے کہ عہد قدیم میں انتہائی بڑے اور جسیم جاندار ہوتے تھے جن کے باقیات بعض علاقوں میں دستیاب ہوئے ہیں ان باقیات کی بنیاد پر ان جانوروں کی شکلیں بنائی گئی ہیں بچوں کو زبانی طور پر ان جانوروں کی مکمل شناخت کرانا ناممکن ہے ان کی پوری ہیئت سمجھانے کے لیے تصویریں ضروری ہیں، اسی طرح دنیا کے مختلف علاقوں میں الگ الگ قسم کی جان دار مچھلیاں اور حشرات الارض پائے جاتے ہیں، جن کے ذریعہ بہت سی نئی تحقیقات میں مدد ملی ہے، اب ہندوستانی بچوں کو ان جانوروں کی شناخت کیسے کرائی جائیگی جبکہ وہ جانور یہاں پائے ہی نہیں جاتے، قطب شمالی یا جنوبی میں جو برفانی جانور ہیں اس علاقہ کے عجیب الخلقت سمندری جانور یا ایسی مچھلیاں جن سے روشنی نکلتی ہے، اسی طرح بعض ایسے بھی حشرات الارض ہیں جو قابل ذکر خصوصیات و عادات رکھتے ہیں وہ کیسے سمجھائے جائیں گے، اگر بچوں کو یہ سب نہیں بتایا جاتا تو معلومات عامہ سے ہمارے بچے دوسروں سے پیچھے رہ جائیں گے نیز معلومات عامہ کی بنیاد پر آئندہ جو علوم سکھائے جائیں گے وہ حاصل نہیں ہوسکیں گے۔

(۶) ضرورت کی بنیاد پر بعض جگہ پر تصویروں کو روا رکھا گیا ہے مثلاً شناختی کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ؛ بچوں کی تعلیم بھی ضرورت شرعیہ میں داخل ہے یا نہیں؟

(۷) بچوں کو یونیفارم کے طور پر پتلون اور شرٹ پہنائی جائے تو یہ جائز ہوگا یا نہیں جبکہ پتلون ٹخنوں سے اوپر ہو، واضح رہے کہ ہمارے شہر بمبئی میں پتلون کا استعمال عام ہے یہ کسی قوم یا مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے؟

(۸) بچوں کے کھیلنے کی گڑیا کا کیا حکم ہے جبکہ اس کی آنکھ، ناک، کان واضح ہوں

تعلیم کے لیے ان کا استعمال کیسا ہے؟

(۹) بچوں کو پڑھانے کے لیے اگر تختہ سیاہ پر جاندار کی تصویر بنانی پڑے تو اس کی اجازت کی کیا شکل ہے جبکہ یہ ضروری ہے؟

(۱۰) بہت سے غیر مسلموں نیز فاسد العقیدہ افراد نے جدید عصری تعلیمی ادارے قائم کر رکھے ہیں وہ لوگ اپنے اداروں کا اشتہار کرتے ہیں کتابچے اور پمفلیٹ چھاپتے ہیں جن میں تصویروں کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے بچے دکھائے جاتے ہیں، تیراکی ونشانہ بازی اور قطاروں میں کھڑے ہو کر ورزش کرتے ہوئے بچوں کی تصویریں ہوتی ہیں، اس طرح کے اشتہارات سے عامۃ المسلمین انتہائی متأثر ہوتے ہیں، اور ایسے اداروں کی دل کھول کر مالی امداد کرتے ہیں ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو بھی وہیں داخل کرا کے ان کو غیر اسلامی بلکہ اسلام دشمن ماحول کے حوالہ کر دیتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر اسلامی تعلیمات اور ملی تشخص کی مکمل رعایت کے ساتھ اس طرح کے تمام علوم وفنون سکھانے والا کوئی مسلم ادارہ ایسے باتصویر اشتہارات شائع کرا کے عامۃ المسلمین کے سامنے ایک صحیح متبادل اس نیت سے پیش کرے کہ مسلم بچے غیر اسلامی ماحول میں جانے کے بجائے صحیح اسلامی ماحول میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم بھی حاصل کر سکیں۔ واضح رہے کہ عوام وخواص کا تعاون حاصل کرنے کے لیے بھی آج کل ایسے باتصویر تعارفی لٹریچر یا پراجیکٹ رپورٹ انتہائی ضروری ہیں۔ تو ایسے اشتہارات شرعی ضرورت میں داخل ہوں گے یا نہیں؟

(۱۱) بعض تفریحی جگہوں پر بتوں کی تصویریں ہوتی ہیں اور کہیں کہیں پر تو برہنہ تصویریں بھی ہوتی ہیں اگر وہاں بچوں کو ان کا مشاہدہ کرا کر ان کی عبادت کرنے کو گناہ اور

عبادت کے باطل ہونے کی تصریح کی جائے تو کیا یہ درست ہوگا؟

(۱۲) دینی اور عصری تعلیم ایک ساتھ ہونے سے بچوں پر یقیناً بوجھ پڑتا ہے اس لیے ایسے طریقے استعمال کرنا ضروری ہے جن سے بچوں پر کم سے کم بوجھ ہو اور ان کا بچپن کتابوں میں کھو نہ جائے، اور یہ تجربہ ہے کہ تصویروں اور کمپیوٹر کے ذریعہ تعلیم دینا نسبتاً قدیم مروجہ طریقہ سے بہت آسان ہے لہذا ان تصویروں کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ تعلیمی و دیگر جائز ضروریات کے لیے ان آلات کا استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۱۳) اسکول میں بچے اور بچیاں دو سال کی عمر سے ہی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیتی ہیں، شروع ہی سے لڑکوں کو ٹوپی اور لڑکیوں کو اسکارف پہنایا جاتا ہے، اور اس کی ترغیب بھی دی جاتی ہے؛ البتہ زور وزبردستی سے بچے چڑ چڑے ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے ان پر سختی نہیں کی جاتی دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان کو کس عمر سے سر ڈھانکنا ضروری ہے؟

(۱۴) اسکول میں انگلش پڑھانے کے لیے مستورات ہوتی ہیں جو بچوں کو تعلیم دیتی ہیں، اور ضرورتاً ان سے شرعی پردہ کے ساتھ بات کی جاتی ہے جبکہ وہ پسِ پردہ ہوتی ہیں اور ان کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے مرد حضرات گفتگو کرنے کے لیے آئیں تو ان سے سلام کرنا کیسا ہے؟ واضح رہے کہ ان سے بات کرنے کے لیے یہ احتیاط رکھی جاتی ہے کوئی ایک مرد بات نہیں کرتا بلکہ دو یا اس سے زائد حضرات ہوتے ہیں اور ان مستورات کی حوصلہ افزائی کے لیے کچھ خوش کن کلمات کہے تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟

(۱۵) اگر مناسب مردانا ؤنسر میسر نہ ہو تو کیا ضرورتاً پسِ پردہ مستورات نظامت کر سکتی ہیں یا نہیں؟ جبکہ حاضرین میں مرد حضرات بھی ہوں۔

(۱۶) اگر اسکول کے پروگرام میں یا کسی اور جگہ دف کی کیسٹ بجا کر پروگرام

پیش کیا جائے یا براہ راست دف بجا کر بچے پروگرام پیش کریں تو شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟

(۱۷) بچوں کی حوصلہ افزائی کا طریقہ کیا ہوگا؟ بچوں کی ذہنی اور جسمانی بالیدگی اور جھجک دور کرنے کے لیے مختلف قسم کے پروگرام کیے جاتے ہیں۔ جیسے ورزش، دوڑ اور جسمانی کرتب یعنی (جمنازیم) اس کے ساتھ ساتھ تحریری وتقریری مقابلے مکالمے وغیرہ۔ ان پروگراموں میں بچوں کی حوصلہ افزائی تالیاں بجا کر کرنے کا رواج عام ہوگیا ہے اب یہ کسی مذہب یا فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں رہا۔ اس سے بچوں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ شریعت کی روشنی میں اس طرح تالیاں بجا کر بچوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا کیا حکم ہے؟ ہندوستان کے مخصوص حالات میں ہر مجمع میں نعرہائے تکبیر بلند نہیں کیے جا سکتے اس لیے بچوں کی حوصلہ افزائی کا اور کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟

(۱۸) بچوں کے پروگرام میں جو تمثیلی مکالمات پیش کیے جاتے ہیں مثلاً ایک بچہ کو عالم تو دوسرے کو جاہل، کسی کو پروفیسر، کسی کو ڈاکٹر بنایا جاتا ہے کیا اس میں کوئی شرعی قباحت ہے؟ جبکہ ڈاکٹر بننے والا بچہ ڈاکٹری لباس اور آلہ وغیرہ بھی لگائے ہوئے ہو؟

(۱۹) بچوں کے مکالمات کا مسئلہ: اس طرح اور بھی بعض سبق آموز اور دلچسپ کہانیاں تمثیلی انداز میں پیش کی جائیں، کوئی بچہ گھوڑے کا کردار ادا کرے، کوئی شیر کا کوئی پری بنے، کوئی بھوت کی شکل اختیار کرے تو ان سب کا کیا حکم ہے؟

(۲۰) اسلامی تاریخ کے کچھ واقعات اگر تمثیلی انداز میں پیش کیے جائیں مثلاً صحابۂ کرام کے زمانہ کے واقعات یا بعد کے دور میں خلفاء بنوامیہ وبنوعباس کے دور کے واقعات مثلاً عمر بن عبدالعزیز، ہارون رشید وغیرہ کے زمانہ کے واقعات تمثیلی انداز میں پیش کیے جائیں، ظاہر ہے کہ اس میں کچھ بچوں کو صحابہ کا کردار ادا کرنا پڑیگا تو ان کا کیا حکم ہوگا؟

(۲۱) اس کے علاوہ بھی دیگر شعبہائے تعلیم میں اعلیٰ تعلیم تک پہونچتے پہونچتے اسی طرح کے بے شمار مسائل سامنے آسکتے ہیں اس لیے ضرورت شرعی کی کوئی جامع تعریف بتادی جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے سوالات کے جوابات دینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک بنیادی اور اصولی حقیقت آپ کے سامنے پیش کردی جائے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ اپنی مشہور تالیف ''الاعتدال فی مراتب الرجال'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''مجھے اس جگہ صرف اس چیز پر متنبہ کرنا ہے کہ مسلمانوں اور کفار کی ترقی کے اسباب خالق اسباب نے علیحدہ علیحدہ پیدا فرمائے ہیں۔ ہر بات میں یہ خیال کرلینا کہ جو چیز کفار کے لیے ترقی کا سبب ہے وہی مسلمانوں کے لیے ہے، اور جو چیز ان کی ترقی میں نقصان نہیں دیتی وہ مسلمانوں کو بھی مضر نہیں ہے دین سے بے خبری ہے، کلام خدا اور کلام رسول سے ناواقفیت ہے، خوب سمجھ لو کہ کفار کے لیے معاصی کی سزا کا اصل محل آخرت ہے اور کبھی کبھی بمصالح اس عالم میں بھی ہوجاتی ہے۔ اور ان کی جتنی خوبیاں ہیں وہ جو نیک اعمال کرتے ہیں ان کا بدلہ رب العالمین اور عادل بادشاہ کے یہاں سے ضرور ملتا ہے مگر اسی عالم میں ملتا ہے آخرت میں کچھ نہیں ملیگا اور یہ بات قرین قیاس بھی ہے کیونکہ جب وہ آخرت کے قائل ہی نہیں ہیں تو پھر آخرت کے نیک ثمرات وہاں کیوں ملیں۔ اور آخرت سے انکار کی سزا آخرت میں ملنا بھی چاہیے، اسی لیے ارشاد ہے: ﴿وقیل لهم ذوقوا عذاب النار الذی کنتم به تکذبون﴾ (سورۂ الم سجدہ رکوع ۲) اور ان سے کہا جائیگا کہ اس عذاب کو چکھو جس کو جھٹلایا کرتے تھے۔ قرآن شریف میں کثرت سے اس کا

ذکر ہے۔قران پاک میں ارشاد ہے:﴿ویوم یعرض الذین کفروا علی النار أذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیاو استمتعتم بھا فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تستکبرون فی الأرض بغیر الحق وبما کنتم تفسقون﴾ (سورۂ احقاف ع۲)اور جس روز کفار جہنم کے قریب لائے جائیں گے (اور ان سے کہا جائیگا) تم اپنی لذت کی چیزیں دنیا میں حاصل کر چکے اور ان سے نفع اٹھا چکے بس آج ذلت کے عذاب کی سزا دی جائیگی، اس لیے کہ تم دنیا میں بے وجہ تکبر کرتے تھے اور اس لیے کہ تم فسق کیا کرتے تھے۔ (اور جو کچھ خوبیاں تھیں ان کا بھی بدلہ مل ہی چکا ہے)''۔(الإعتدال فی مراتب الرجال ۹۵/۹۶)

اس کے بعد حضرت شیخ نوراللہ مرقدہ نے آیات قرآنی اور احادیث نبویہ سے اس مضمون پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

''غرض نصوص اس پر بہت کثرت سے دلالت کرتی ہیں کہ کفار اور مسلمانوں کے اصول ترقی مشترک نہیں ہیں بلکہ بعض مشترک ہیں اور بعض جدا جدا ہیں۔مسلمانوں کی ترقی کا معیار صرف دین پر عمل ہے بالخصوص معاصی سے بچنا کہ جس قدر بھی معاصی میں ابتلا ہوگا اتنا ہی دنیا میں مصائب کا سامنا ہوگا، یہ دیکھ کر کے اس قسم کے معاصی کفار سے بھی سرزد ہوتے ہیں اور وہ ترقی کر جاتے ہیں ان کے لیے یہ معاصی مصائب کا سبب نہیں بنتے اس وجہ سے ان سے بے خطر ہو جانا اپنے کو اور زیادہ مصائب میں پھنسانا اور مبتلا کرنا ہے، اور اگر مصائب نہ ہوں تو اور بھی زیادہ خطرناک ہے وہ استدراج ہے جس کا انتقام فوری اور دفعی ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص معصیت اور گناہ کے ساتھ کسی چیز کے حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے، وہ جس چیز کی امید رکھتا ہے اس سے دور ہو جاتا ہے اور جس چیز سے ڈرتا ہے اس کے قریب ہو جاتا ہے۔(الجامع الصغیر بروایة

انس ورقم له بالصحة) اس لیے مسلمانوں کا گناہوں کے ساتھ ترقی اور فلاح کی امید رکھنا اپنے کو اس سے دور کرنا ہے، اور کفار کی حرص کرنا ان کے قدم بقدم چلنا علاوۂ بے غیرتی کے ناکامی کا ذریعہ بھی ہے۔ فارس اور روم کا فوجی دستور یہ تھا کہ جو لشکر غالب ہوتا وہ مغلوب جماعت کے سرداروں کا سر کاٹ کر تفاخر، شہرت پسندی اور مسرت کے طور پر اپنے امیر کے پاس بھیجا کرتا۔ خلافت صدیقیہ میں جب روم سے لڑائی ہوئی تو مسلمانوں نے اس خیال سے کہ ان لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کرنا چاہیے جو یہ دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں، ایک شامی سردار کا سر کاٹ کر حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا، جب وہ آپ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے ناگواری کا اظہار فرمایا، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اے رسول اللہ کے جانشین! وہ لوگ بھی یہ معاملہ ہم لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا فارس وروم کی سنتوں کا اتباع کیا جائے گا؟ میرے پاس کبھی کسی کا سر نہ لایا جائے۔ ہم لوگوں کو (اتباع کے لیے) اللہ کی کتاب اور حدیث رسول کافی ہے۔ (شرح السیر اول)

اگرچہ فقہاء نے بعض نصوص کی بناء پر اس کی اجازت دی ہے؛ مگر صدیق اکبر کی رائے اس کے موافق نہ تھی اس لیے منع فرمادیا، اور حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ فارس اور روم کے فعل سے استدلال کیوں کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس وقت شام تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں ایک جگہ گارہ اور پانی آ گیا آپ اونٹ پر سے اتر گئے موزہ اتار کر شانہ پر رکھ دیے اور اس میں گھس کر اونٹ کی نکیل ہاتھ میں پکڑ لی وہ ساتھ ساتھ تھا، حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آپ نے ایک ایسی بات کی کہ شام والے اس کو بڑی ذلت کی چیز سمجھتے ہیں میرا دل نہیں

چاہتا کہ اہل شہر آپ کو اس حالت میں دیکھیں۔ آپ نے ان کے سینے پر ایک ہاتھ مارا اور ارشاد فرمایا کہ ابو عبیدہ تمہارے علاوہ دوسرا کوئی شخص ایسی بات کہتا تو میں عبرت انگیز سزا دیتا، ہم لوگ ذلیل تھے حقیر تھے اللہ نے اسلام کی بدولت عزت عطا فرمائی، پس جس چیز سے اللہ نے عزت دی اس کے سوا کسی چیز کے ساتھ عزت ڈھونڈھیں گے تو اللہ جل شانہ ہم کو ذلیل کر دیں گے۔ (مستدرك للحاكم)

حقیقۃً مسلمان کے لیے اصل عزت اللہ کے یہاں کی عزت ہے دنیا اور دنیا والوں کے نزدیک عزت ہوئی بھی تو کیا اور گئے دن کی ہے۔

لوگ سمجھیں مجھے محروم وقار و تمکین	وہ نہ سمجھیں کہ میری بزم کے قابل نہ رہا

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ کی نافرمانیوں کے ساتھ لوگوں میں عزت تلاش کرتا ہے اس کے تعریف کرنے والے اس کی مذمت کرنے والے بن جاتے ہیں۔ ”مقاصد حسنہ“ میں یہ مضمون مختلف عنوانات سے نقل کیا گیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے ترقی کی راہ، عزت کی راہ، زندگی اور دنیا میں آنے کی غرض صرف اللہ کی رضا اور اس کی مرضیات پر عمل ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر عزت ہے تو یہی ہے منفعت ہے تو یہی ہے، حیرت ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ پاک اور اس کے سچے رسول کے ارشادات میں علوم وحکمت، دارین کی فلاح وترقی کے اسباب اور خزانے بھرے ہوئے ہیں؛ لیکن وہ ہر بات میں دوسروں پر نگاہ رکھتے ہیں، دوسرے کا پس خوردہ کھانے کے درپے رہتے ہیں۔ کیا یہ چیزیں انتہائی بے غیرتی اور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اجنبیت اور مغایرت کی نہیں ہیں؟ کیا اس کی مثال اس بیمار کی سی نہیں جس کے گھر میں ایک مرجع الخلائق حکیم ایک حاذق ڈاکٹر موجود ہو اور وہ کسی اناڑی طبیب سے علاج کرائے“۔ (الإعتدال فی مراتب الرجال: ۱۰۳ تا ۱۰۶)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ تحریر فرماتے ہیں ”غرضیکہ کسی مصلحت کے خاطر کسی معصیت کا ارتکاب ہرگز جائز نہیں البتہ شریعت میں بڑے محظور سے بچنے کے لیے چھوٹے محظور کو گوارہ کرلیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو ادھر کوئی نابینا کنویں میں گرنے لگا تو نماز توڑ کر اس کو بچانا فرض ہے حالانکہ عام حالات میں نماز توڑنا گناہ ہے مگر ایک بڑی مصیبت سے بچنے کے لیے اس کو اختیار کرلیا گیا، ایسی صورت میں ”اھون البلیتین“، یعنی ضرر عظیم کو دفع کرنے کے لیے کم درجہ کے ضرر کو اختیار کرلیا گیا، اس کا فیصلہ کرنا کہ بلیتین میں سے اھون کونسی ہے؟ ہر شخص کا کام نہیں کیونکہ بسا اوقات انسان اتباع ھویٰ، عصبیت یا حبِ مال وجاہ کی بنا پر غیر اھون کو اھون سمجھ لیتا ہے اس لیے یہ فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو علوم اسلامیہ میں پوری مہارت کے علاوہ تدین وتقوی میں بھی اعلی مقام رکھتا ہو بلکہ اہم امور میں ایسے علماء کی جماعت کا فیصلہ ضروری ہے۔ ”اھون البلیتین“ کے کلیات شریعت نے بیان فرما دیے ہیں، ان کلیات کا پورا احاطہ ان کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنا پھر پیش آمدہ جزئیات کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ یہ کسی کلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر داخل ہے تو کس کلیہ میں؟ ان امور کے لیے علوم دینیہ میں مہارت تامہ بہت اونچے درجہ کے تدبر وتفقہ وتدین وتصلب کی ضرورت ہے۔ اگر کسی ناجائز کام کے بارے میں خوب غور وخوض کے بعد یہ محقق ہو جائے کہ اسے ”اھون البلیتین“ قرار دے کر اختیار کیا جا سکتا ہے تو یہ وضاحت بلکہ عمومی حالات میں اس کا بار بار اعلان ضروری ہے کہ یہ کام ناجائز ہے مگر شرعی ضرورت کے تحت اسے اختیار کیا گیا ہے، اگر یہ وضاحت نہ کی جائیگی تو عامۃ المسلمین اس گناہ کو گناہ نہ سمجھیں گے اور جہاں شرعی مجبوری نہ ہوگی وہاں بھی اس کا ارتکاب کرنے لگیں گے، اس کی واضح مثال تصویر کھنچوانا ہے جس کا حرام ہونا متفق علیہ ہے مگر

حکومت نے حج اور شناختی کارڈ کے لیے تصویر کو لازم قرار دیا ہے۔اس ضرورت شدیدہ کے تحت علماء نے اس کی اجازت دی ہے مگر اس خاص موقع میں اجازت کے باوجود جس شدت کے ساتھ اس کی حرمت تحریراً وتقریراً بیان کرنا چاہیے تھی اس قدر نہیں ہوئی بلکہ بعض علماء کے طرز عمل سے مسلمانوں نے اس گناہِ کبیرہ کو جائز سمجھ لیا ہے کیونکہ ان علماء کی تصاویر لی جاتی ہیں تو وہ روکتے نہیں اخبارات وغیرہ میں ان کی تصاویر شائع ہوتی رہتی ہیں مگر انہوں نے اس معصیت پر نکیر کا کبھی ایک حرف بھی نہیں کہا اس سے عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ کوئی گناہ نہیں۔یہی حال ٹیلیویژن کا ہے صرف یہی نہیں کہ علماء اس پر نکیر نہیں کرتے بلکہ بہت سے علماء خود اس میں مبتلا ہیں۔جس کی وجہ سے عوام کے قلوب سے اس کی قباحت نکل چکی ہے،اور وہ اسے جائز سمجھنے لگے ہیں۔حاصل یہ کہ کسی دینی یا دنیاوی مصلحت سے کسی معصیت کا ارتکاب جائز نہیں،آج کل سیاسی لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سیاسی کام کرتے ہوئے جائز وناجائز دیکھنے کی ضرورت نہیں،یہ سراسر غلط ہے۔مسلمان تو وہی ہے کہ جو ہر قدم پر اللہ کی رضا کو ملحوظ رکھے اور اس کی قائم کردہ حدود سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے جو لوگ سیاست کا کام محض تحصیل اقتدار کے لیے کرتے ہیں اور ان کو ملت کی دینی ودنیاوی فلاح سے کچھ غرض نہیں۔وہ سیاسی کام میں احکام اسلام کو ملحوظ نہیں رکھتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔حیرت تو ان حضرات پر ہے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ موجودہ سیاست میں حصہ لینے سے ہمارا مقصود ملک میں صحیح اسلامی نظام قائم کرنا ہے مگر پھر بھی وہ سیاسی کاموں میں احکام اسلام کی پرواہ نہیں کرتے غیر مشروع تدابیر اختیار کرتے ہیں،جب ان سے کہا جاتا ہے آپ تو اسلامی نظام قائم کرنے کے مدعی ہیں مگر آپ خود اسلام نافذ کرنے کیلیے جو طریقے اختیار کررہے ہیں وہ غیر اسلامی اور ناجائز ہیں۔تو جواب دیتے ہیں اگرچہ یہ طریقے

ناجائز ہیں مگر انکے بغیر اسلام لانا ممکن نہیں ہے، اسی لیے اب تو جائز اور ناجائز کی پرواہ کیے بغیر اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد لازم ہے۔ اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد پورے طور پر اسلام نافذ کردیں گے یہ محض دھوکہ ہے ہمیں انکی نیت پر شبہ نہیں مگر انکا طریقہ کار ایسا ہے کہ اس سے نفاذ اسلام کی توقع ہر گز نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ غیر اسلامی طریقوں سے بے دینوں کی کامیابی تو ممکن ہے مگر دینداروں کو اولاً تو کامیابی ہوگی نہیں اور صورۃً کامیابی ہو بھی گئی تو اسکے نتیجے میں اسلام نہیں آئیگا بلکہ اسلام کے نام کی کوئی اور چیز آئیگی اور صورۃً جو کامیابی ہوگی وہ بھی چند روز سے آگے نہ بڑھ سکے گی، جب اسکی بنیاد ہی کمزور تھی تو اس پر عمارت کیسے قائم کی جاسکتی ہے؟

عقل و نقل اور مشاہدہ سب کا متفقہ فیصلہ ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے مسلمانوں کو ہرگز ہرگز کامیابی نہیں ہوسکتی، اگر کبھی غیر مشروع و ناجائز طریقوں سے کفار وفساق کو کامیابی ہو تو اسمیں مسلمانوں کو قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ مسلمان اور کافر کی طبعی افتاد اور مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دیکھا جاتا ہے ایک نسخہ ایک مزاج کو مفید اور دوسرے مزاج کو مضر ہوتا ہے جیسا کہ ایک قصہ مشہور ہے بھنگی عطر کی دکان کے پاس سے گذرا اس کا دماغ جو پاخانہ کی بدبو سے مانوس تھا خوشبو کو برداشت نہ کرسکا، اسلیے بیہوش ہوگیا بہت علاج کیے مگر سب ناکام رہے اسکے بھائی کو علم ہوا تو وہ شیشی میں پاخانہ بھر کر لایا، اور اسکی ناک کے ساتھ لگادی وہ فوراً ہوش میں آگیا، ٹھیک اسی طرح کفار وفساق کا دماغ معصیت کے تعفن سے سڑا ہوا ہے اسلیے انکو حرام و ناجائز کاموں کی بدبو نافع ہے بخلاف مسلمان کے کہ یہ شاہزادہ ہے اسکا دماغ نہایت صاف و پاکیزہ ہے اسکو صرف احکام شرعیہ کی خوشبو ہی نفع دیگی، کوئی احمق شہزادہ کو بھنگی پر قیاس کر کے اسے پاخانہ سنگھادے تو شہزادہ کا دماغ پھٹ

جائیگا۔ مسلمانوں کو کفار و فساق پر قیاس کرنا غلط ہے کہ جو چیز انکو نافع ہوگی وہی انکے لیے بھی نافع ہوگی یہ قیاس اس بوجھ بجھکڑ کی منطق جیسا ہے جو اسکے دماغ میں کسی کو درخت سے اتارنے کیلیے آئی تھی، قصہ یہ پیش آیا ایک شخص درخت پر چڑھ گیا اترنے کی ہمت نہ ہوئی لوگوں کو پکارا وہ جمع ہوگئے اور مختلف تدبیریں سوچیں مگر اطمینان نہ ہوا، بالآخر طے پایا کہ یہ عقدہ بوجھ بجھکڑ سے حل کرایا جائے کیونکہ وہ بستی میں سب سے زیادہ عقلمند ہے، اس سے درخواست کی گئی تو وہ موقعہ پر پہنچا اور کہا کہ تم سب بے عقل ہو میرے بغیر ایک معمولی سی بات کا حل نہ نکال پائے، اسکی تو بہت آسان تدبیر ہے، ایک لمبا رسہ اس شخص کی طرف پھینکو وہ اپنی کمر سے خوب مضبوطی سے باندھ لے پھر نیچے کے لوگ خوب زور سے جھٹکا لگا کر اپنی طرف کھینچیں بڑی آسانی سے نیچے پہنچ جائیگا؛ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا وہ شخص اس زور سے گرا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی اور مر گیا، لوگوں نے بوجھ بجھکڑ سے کہا کہ یہ کیا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ اس شخص کی قسمت خراب تھی ورنہ تو میں نے کتنوں کو اس طریقے سے کنویں سے نکالتے دیکھا ہے۔ جیسے اس بجھکڑ کا درخت پر چڑھنے والے کو کنویں میں گرنے والے پر قیاس کرنا صحیح نہیں، اسی طرح مسلمانوں کو کفار پر قیاس کرنا غلط اور مہلک ہے، کفار پستی میں ہیں اور مسلمان بلندی پر، کفار جن تدابیر سے پستی سے بلندی کی طرف آنے میں کامیاب ہو رہے ہیں اگر وہی تدابیر مسلمان اختیار کرینگے تو بلندی سے پستی میں جا گرینگے۔ جوتے میں اگر نجاست لگ جائے تو اسکو پھینکا نہیں جاتا مگر ٹوپی میں کسی چیز کا ذرا سا بھی دھبہ لگ جائے تو فوراً اتار دی جاتی ہے، اللہ کے پاس مسلمان ٹوپی کی طرح معزز ہیں اور کفار جوتے کی طرح ذلیل، مسلمانوں کو معصیت سے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۴۱ تا ۴۵)

قرآن مجید میں باری تعالی کا ارشاد ہے "اللہ تعالی تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا

ہے کہ جب احکام الٰہیہ کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جب تک کہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کردیں، اس حالت میں تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے''۔(پ۴ آیت ۱۴۰)

امام ابوبکر جصاصؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرے اس پر ردونکیر واجب ہے، اگر گناہ کا ازالہ ممکن نہ ہو تو یہ نکیر ہی کی صورت ہے کہ گناہ پر نفرت وکراہت کا اظہار کیا جائے، اور مرتکب گناہ کی ہمنشینی اور اسکے پاس سے اٹھ جایا جائے حتیٰ کہ وہ گناہ کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ جائے۔(احکام القرآن ۲/ ۲۸۹)

اس سے انکار نہیں ہے کہ تصویر کی لعنت اس زمانہ میں وباء عام کی شکل اختیار کر چکی ہے، ایوان اسمبلی سے لیکر کچی جھوپڑیوں تک ملک کے درودیوار تصویروں سے اٹے ہوئے ہیں مگر یہ فلسفہ بھی تو خودکشی کے مترادف ہے کہ کوئی مرض جب وباء عام کی صورت اختیار کرکے پوری آبادی کو لپیٹ میں لے لے تو مناسب تدابیر اختیار کرنے کے بجائے اسے مرض کہنا ہی چھوڑ دیا جائے؛ بہرحال کوئی گناہ کتنا ہی عام ہوجائے اس سے حکم شریعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لسان نبوت سے نکلا ہوا ایک ایک حرف اپنی جگہ اٹل انمٹ حقیقت اور رہتی دنیا تک مشعل راہ ہے، اگر آج کا فارمی مسلمان ہادی کونین ﷺ کے صریح ارشادات کے خلاف عملاً بغاوت پر اتر آیا ہے تو یہ اسکی اپنی شقاوت وسیاہ بختی ہے، نہ کہ فرمان رسول ﷺ کا نقص۔ تصویرسازی شریعت کی رو سے ایک کبیرہ گناہ ہے اسکے ہولناک نتائج کسی ذی ہوش انسان پر مخفی نہیں، معذب اقوام کا عبرتناک انجام قرآن مجید نے مفصل بیان کیا ہے ان میں کفروشرک کی گمراہی تصویر کے راستے ہی سے درآئی تھی۔

چنانچہ صحیحین کی حدیث ہے ''ان اہل کتاب میں جب کوئی آدمی رخصت ہو جاتا تو اسکی قبر پر مسجد بنادیتے، اور پھر اس میں یہ تصویر رکھتے، یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بدتر لوگ ہیں۔(متفق علیہ) شارح بخاری امام ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں: اکثر امتوں میں کفر وشرک کی بیماری تصویروں کے راستے سے آئی۔(فتح الباری ۸/ ۱۷)

اس دور میں جبکہ بے پردگی، فحاشی اور عریانی کا سیلاب تمام بند توڑ چکا ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ فتنۂ تصویر کا شاخسانہ ہے، اور پورا سیلاب ٹی وی، وی سی آر اور فحش اخبارات کے دہانے ابل رہا ہے۔تصویر کی حرمت پر احادیث بہت کثرت سے آئی ہیں جو معنوی طور پر حد تواتر تک پہنچ جاتی ہیں، صرف بخاری شریف میں اس پر دس ابواب مذکور ہیں، ہم اختصار کے پیش نظر صرف صحیح بخاری کے ان ابواب سے ہی ایک ایک حدیث نقل کرتے ہیں:

(۱) جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اسمیں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔(بخاری ۲/ ۸۸۰ باب التصاویر)

(۲) قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت ترین عذاب تصویر سازوں کو ہوگا۔

(ایضاًباب عذاب المصور من یوم القیامۃ)

(۳) اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو عمل تخلیق میں میرا مقابلہ کرنے لگے یہ لوگ ایک دانہ یا ایک ذرہ تو پیدا کر کے دکھائیں۔(ایضاً باب نقض الصور)

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ ایک سفر سے تشریف لائے میں نے طاق پر تصویر دار پردہ لٹکایا ہوا تھا، آپ نے جب اسکو دیکھا تو پھاڑ دیا اور فرمایا روز قیامت سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو صفت تخلیق میں اللہ کی نقل اتارتے ہیں۔(ایضاً باب ماوطی من التصاویر)

(۵) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے تصویر دار گدا خریدا تو آپ ﷺ دروازے

پر رک گئے اندر تشریف نہ لائے، میں نے عرض کیا مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی؟ میں اپنے گناہوں سے اللہ کے بارگاہ میں توبہ کرتی ہوں آپ ﷺ نے فرمایا یہ گدا کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس مقصد سے لیا ہے کہ آپ اس پر بیٹھیں اور اس سے تکیہ لگائیں آپ ﷺ نے فرمایا روز قیامت ان تصویر سازوں کو عذاب ہوگا اور ان سے کہا جائیگا اپنی مخلوق تصاویر کو زندہ کر کے دکھلاؤ، اور بلا شبہ فرشتے ایسے مکان میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔ (ج/۲ص ۸۸۱ باب من کرہ القعود علی الصور)

(۶) حضرت عائشہؓ نے گھر پر تصویر دار پردہ لٹکایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے ہٹادو اسکی تصویر بار بار میری نماز میں مخل ہوتی ہے۔ (ایضاً باب کراھۃ الصلاۃ فی التصاویر)

(۷) حضرت جبرئیل علیہ السلام سے آپ ﷺ سے ملاقات کا وعدہ کیا مگر وقت پر نہ آئے یہ بات آپ ﷺ پر گراں گزری؛ لیکن آپ ﷺ دولت کدہ سے باہر تشریف لائے تو جبرئیل علیہ السلام مل گئے، آپ ﷺ نے ان سے اپنے رنج و زحمت اور انتظار کا شکوہ فرمایا، اس پر جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا جس گھر میں کتا یا تصویر موجود ہو ہم اسمیں داخل نہیں ہوتے۔ (ایضاً باب لا تدخل الملائکۃ بیتاًفیہ صورۃ) آپ ﷺ کے دولت کدہ پر اس وقت یہ دونوں چیزیں موجود تھیں جن کے وجود کا آپ ﷺ کو علم نہ تھا، جبرئیل علیہ السلام نے بتلایا تو آپ ﷺ نے مٹادیا۔

(۸) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں انہوں نے ایک تصویر دار پردہ خریدا، آپ ﷺ کی اس پر نظر پڑی تو آپ ﷺ دروازے پر رک گئے اندر تشریف نہ لائے، میں نے چہرۂ انور پر ناراضگی کے آثار دیکھے تو عرض کیا، یا رسول اللہ! میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی جناب میں توبہ کرتی ہوں مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ تصویر دار پردہ کیسا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ میں نے اس لیے خریدا ہے کہ آپ اس پر بیٹھیں اور اس سے تکیہ لگائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ان تصویر والوں کو روز قیامت عذاب ہوگا اور کہا جائیگا اپنی مخلوق تصاویر کو زندہ کر کے دکھاؤ، اور فرمایا جس گھر میں تصاویر ہوں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔(ایضاً باب من لم یدخل بیتا فیہ صورۃ)

(۹) حضور اکرم ﷺ نے سود کھانے والے پر، اور کھلانے والے پر، جسم گودنے والی پر، گودوانے والی پر اور تصویر ساز پر لعنت فرمائی ہے۔(ایضا باب من لعن المصور)

(۱۰) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے دنیا میں تصویر بنائی اسے روز قیامت مجبور کیا جائیگا کہ اس میں روح پھونکے؛ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے گا۔(ایضا باب من صور فی الدنیا)

یہ وعیدیں ہر قسم کی تصویر سے متعلق ہیں خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، کپڑے کاغذ پر بنائی جائے یا در و دیوار پر، سکہ پر نقش کی جائے یا نوٹوں پر چھاپی جائے؛ بہر کیف یہ مذکورہ وعیدوں کا مصداق اور حرام ہے۔ اس بارے میں اکابرِ علماء امت کی تصریحات آگے آرہی ہیں پھر ان وعیدوں کا مقصد فقط تصویر ساز ہی نہیں بلکہ ابن الحاجؒ کی تصریح کے مطابق اس کی تحسین و تصویب کرنے والا، اس کا ہم نشین، اس کے اس فعل پر دل سے راضی ہونے والا، اس فعل کو دیکھ کر قدرت کے باوجود نکیر نہ کرنے والا سب شریک گناہ ہیں۔ (المدخل ۱/۲۷۳)(احسن الفتاوی ۸/۱۷،۴۱۷تا۴۲۲)

اب آپ کے سوالات کے جوابات پیش خدمت ہیں:

(الف) ایسے ادارہ کا قیام شرعاً جائز اور درست ہے، باقی سوال میں آپ کا یہ جملہ "کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو آج کے مسلمان بچے کل زمانہ سے بہت پیچھے رہ کر اقوام عالم کے مقتداء بننے کے بجائے ان کے مقتدی بن جائیں گے" یہ محض مبالغہ آرائی ہے یہ

سارے علوم معاش اور دنیوی گزر بسر سے تعلق رکھنے والے ہیں، ایک مسلمان کے لیے معاش کے مقابلے میں معاد زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

(ب)(۱) جاندار کی تصویر چاہے ہاتھ سے بنائی گئی ہو یا کیمرے کے ذریعہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے، یعنی دونوں ہی حرام ہیں۔

(۲،۳) حرمت کی یہ درجہ بندی آپ کس بنیاد پر کر رہے ہیں، شریعت میں تمام منہیات سے بچنا ضروری ہے، ایسی کوئی درجہ بندی نہیں کسی امر کے بارے میں یہ متعین کرنا کہ وہ موجودہ حالات میں ضرورت یا حاجت کا درجہ رکھتا ہے، یہ نہایت نازک، احتیاط اور دقت نظر کا متقاضی ہے اس لیے ہر عہد کے علماء، ارباب افتاء کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات کو پیش نظر رکھ کر طے کریں کہ اب کونسے امور ہیں جو ضرورت وحاجت کے درجہ میں آگئے ہیں اور ان کی وجہ سے احکام میں تخفیف ہوسکتی ہے؛ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے نازک مسئلہ میں افراد واشخاص کے بجائے علماء کی ایک مقتدر جماعت ہی فیصلہ کرے تاکہ دفع حرج کے نام پر اباحت کا راستہ کھلنے نہ پائے۔

(۴) نفلی حج وعمرہ یا بلا ضرورت صرف تفریح کے لیے بیرونی سفر کی غرض سے تصویر بنانا جائز نہیں۔

(۵) جائز نہیں۔ (۶) نہیں۔

(۷) موجودہ حالات میں جبکہ پتلون کا استعمال اتنا عام ہو چکا ہے کہ کسی قوم یا مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں رہا تو یونیفارم کے طور پر بچوں کو پتلون پہنانا جائز ہے؛ لیکن جیسا کہ آپ نے شروع میں تحریر فرمایا صحیح اسلامی تعلیم اور ملی تشخص کے لیے ادارہ قائم کر رہے ہیں تو پھر صلحاء والا لباس کیوں اختیار نہیں کرتے۔

(۸) یہ بھی ناجائز ہے۔ (۹) ناجائز ہے۔

(۱۰) نہیں۔ (۱۱) یہ بھی درست نہیں۔

(۱۲) اس مقصد کے لیے بھی تصویر کا استعمال درست نہیں، کمپیوٹر کے ذریعہ سے تعلیم دی جاسکتی ہے۔

(۱۳) مردوں کے لیے سر ستر میں داخل نہیں۔ اس لیے عمر کی کسی منزل میں ان کے لیے سر ڈھانکنا ضروری اور واجب نہیں۔ عورت کے لیے سر ستر میں داخل ہے اس لیے لڑکیوں کو اس کا عادی بنانا ضروری ہے۔

(۱۴) ان سے فرائض منصبی کی ادائیگی کے خاطر جتنی گفتگو ضروری ہو حجاب اور پردہ کی رعایت کے ساتھ درست ہے۔

(۱۵) نہیں، اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو گنجائش ہے۔

(۱۶) یہ ناجائز ہے۔

(۱۷) تالیوں سے احتراز ضروری ہے؛ البتہ حوصلہ افزائی کے لیے کچھ کلمات مقرر کر دیے جائیں، اور بوقت ضرورت مجمع ان کلمات کو کہہ کر بچوں کی حوصلہ افزائی کر سکتا ہے۔

(۱۸) شرعی حدود و قیود میں رہ کر اس کی گنجائش ہے۔

(۱۹) شرعی حدود و قیود میں رہتے ہوئے اس کی بھی گنجائش ہے۔

(۲۰) یہ طریقۂ کار بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے تقدس کے منافی ہے۔

(۲۱) اس کا جواب شروع میں دیدیا گیا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ، ۲۲/ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ

کعبۃ اللہ کی تصاویر پر مشتمل چٹائیوں پر قدم پڑنے سے بے حرمتی کا وہم

سوال: ایک شہر کی ایک سوسائٹی میں مسجد میں مصلیوں کے واسطے نماز کیلیے جو چٹائیاں بچھائی گئی ہیں ان میں کعبۃ اللہ کی تصویریں ہیں، ایک چٹائی پر تقریبا بیس تصویریں ہیں۔ایسی چٹائیاں پانچ اور ہیں، اس حساب سے تقریبا سو تصویریں بنتی ہیں جب مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو کعبۃ اللہ کی تصویریں ہی تصویریں نظر آتی ہیں، نمازی آتے ہیں اور ہفتہ واری اجتماع ہوتا ہے، اسی طرح جماعتیں آتی رہتی ہیں، ان تمام کے قدم کعبۃ اللہ کی تصویروں پر پڑتے ہیں بظاہر بے ادبی اور بے حرمتی کا خیال آتا ہے جس سے طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے، اسی جذبہ کے تحت ایک آدھ مرتبہ ذمہ داروں سے بات کی مگر جواب یہ ملا کہ جائز ہے یہ سن کر خاموش ہوگیا۔ جواب طلب امر یہ ہے جائز تو ہے مگر کعبۃ اللہ کی بے حرمتی تو نہیں؟ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مکیؒ کے بارے میں سنا ہے کہ کالے رنگ کی جوتیاں اس لیے استعمال نہیں فرماتے تھے کہ کعبۃ اللہ کا غلاف کالا ہوتا ہے تو مذکورہ چٹائیاں بچھانا مناسب ہے کہ نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بچھا کر استعمال کی جانے والی چیزوں میں سے جائے نماز ایک ایسی چیز ہے جس کا ادب احترام کیا جاتا ہے، گویا اس کو جائے نماز قرار دینا اس کے قابل تعظیم ہونے کی علامت ہے، اس لیے اس پر اگر کعبۃ اللہ کی تصویر بنی ہوئی ہو چاہے سجدہ کی جگہ پر ہو یا جہاں پاؤں رکھے جاتے ہیں وہاں ہو، دونوں صورتوں میں اس تصویر کی اہانت نہیں۔

ھدایہ کی شرح ''فتح القدیر'' میں ہے۔ وجه ما فی الأصل ان المصلی: ای السجادة التی یصلی علیها معظم فوضع الصورة فیه تعظیم لها حیثما کانت منه،

بخلاف وضع علی البساط الذی لم یعد للصلاۃ(فتح القدیر مع العنایة ۱/ ۴۱۴و۴۱۵)

''عنایہ'' شرح ھدایہ میں ہے: وجه ما فی الأصل ما ذکره ان المصلی الیه معظم بلفظ المفعول فیهما،ومعنا ہ ان البساط الذی اعد لصلاۃ معظم من سائر البسط،فاذا کان فیه صورۃ کان نوع تعظیم لهاونحن امرنا باهانتها فلاینبغی ان یکون فی المصلی مطلقاسجد علیهااو لم یسجد.(عنایہ مع فتح القدیر۱/۴۱۵)

اگر کوئی آدمی نماز کے ارادے سے اس جائے نماز پر بیٹھتا ہے تو چاہے بیٹھنے کے دوران کعبۃ اللہ کی تصویر اس کے نیچے آتی ہو، پھر بھی وہ اس کی توہین اور بے حرمتی شمار نہیں ہوگی۔ جیسے کوئی آدمی خود کعبۃ اللہ میں جا کر نماز پڑھے تو یہ اس کی بے ادبی اور توہین نہیں ہے۔نبی کریم ﷺ سے کعبۃ اللہ میں نماز پڑھنا اور خطبہ دینے کے لیے کعبۃ اللہ کے دروازہ پر کھڑا ہونا ثابت ہے،تو جب اصل کعبہ کے ساتھ یہ معاملہ درست ہے تو اس کی تصویر کے ساتھ اس معاملہ کو بے ادبی پر کیوں محمول کیا جائے؟

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کی طرف نسبت فرما کر آپ نے جو واقعہ ذکر کیا ہے مجھے اس کی تحقیق نہیں۔ بالفرض اگر وہ صحیح اور ثابت بھی ہو تو یہ ان کا ایک حال ہے جس کا دوسروں کو پابند نہیں بنایا جا سکتا، آپ خود بتلائیں کیا آپ نے کبھی سیاہ رنگ کی جوتیاں استعمال نہیں کیں؟اس لیے آپ کی طبیعت پر پڑنے والا بوجھ آپ کا ایک حال ہے دوسرے حضرات کو اسکی وجہ سے شریعت کی دی ہوئی سہولت و رخصت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ:العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح:عباس داؤد بسم اللہ		۲/رجب المرجب ۱۴۲۴ھ

دینی اجلاس میں پنڈتوں کی شرکت، موبائل کی رنگ میں ’’اللہ اکبر‘‘ فٹ کرنا

سوال: (۱) جلسۂ حفاظ کی دستار بندی میں پنڈتوں کو مدعو کرنا اور جلسہ گاہ میں ان کے آنے پر جب کہ ہمارے علمائے دین بھی موجود ہوں انھیں نظر انداز کرکے پنڈتوں کا استقبال اور ان کی خوب آو بھگت کرنا؛ نیز جلسہ گاہ کے قریب پنڈتوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر اہل علم کا تصویر کشی میں مصلحت دکھا کر خلاف شریعت امر کی تائید اور اس میں شرکت کرنا شرعا کیسا ہے؟

علمائے دین پیچھے تشریف فرما ہوں پنڈت لوگ آگے بیٹھے ہوں، اور جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیے بغیر شعر و شاعری اور جھوم جھوم کر گانے کے قواعد کی رعایت کرتے ہوئے گانے ہی کی طرز پر شرکیہ الفاظ پر مشتمل نظم سے اہل علم کی صدارت میں کیا جائے اور وقتاً فوقتاً تصویر کشی بھی ہوتی ہے اور تالیاں بھی برابر بجائی جاتی رہیں، ایسے موقعہ پر برائی اور منکرات پر مناسب انداز سے بروقت نکیر کی جائے یا مصلحت دکھا کر خلاف شریعت امر کی تائید کرتے ہوئے اس میں شرکت کی جائے؟

علاوہ ازیں چند باتیں اور قابل استفسار ہیں:

[۱] پنڈتوں اور سوامیوں کے ساتھ اہل علم کی گل پوشی و چادر پوشی کا کیا حکم ہے؟

[۲] ایسے اجلاس کیا خالص مذہبی اداروں اور مساجد کے قریب میں منعقد کر سکتے ہیں؟

[۳] کیا ایسے اجلاس میں اسلام دشمن پنڈتوں کو بیان کرنے کا موقعہ دیا جا سکتا ہے؟

[۴] ان اجلاس میں پہلے سے شریک ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

[۵] ’’لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق‘‘ الحديث کے پیش نظر حاضرین جلسہ کو مسئلہ بتلایا جائے یا انتشار کے اندیشہ سے خاموشی برتی جائے؟

[۶] جب ہم میں اور پنڈتوں میں عقائد واعمال کا کافی فرق ہو تو ان سے محبت اور دوستی کا تعلق قائم کیا جائے یا ان سے دور رہا جائے؟

(۲) کیا موبائل کی رنگ ٹون میں بجائے رنگ کے صدائے اللہ اکبر فٹ کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے اسی نوع کے مختلف مواقع پر کیے گئے سوالات کے جواب میں جو اصولی باتیں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے تحریر فرمائی ہیں، کفایت المفتی سے پیش کی جاتی ہیں:

''کفایت المفتی'' میں ہے کسی ہندو پیشوا کی آمد پر بتقاضائے رواداری اس کے خیر مقدم میں شریک ہونا اور اس کے گلے میں ہار ڈالنا کفر نہیں، اگر ہندو مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتے ہوں تو مسلمانوں کے لیے بھی مکافات کے طور پر ایسا کرنا مباح ہے، اس میں کوئی شعائر شرک و کفر کا احترام نہیں بلکہ مکارم اخلاق اور تہذیب کا مقتضاء ہے۔(۹/۳۳۹)

ایک اور مقام پر ہے خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے ساتھ ان کے مذہب کی پسندیدگی کے لحاظ سے دوستی اور محبت رکھنا حرام ہے، اور محض یکجائی سکونت اور ہم سائیگی کے طور پر یا تمدنی اور معاشرتی ضرورتوں کی وجہ سے ان سے ملنا، بات چیت کرنا، انکے ساتھ بیع وشراء کرنا، ہدیہ دینا، ہدیہ قبول کرنا، یہ سب جائز اور مباح ہے۔(۹/۳۳۱)

ایک اور جگہ ہے ''ایک شرعی اصول ذکر کر دیا جاتا ہے جس سے ان افعال کا شرعی حکم معلوم ہو جائے وہ یہ کہ شریعت مقدسہ نے مسلمانوں کو ایسے مجمع میں شریک ہونے اور بیٹھنے سے منع کیا ہے جہاں آیات اللہ (یعنی اسلامی احکام) کے ساتھ استہزاء یا توہین یا ان

کی تکذیب کی جاتی ہو،قرآن پاک میں ہے:﴿اذا سمعتم آیات اللّٰہ یکفر بها ویستهزأ بهافلاتقعدوا معهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره انکم اذا مثلهم﴾ (سورۂ نساء) مجمع خواہ کافروں کا ہو یا برائے نام مسلمانوں کا ...... ایسے افعال واعمال جومشرکانہ ہوں، کرنا مسلمانوں کے لیے حرام ہے،حدیث شریف میں ہے: من کثر سواد قوم فهو منهم. (مزید لکھا ہے) اسلام نے دوسرے مذہب کے پیشواؤں کی توہین کرنے اور انکو برا کہنے سے منع کیا ہے'' (۹/ ۳۳۵،۳۳۶)

آگے مزید تحریر فرماتے ہیں مصالحت اور آشتی کے ساتھ زندگی گذارنا اور تجارت، زراعت، صنعت اور سیاست میں اشتراک عمل کرنا جائز اور بعض حالات میں واجب بھی ہوجاتا ہے، خصوصاً ایسے مقامات میں جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مشترک ہو یا غیر مسلم آبادی کی کثرت ہو۔ بہرحال یہ لازم ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کے پابند رہیں، اور مذہبی شعائر کی عزت وحرمت محفوظ رہے، ورنہ پھر مسلمان پر مذہب کے تحفظ اور اس کا احترام قائم رکھنے کے فرائض عائد ہونگے۔ (۹/ ۳۳۶)

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے مذہبی تیوہاروں میں سبیل لگانا یا پان وغیرہ تقسیم کرنا، اگر ان کے تیوہار کی تعظیم وتکریم کے لیے ہو تو یہ کفر ہے، اور قیام امن اور باہمی رواداری کی نیت سے ہو اور ان کے مذہبی اعمال کی تحسین مقصود نہ ہو اور یہ کام ان کے خاص موقع سے علیحدہ راستہ میں ہوتا ہو تو مباح ہے۔ اور اگر خاص موقع پر ہو تو مکروہ تحریمی یا حرام ہے، مگر کفر نہیں ہے۔ کفر تو اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ اسے اچھا سمجھیں اور ان کے طرز عمل سے ان اعمال کی تصدیق وتحسین ہوتی ہو۔ (۹/ ۳۳۸،۳۳۹)

سورۂ انعام کی آیت شریفہ نمبر ۶۸ ﴿واذارأیت الذین یخوضون فی آیتنا﴾ الخ کی تفسیر میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: پھر اہل باطل کی مجلس سے رخ پھیرنے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اس مجلس سے اٹھ جائیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں رہتے ہوئے کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، ان کی طرف التفات نہ کریں، لیکن آخر آیت میں بتلا دیا گیا کہ مراد پہلی ہی صورت ہے، کہ ان کی مجلس میں بیٹھے نہ رہیں، وہاں سے اٹھ جائیں۔

آخر آیت میں فرمایا کہ اگر تم کو شیطان بھلا دے، یعنی بھول کر ان کی مجلس میں شریک ہو گئے خواہ اس طرح کہ ایسی مجلس میں شریک ہونے کی ممانعت یاد نہ رہی، یا اس طرح کہ یہ یاد نہ رہا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف تذکرے اپنی مجلس میں کیا کرتے ہیں تو اس صورت میں جس وقت بھی یاد آجائے اسی وقت اس مجلس سے اٹھ جانا چاہیے، یاد آجانے کے بعد وہاں بیٹھا رہنا گناہ ہے۔ دوسری ایک آیت میں بھی یہی مضمون ارشاد ہوا ہے، اور اس کے اخیر میں یہ فرمایا ہے کہ اگر تم وہاں بیٹھے رہے تو تم بھی انھیں جیسے ہو۔

امام رازیؒ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کا اصل منشا گناہ کی مجلس اور مجلس والوں سے اعراض اور کنارہ کشی ہے، جس کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہاں سے اٹھ جائے، لیکن اگر وہاں سے اٹھنے میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا خطرہ ہو تو عوام کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ کنارہ کشی کی کوئی دوسری صورت اختیار کر لیں مثلاً کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں اور ان لوگوں کی طرف التفات نہ کریں، مگر خواص جن کی دین میں اقتداء کی جاتی ہے، ان کے لیے وہاں سے بہر حال اٹھ جانا ہی مناسب ہے۔ (معارف القرآن ۳/۳۷۱)

آگے تحریر فرماتے ہیں: امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ ''اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ہر ایسی مجلس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ یا شریعت اسلام کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں، اور اس کو بند کرنا یا کرانا یا کم از کم حق بات کا اظہار کرنا اس کے قبضہ واختیار میں نہ ہو، ہاں اگر ایسی مجلس میں بہ نیت اصلاح شریک ہوں اور ان لوگوں کو حق بات کی تلقین کریں تو مضائقہ نہیں''۔ اور آخر آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ یاد آ جانے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھو، اس سے امام جصاصؒ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ایسے ظالم، بے دین اور دریدہ دہن لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنا مطلقاً گناہ ہے، خواہ وہ اس وقت کسی ناجائز گفتگو میں مشغول ہوں یا نہ ہوں، کیونکہ ایسے لوگوں کو ایسی بے ہودہ گفتگو شروع کرتے ہوئے دیر کیا لگتی ہے، وجہ استدلال کی یہ ہے کہ اس میں مطلقاً ظالموں کے ساتھ بیٹھنے کو منع فرمایا گیا ہے، اس میں یہ شرط نہیں کہ وہ اس وقت بھی ظلم کرنے میں مشغول ہوں۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں بھی یہی مضمون واضح طور پر بیان ہوا ہے فرمایا ہے: ﴿ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار﴾ یعنی ظالم لوگوں کے ساتھ میل جول اور میلان نہ رکھو ورنہ تمہیں بھی جہنم کی آگ سے پالا پڑیگا۔

جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر ان کی مجلس میں جانے کی مطلقا ممانعت رہی تو ہم مسجد حرام میں نماز اور طواف سے بھی محروم ہو جائیں گے، کیونکہ وہ لوگ تو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں، (یہ واقعہ ہجرت اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے) اور ان کا مشغلہ ہی عیب جوئی اور بدگوئی ہے، اس پر دوسری آیت اس کے بعد والی نازل ہوئی۔ ﴿وما علی الذین یتقون من حسابهم من شیئی ولکن

ذکری لعلهم یتقون﴾ یعنی جولوگ احتیاط رکھنے والے ہیں وہ اگر اپنے کام سے مسجد حرام میں جائیں تو ان شریر لوگوں کے اعمال بد کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں، ہاں اتنی بات ان کے ذمہ ہے کہ حق بات ان کو پہنچادیں کہ شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کر کے صحیح راستہ پر آجائیں (۳/۲/۳۷۲،۳۷۳)

اب آپ کے سوال کا جواب پیش کیا جاتا ہے:

حفاظ قرآن کی دستار بندی کا جلسہ خالص دینی جلسہ ہے، اس میں پنڈتوں کو مدعو کرنا کسی حال میں مناسب نہیں، ہاں! اگر وہ قرآن اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے اور اس سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اپنے دلوں میں اس کا ادب واحترام اور عظمت رکھتے ہیں، جس کا اظہار اپنی زبانوں سے بھی موقعہ بموقعہ کرتے ہیں اور وہ خود ہی اپنی اس تمنا اور خواہش کا اظہار کرتے ہوں کہ قرآن پاک کے اس جلسہ میں ہمیں بھی شرکت کا موقع دیا جائے، تو ایسی صورت میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

جلسہ گاہ میں ان پنڈتوں کی آمد پر ان کا استقبال اور خوب آؤ بھگت کرنا، تو اگر ان سے اسلام اور اہل اسلام کو کوئی فائدہ پہنچا ہے، جس کی قدردانی کے طور پر ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جارہا ہے تو اس کی گنجائش ہے بشرطیکہ علمائے دین کے ساتھ توہین کا معاملہ نہ کیا گیا ہو۔

رہا اہل علم کا ان پنڈتوں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوکر تصویر کشی میں مصلحت دکھا کر شرکت کرنا تو یہ انتہائی مبغوض و مذموم عمل ہے۔ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ تحریر فرماتے ہیں۔ مصلحت کی بناء پر شرعی حکم کو چھوڑنا الحاد اور بے دینی ہے، ایسا کہنے والا فاسق ہے اور آیت قرآنیہ﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً﴾ کا مصداق،

ایسے باطل نظریہ اور الحاد سے توبہ واستغفار لازم ہے۔ (احسن الفتاوی ۸/۱۹۰)

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''یہ حقیقت تو ہر شخص جانتا ہے کہ دنیوی مصلحت ونفع کے لیے گناہ کرنا یا کسی فرض وواجب کو چھوڑنا جائز نہیں، مثلاً کوئی شخص دنیوی نفع کے لیے جھوٹ بولے، دھوکہ دے، نماز نہ پڑھے یا جماعت ترک کردے تو ظاہر ہے کہ ایسا کرنا فسق وحرام ہے، اسی طرح کسی دینی مصلحت کے لیے بھی کسی معصیت کا ارتکاب حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت تمام مصالح پر مقدم ہے، اور ام المصالح ہے، اس پر سب مصالح کو قربان کیا جائے گا۔ مثلا کوئی شخص سینما یا سود کے ذریعہ؛ اس لیے رقم کماتا ہے کہ اس سے دینی مدارس چلا سکے، یا اس نیت سے رقص کراتا ہے کہ لوگ جمع ہوجائیں پھر ان کو وعظ کہا جائے، ایسا کرنا بہت سخت گناہ اور نہایت خطرناک گمراہی ہے۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۳۷)

مزید تحریر فرماتے ہیں۔ ''غرضیکہ کسی مصلحت کی خاطر معصیت کا ارتکاب ہرگز جائز نہیں؛ البتہ شریعت میں بڑے محظور سے بچنے کے لیے چھوٹے محظور کو گوارہ کرلیا جاتا ہے، مثلا کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو ادھر کوئی نابینا کنویں میں گرنے لگا تو نماز توڑ کر اس کو بچانا فرض ہے، حالانکہ عام حالات میں نماز توڑنا گناہ ہے مگر ایک بڑی مصیبت سے بچنے کے لیے اس کو اختیار کرلیا گیا، ایسی صورت میں ''اھون البلیتین''یعنی ضرر عظیم کو دفع کرنے کے لیے کم درجہ کے ضرر کو اختیار کرلیا گیا۔

اس کا فیصلہ کرنا کہ بلیتین میں سے اھون کون سی ہے ہر شخص کا کام نہیں، کیونکہ بسا اوقات انسان اتباع ھوی، عصبیت یا حب مال وجاہ کی بناء پر غیر اھون کو اھون سمجھ لیتا ہے؛ اس لیے یہ فیصلہ صرف وہی کرسکتا ہے جو علوم اسلامیہ میں پوری مہارت کے علاوہ تدین وتقوی میں بھی اعلی مقام رکھتا ہو؛ بلکہ اہم امور میں ایسے علماء کی جماعت کا فیصلہ

ضروری ہے۔''اھون البلیتین'' کے کلیات شریعت نے بیان فرمادئے ہیں، ان کلیات کا پورا احاطہ، ان کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنا، پھر پیش آمدہ جزئیہ کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ یہ کسی کلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر داخل ہے تو کس کلیہ میں؟ ان امور کے لیے علوم دینیہ میں مہارت تامہ، بہت اونچے درجہ کے تدبر و تفقہ اور تدین و تصلب کی ضرورت ہے۔

اگر کسی ناجائز کام کے بارے میں خوب غور وخوض کے بعد یہ محقق ہو جائے کہ اسے ''اھون البلیتین'' قرار دے کر اختیار کیا جاسکتا ہے تو یہ وضاحت بلکہ عمومی حالات میں اس کا بار بار اعلان ضروری ہے کہ یہ کام ناجائز ہے مگر شرعی ضرورت سے اختیار کیا گیا ہے، اگر یہ وضاحت نہ کی جائے گی تو عامۃ المسلمین اس گناہ کو گناہ نہ سمجھیں گے اور جہاں شرعی مجبوری نہ ہوگی وہاں بھی اس کا ارتکاب کرنے لگیں گے۔ اس کی واضح مثال تصویر کھینچوانا ہے، جس کا حرام ہونا متفق علیہ ہے، مگر حکومت نے حج اور شناختی کارڈ کے لیے تصویر کو لازم قرار دیا ہے، اس ضرورت شدیدہ کے تحت علماء نے اس کی اجازت دی ہے مگر اس خاص موقع میں اجازت کے باوجود جس شدت کے ساتھ اس کی حرمت تحریراً و تقریراً بیان کرنا چاہیے تھی، اس قدر نہیں ہوئی، بلکہ بعض علماء کے طرز عمل سے مسلمانوں نے اس گناہ کبیرہ کو جائز سمجھ لیا ہے، کیونکہ ان علماء کی تصاویر لی جاتی ہیں تو وہ روکتے نہیں، اخبارات وغیرہ میں ان کی تصویریں شائع ہوتی رہتی ہیں مگر انھوں نے اس معصیت پر نکیر کا کبھی ایک حرف بھی نہیں کہا، اس سے عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ کوئی گناہ نہیں''۔ (۴۱/۶-۴۲)

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ تصویر کھنچوانا باجماع امت حرام ہے۔ عوام کے مقابلہ میں کسی عالم یا مفتی کا تصویر کھنچوانا کئی وجوہ سے زیادہ شنیع اور قبیح ہے۔

(۱) اہل علم وفہم اور مقربین پر گرفت زیادہ سخت ہوتی ہے۔

(۲) علماء کی معصیت سے عوام معاصی پر جرأت کرنے لگتے ہیں۔

(۳) علماء کی مداہنت سے عوام اس گناہ کو جائز سمجھنے لگتے ہیں۔ (احسن الفتاوی ۸/۱۹۱)

آگے ایک اور جگہ مزید تحریر فرماتے ہیں ''بعض حضرات ایسی جگہ جہاں تصویر لی جارہی ہو شریک ہوجاتے ہیں اور تصویر سے بچنے کے لیے منہ پر کپڑا رکھ لیتے ہیں۔ گناہ سے بچنے کے لیے اتنا کافی نہیں، بلکہ ایسی مجلس سے اٹھ جانا واجب ہے، خواہ یہ دینی اجتماع ہی ہو، بالخصوص یہ شخص مقتدا ہو تو اس کا بیٹھنا اور بھی سخت اور دوہرا گناہ ہے، ایک اپنی برائی کا اور دوسرا عوام کو گناہوں پر جری کرنے کا۔ (احسن الفتاوی ۸/ ۴۳۸۔۴۳۹)

باقی قابل استفسار امور کا جواب پیش خدمت ہے۔

(۱) اوپر اس کا جواب آچکا۔

(۲) حفاظ کی دستار بندی کا اجلاس مسجد کے اندر بھی منعقد کیا جاسکتا ہے۔

(۳) جن کی اسلام دشمنی کھلی ہوئی ہو ان کو مذہبی اجلاس میں بیان کا موقعہ دینا غیرت ایمانی کے خلاف ہے۔

(۴) جواب اوپر آچکا۔ (۵) جواب اوپر آچکا۔

(۶) اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ دو شخصوں یا جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ تعلق کا قلبی موالات یا دلی مودت ومحبت ہے، یہ صرف مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے، غیر مؤمن کے ساتھ مؤمن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

دوسرا درجہ مواسات کا ہے، جس کے معنی ہیں ہمدردی وخیر خواہی اور نفع رسانی کے، یہ بجز کفار اہل حرب کے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہیں، باقی سب غیر مسلموں کے

ساتھ جائز ہے۔

تیسرا درجہ مدارات کا ہے، جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہنچانا ہو، یا وہ اپنے مہمان ہوں، یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو الخ

(ملخصاً از معارف القرآن ۲/۵۰۔۵۱)

(۲) اللہ اکبر کی آواز والی ''ڈور بیل'' کے سلسلہ میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں فتاویٰ رحیمیہ میں لکھا ہے۔''اس بیل کا استعمال جائز نہیں، اس میں اللہ عز وجل کے مبارک اور بے حد قابل عظمت نام کو کسی کو اپنے آنے کی خبر دینے یا کسی کو بلانے کے لیے استعمال کرنا لازم آتا ہے، اور یہ جائز نہیں گناہ کا کام ہے، اس کے اس طرح استعمال کرنے میں اللہ تعالی کے پاک اور مبارک نام کی توہین ہے، لہذا گھر پر یا آفس میں اسے استعمال نہ کیا جائے، اللہ کا مبارک نام خالص ذکر الٰہی کی نیت اور ارادہ سے لینا چاہیے، اپنی کوئی دنیوی غرض پوری کرنے کے لیے اس مبارک نام کو استعمال کرنا بہت ہی نامناسب اور ایمانی غیرت کے منافی ہے'' (۱۰/۳۳۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۲۱/ جمادی الاولی ۱۴۲۶ھ

کمپیوٹر پر ''ڈجیٹل فوٹو گرافی'' (Digital Photography) تصویر سازی کے حکم میں ہے

سوال: میں کمپیوٹر پر فوٹو گرافی، فوٹو مکسنگ (photography, photomixing) کرتا ہوں جو فوٹو گرافر ہوتے ہیں وہ فوٹو کھینچ کر لاتے ہیں، اور ہمیں دیتے ہیں اور ہم لوگ

اسے mixing کرتے ہیں، یعنی کمپیوٹر پر تین یا چار فوٹو جو الگ الگ ہوتے ہیں، انہیں ایک ہی سین (picture) میں لاکر mix کرتے ہیں جسے ہم digital mixing کہتے ہیں، اور کوئی پرانا black&white فوٹو ہوتا ہے اسے colour میں بناتے ہیں، کیا یہ کام شرعاً جائز ہے؟ کیا یہ کام چھوڑ دینا چاہیے یا نہیں؟ اور جس مشین سے فوٹو نکلتا ہے اس مشین کو operating یعنی اس پر کام کرنا یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم فوٹو نہیں کھینچتے تو کیا یہ تصویر سازی ہوگی؟ یہ جائز ہے یا ناجائز؟ یہ کام میں اکیلے نہیں مجھ جیسے کئی مسلمان کرتے ہیں، کیا یہ ان کے لیے ٹھیک ہے؟ کیا اس میں ان کا مال شرعاً حلال ہوگا یا حرام؟ بہت سے مسلمان فوٹو گرافی کرتے ہیں، فوٹو کھینچتے ہیں، کھینچواتے ہیں، آپ فوٹوگرافی جو آج کل مسلمان کر رہا ہے اس کے بارے میں تفصیل سے لکھ کر بتائیے چاہے وہ کیمرہ سے ہو یا کمپیوٹر سے۔

اور میرے لیے تو یہ بہت پیچیدہ اور سنجیدہ معاملہ ہو گیا ہے، مجھے اس کام کے سوا دوسرا اور کچھ نہیں آتا، اور میری اس فلڈ میں پہچان بہت ہے اور کمائی بھی، اور اگر میں دوسرا کام ڈھونڈتا ہوں تو مجھے دوسرے کام میں جمتے وقت لگے گا اور مجھے اتنی income بھی نہیں ہوگی، اگر میں کام چھوڑ کر دوسرا کام سیکھوں یا کروں تو میرے سر پر چار لوگوں کی ذمہ داری ہے جن کی ذمہ داری مجھ پر ہے میری بیوی، نانی اور دو بچے ہیں۔

رہا ایجوکیشن کا سوال تو میں بارہویں ناکامیاب ہوں، کمپیوٹر کا کوئی Diploma ہاتھ نہیں ہے، میں ایک غریب گھر سے ہوں، مجھے یہ جو .D.T.P کا کام کالج کرتے وقت کام کرتے کرتے حاصل ہوا، اب آپ بتائیے کہ میں کیا کروں؟ اگر یہ میری مجبوری ہے تو میری آخرت کا کیا ہوگا، اور اگر اس گناہ کو گناہ سمجھ کر کروں تو میرا حشر کیا ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آنحضرت ﷺ نے بہت سی احادیث میں تصاویر کی حرمت کو بیان فرمایا ہے۔ ایک روایت میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو خود فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت کرتے ہیں (صحیح بخاری، صحیح مسلم) (ماخوذ از آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷/ ۷۸)

آپ کا یہ کام یعنی ڈجیٹل فوٹو گرافی یہ بھی تصویر سازی ہی کی ایک قسم ہے؛ اس لیے شرعاً حرام اور ناجائز ہے، اس کے ذریعہ حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حلال نہیں، آپ کو چاہیے کہ کوئی دوسرا ذریعۂ معاش جو حلال ہو اس آدمی کی طرح تلاش کریں جس کے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہوتا، اور اس کے حاصل ہونے پر موجودہ ذریعۂ معاش کو چھوڑ دیں، اور جب تک دوسرا ذریعۂ معاش نہ ملے اور اس کو اختیار نہ کر لیں وہاں تک موجودہ ذریعۂ معاش کو حرام سمجھتے ہوئے استغفار اور توبہ کا اہتمام جاری رکھیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ   املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

کسی کتاب کا بعض حصہ حذف کر کے یا نام بدل کر شائع کرنا

سوال: ایک اکیڈمی کے پروگراموں میں سے ایک پروگرام علماء حق کی تعلیمات پر مشتمل کتب، رسائل و مضامین کی اشاعت ہے۔ اکیڈمی کی مطبوعات میں سے حجاج کرام کے لیے حضرت مولانا ...... کے تیار کردہ کتابچے: HOW TO PERFORM HAJJ . HOW TO PERFORM UMRAH, HOW TO PERFORM ZIYAARAH. بھی

ہیں، ابھی ایک ادارہ نے اس مجموعہ کو اپنی طرف سے شائع کیا ہے، جس پر ہمیں کوئی اشکال نہیں، البتہ چند امور ہمارے لیے قابلِ تشویش ہیں:

(۱) کتاب کا جو اصل نام تھا (HOW TO PERFORM HAJJ ......) (YOUR COMPLETE GUIDE TO HAJJ AND ZIYAARAH) اس کو بدل کر نیا نام تجویز کیا گیا۔

(۲) مصنف، مؤلف کا پوری کتاب میں کہیں بھی تذکرہ نہیں ہے۔

(۳) مصنف کا پیشِ لفظ اور ایک مفتی صاحب اور ایک بڑے بزرگ عالم کی تقریظ کو بھی حذف کر دیا گیا ہے، مصالحت اور مفاہمت کی کوشش کی گئی؛ لیکن چھپوانے والے صاحب مصر ہیں کہ انھوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ:

(۱) مذکورہ بالا عمل کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟

(۲) کیا یہ عمل علمی دیانت داری کے خلاف ہے؟ اگر یہ سلسلہ چل پڑا تو علمی اور تصنیفی میدانوں میں جو مفاسد اور خرابیاں ہو سکتی ہیں ان پر روشنی ڈالیں۔

(۳) علماء اور قوم کے ذمہ داروں کو کیا کرنا چاہیے؟

(۴) مصنف اور ناشر کو اس صورتِ حال میں کون سے حفاظتی اقدامات کرنے چاہیے؟ اور مستقبل کے لیے کونسی تدبیریں اختیار کرنی چاہیے؟

نوٹ: مسئلۂ تنازع یہ نہیں ہے کہ کتاب کیوں چھپوائی، مطالبہ صرف مذکورہ تین امور کا ہے، مذکورہ بالا مسئلہ کا مدلل اور کافی وافی جواب عنایت فرما کر ہماری رہنمائی اور مدد فرمائیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتباعِ حق کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی مصنف کی کسی کتاب کو جب کوئی ادارہ اس مصنف اور کتاب کے اصلی نام سے اس کی اصلی حالت میں مصنف کی اجازت سے شائع کرتا ہے تو اس کے اس عمل سے کتاب اور مصنف کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان نہیں، اور کتاب و مصنف سے متعلق شائع کرنے والے ادارہ نے خیانت کا ارتکاب کیا ہے، یا اخلاقی یا قانونی تقاضوں کا لحاظ نہیں کیا ہے، ایسا نہیں کہا جا سکتا؛ البتہ اگر مصنف نے کتاب کے حقِ اشاعت کو اپنے ساتھ مخصوص رکھا ہے تو اس صورت میں اس کی اجازت کے بغیر کتاب کی اشاعت کا مسئلہ ہمارے اکابر کے درمیان مختلف فیہ ہے، بعض اکابر اس کو جائز قرار دیتے ہیں، اور بعض عدمِ جواز کے قائل ہیں، جو حضرات عدمِ جواز کے قائل ہیں ان کے مسلک اور فتوی کے اعتبار سے مصنف کی اجازت کے بغیر کتاب کی اشاعت جائز و درست نہیں۔ اور اگر مصنف نے اپنی کتاب کے حقوق اپنے لیے محفوظ و مخصوص نہیں رکھے، تو اس صورت میں دوسروں کا اس کتاب کو شروع جواب میں بتلائے گئے طریقہ کے مطابق شائع کرنا درست ہے" اور اگر شائع کرنے والے نے اصل کتاب میں ایسا تصرف کیا جس سے اصل مضمون خبط ہو جائے یا مقصودِ مصنف کے خلاف ہو جائے یہ کتاب کے ساتھ خیانت ہے، اور اس ترمیم شدہ چیز کو اصل مصنف کی طرف منسوب کرنا افتراء اور خداع ہے، اس کی اجازت نہیں یہ شرعاً بھی ناجائز ہے، اور اخلاقاً اور عرفاً بھی مذموم و شنیع ہے"۔ (ماخوذ از فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۳۸۷)

اور اگر کتاب کو اس کی اصلی شکل میں شائع کیا گیا، اور مصنف کی طرف اس کی نسبت بھی کی گئی؛ لیکن اس (کتاب) کے نام کو بدل دیا گیا تو اگر نام کی یہ تبدیلی مصنف کی اجازت سے کی گئی ہے تب تو کوئی اشکال نہیں، اور اگر مصنف کی اجازت لیے بغیر نام

تبدیل کیا گیا اور نام تبدیل کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے۔ مثلاً پہلے نام کے مقابلہ میں دوسرا نام کتاب میں شامل مضامین کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ہے اور اس چیز کی شائع کرنے والے کی طرف سے وضاحت بھی کردی گئی ہے تب بھی اس کو اخلاقی یا قانونی جرم یا علمی بددیانتی پر محمول نہیں کیا جائیگا، اور اگر نام بھی بدل دیا گیا اور مصنف کا نام بھی حذف کردیا گیا تو چونکہ یہ طریقِ کار عام دستور کے مطابق یہ تأثر دیتا ہے کہ یہ کتاب شائع کرنے والے ادارہ نے اپنی مساعی اور مصارف سے تیار کرواکر لوگوں کے فائدہ کے لیے شائع کی ہے، اور جیسا کہ ظاہر ہے اس میں ایک طرح کا خِداع اور علمی بددیانتی ہے۔

صورتِ مسئولہ میں بھی ہو بہو یہی نوعیت ہے۔ اب آپ کے سوالات کے جوابات بالترتیب پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) ان کا یہ عمل جیسا کہ اوپر تفصیلاً معلوم ہوا درست نہیں۔

(۲) یقیناً یہ عمل علمی دیانتداری کے صریح خلاف ہے، اگر یہ سلسلہ چل پڑا تو اس سے جو مفاسد وجود میں آسکتے ہیں ان کا اس وقت اندازہ لگانا مشکل ہے، ہاں! اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ طریقِ کار بہت سارے مفاسد کو جنم دینے والا ہے۔

(۳) علماء اور قوم کو اس طریقِ کار کی برائی کا برملا اظہار کرنا چاہیے اور ذمہ دارانِ ادارہ سے گفتگو کرکے ان کو اس سے باز رکھنے کی مقدور بھر سعی کرنا بھی مناسب ہے۔

(۴) ناشر اور مصنف کون سے حفاظتی اقدامات کرنا چاہتے ہیں اس کی تفصیل معلوم ہونے پر اس کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۵/محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

کیا چھ (۶) کونے والا اسٹار یہود کا شعار ہے

سوال: آج کل مساجد میں عام طور پر چھ (۶) کونے والے اسٹار (☆) والی ٹوپیاں نمازیوں کے لیے رکھی رہتی ہیں، اون اور دھاگے سے بنی ہوئی، بعض ٹوپیوں میں بھی ایسا اسٹار ہوتا ہے کہنے کی ضرورت نہیں کہ چھ کونے والا اسٹار یہود کا شعار ہے، کیا ایسی ٹوپیاں پہن کر نماز پڑھنے میں یا عام اوقات میں ایسی ٹوپیاں پہننے میں شرعی نقطۂ نظر سے کوئی حرج یا قباحت ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس قسم کے مسائل کی بنیاد حدیث تشبہ (من تشبہ بقوم فھو منہ) ہے، آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے حدیث تشبہ کی تشریح ووضاحت سے متعلق اکابر کا کلام پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں آپ کے سوال کا حل پیش کیا جا سکے، محدث کبیر صاحب اعلاء السنن حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ حدیث تشبہ کی تشریح فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ تشبہ بالکفار کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) فطری امور میں مشابہت: مثلاً کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، لیٹنا، صفائی رکھنا وغیرہ یہ مشابہت حرام نہیں۔ قال فی الدر: فان التشبہ بھم لا یکرہ فی کل شیئ بل فی المذموم و فیمایقصد بہ التشبہ کما فی البحر۔اہ. قال الشامی تحت قولہ لا یکرہ فی کل شیئ فاناناکل و نشرب کمایفعلون۔اہ. (۶۵۲/۱)

(۲) عادات میں مشابہت: مثلاً جس ہیئت سے وہ کھانا کھاتے ہیں اسی ہیئت سے کھانا یا لباس ان کی وضع پر پہننا، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ہماری کوئی خاص وضع پہلے سے ہو اور کفار نے بھی اس کو اختیار کر لیا ہو خواہ ہمارا اتباع کر کے یا ویسے ہی، اس صورت میں یہ مشابہت

اتفاقیہ ہے اور اگر ہماری وضع پہلے سے جدا ہو اور اس کو چھوڑ کر ہم کفار کی وضع اختیار کریں یہ ناجائز ہے، اگر ان کی مشابہت کا قصد بھی ہے تب تو کراہت تحریمی ہے، اور اگر مشابہت کا قصد نہیں ہے بلکہ اس لباس اور وضع کو کسی اور مصلحت سے اختیار کیا گیا ہے، تو اس صورت میں تشبہ کا گناہ نہ ہوگا مگر چونکہ تشبہ کی صورت ہے؛ اس لیے کراہت تنزیہی سے خالی نہیں۔

قال هشام: رأيت على ابى يوسف نعلين مخسوفين بمسامير، فقلت اترى بهذا الحديد بأسا؟ قال: لا، قلت: فسفيان و ثور بن يزيد كرها ذلك لان فيه تشبها بالرهبان، فقال: ان رسول الله ﷺ كان يلبس النعال التى لها شعر وانها من لباس الرهبان فقد اشار الى ان صورة المشابهة فيما تعلق به صلاح العباد لا يضر، فان الارض مما لا يمكن قطع المسافة البعيدة فيها الا بهذا النوع. اه

قلت وفعله عليه السلام محمول على بيان الجواز اذا كان بدون القصد.

مگر چونکہ آج کل عوام جواز کے لیے بہانے ڈھونڈتے ہیں ان کا قصد تشبہ ہی کا ہوتا ہے؛ اس لیے اکثر احتیاط کے لیے عادات میں بھی تشبہ سے منع کیا جاتا ہے خواہ تشبہ کا قصد ہو یا نہ ہو۔

(۳) ان امور میں تشبہ جو کفار کا مذہبی شعار یا دینی رسم اور قومی رواج ہے۔ جیسے زنّار وغیرہ پہننا، یا مجوس کی خاص ٹوپی جو ان کے مذہب کا شعار ہے اس میں تشبہ حرام ہے بلکہ بعض صورتوں میں کفر ہے۔ عالمگیری وغیرہ میں اس کی تصریح ہے۔ (امداد الاحکام ۱/۱۹۴)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم لباس سے متعلق اصول بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں ''چھٹا اصول یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تشبہ بالکفار نہ ہو۔ تشبہ بالکفار کا مطلب یہ ہے کہ قصد اور ارادہ کر کے ایسا لباس پہننا تاکہ میں ان جیسا نظر آؤں

یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ (تقریر ترمذی ۲/۳۳۱)

آگے فرماتے ہیں: جہاں تک کوٹ پتلون پہننے کا تعلق ہے تو چونکہ اب دنیا بھر میں اس کا رواج اور شیوع اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ اب اس میں تشبہ کی شان مغلوب ہوگئی ہے؛ اس لیے تشبہ کی وجہ سے کوٹ پتلون کو حرام کہنا ممکن نظر نہیں آتا؛ البتہ شریعت نے لباس کے جو اصول بیان فرمائے ہیں ان کا پایا جانا ضروری ہے۔ الخ۔

آگے فرماتے ہیں: ''جہاں تک ٹائی کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہمارے طبقے میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ ٹائی درحقیقت صلیب تھی، عیسائی لوگ صلیب لٹکایا کرتے تھے، اب ٹائی کو صلیب کا متبادل بنالیا گیا ہے لیکن مجھے کافی تلاش کے بعد اب تک اس بات کی دلیل اور اس کا کوئی ماخذ نہیں ملا۔ لباس کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ہر لباس کی تاریخ لکھی ہوئی ہے کہ اس لباس کی ابتداء کہاں سے ہوئی، اس میں بھی ٹائی کے بارے میں کوئی مضمون اب تک نظر نہیں آیا؛ اس لیے جب تک اس کی حقیقت معلوم نہ ہو اس وقت تک اس کو نصاریٰ کا شعار قرار دیکر حرام قرار دینے سے میں توقف لسانی کرتا ہوں۔ (تقریر ترمذی ۲/۳۳۲)''

شمائل ترمذی میں امام ترمذیؒ نے حضور اقدس ﷺ کے انگوٹھی پہننے کی کیفیت بیان کرنے کے لیے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں ''یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ انگوٹھی کون سے ہاتھ میں پہننا افضل ہے، خود علمائے حنفیہ میں بھی اختلاف ہے بعض نے بائیں ہاتھ میں پہننے کو افضل بتایا ہے، اور بعض نے دونوں کو مساوی بتایا ہے، شامیؒ نے یہی دو قول لکھے ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے حنفیہ کا ایک قول دائیں ہاتھ کا افضل ہونے کا لکھا ہے لیکن مذہب کے

لحاظ سے راجح وہی قول ہے جو علامہ شامیؒ کی تحقیق ہے، امام نوویؒ نے دونوں میں بلا کراہت جائز ہونے پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ مالکیہ نے بائیں ہاتھ میں پہننے کو افضل بتایا ہے؛ الغرض احادیث سے بھی دونوں فعل ثابت ہے۔ اور علماء بھی ترجیح کے اعتبار سے دونوں طرف گئے ہیں، درمختار میں قہستانی سے نقل کیا ہے کہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی کا پہننا روافض کا شعار ہو گیا ہے؛ اس لیے اس سے احتراز واجب ہے، صاحب درمختار لکھتے ہیں کہ ممکن ہے اس زمانہ میں روافض کا شعار ہو اب نہیں ہے۔ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ سے ''الکوکب الدری'' میں نقل کیا گیا ہے کہ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی چونکہ روافض کا شعار ہے؛ اس لیے مکروہ ہے، حضرت سہارنپوریؒ نے بھی بذل المجہود میں یہی تحریر فرمایا ہے، اور یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ روافض کے کفر میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن ان کے فاسق ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اور فساق کے ساتھ تشبہ سے بھی احتراز ضروری ہے۔ (خصائل نبوی:۵۸،۵۹)

فتاوی محمودیہ سے بھی چند سوال وجواب اس غرض سے نقل کیے جا رہے ہیں کہ تشبہ کی حقیقت واضح اور صاف ہو جائے۔

سوال: کسی ملازمت میں ترقی کا انحصار ٹائی باندھنے پر ہو تو ایسی صورت میں ٹائی باندھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ٹائی ایک وقت میں نصاری کا شعار تھا اس وقت اس کا حکم بھی سخت تھا، اب غیر نصاری بھی بکثرت اسے استعمال کرتے ہیں، بہت سے صوم وصلوۃ کے پابند مسلمان بھی استعمال کرتے ہیں، اب اس کے حکم میں تخفیف ہے اس کو شرک یا حرام نہیں کہا جائے گا کراہیت سے اب بھی خالی نہیں، کہیں کراہیت شدید ہوگی کہیں ہلکی۔ جہاں اس کا استعمال عام ہو جائے وہاں اس کے منع پر زور نہیں دیا جائیگا۔ (فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۴۰۷،۴۰۸)

سوال: تشبہ لباس وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل استفسارات ہیں:

(۱) عورتوں کے لیے پائچا دار پائجامہ اور ساڑی جائز ہے یا نہیں؟ اور موٹی ساڑی پہن کر نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

(۳) کوٹ اور پتلون پہننے والوں اور سر پر انگریزی بال رکھنے والوں کے حق میں اب اس حدیث کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کریگا اس کا حشر اسی قوم کے ساتھ ہوگا۔

الجواب: (۱) جہاں یہ کفار یا فساق کا شعار ہے وہاں ناجائز ہے، جہاں عام ہے ان کا شعار نہیں وہاں جائز ہے، پھر اگر پردہ پورا ہو تو اس سے نماز بھی درست ہے۔

(۳) اب اس میں اتنا تشدد نہیں، اتنا ضرور ہے کہ ان اطراف میں یہ صلحاء کا لباس نہیں ہے اس سے بچنا چاہیے کراہت کا درجہ ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۱۷/ ۳۴۸، ۳۴۹)

سوال: قمیص، پینٹ، کوٹ ان تینوں چیزوں کا پہننا جائز ہے کہ نہیں؟ اگر ان کو پہن کر نماز ادا کریں تو نماز مکروہ ہوگی یا نہیں؟ ان تینوں کا پہننا مطلقا مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر اس میں کراہت ہے تو کس درجہ کی؟ مشابہت قوم سے کیا مراد ہے؟ اگر عام طور پر مسلم ہندو قمیص کو پہنتے ہیں، کسی قوم کا شعار باقی نہ رہا، پھر ان سے تو مشابہت باقی نہیں رہتی ہے، جیسے ساڑی صوبۂ بہار میں ہندو اور مسلم عورتیں عام طور پر پہنتی ہیں، تو ایسی صورت میں ساڑی کا استعمال درست ہے یا نہیں؟

الجواب: جہاں جو لباس کفار اور فساق کا شعار نہ ہو؛ بلکہ عام طور پر صلحاء اور فساق سبھی استعمال کرتے ہوں وہاں اس کو ممنوع نہیں کیا جائیگا، ہاں! لباس مسنون کو اس کے مقابلے میں افضل اور احسن کہا جائیگا، اور جہاں جس قدر شعاریت ہوگی اسی قدر کراہت

ہوگی، اس کلیہ کے تحت اشیائے مسئولہ اور ان کے علاوہ بہت سی اشیاء کا حکم معلوم ہوسکتا ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۱۹/ ۴۳۸۔۴۳۹)

اکابر کی مندرجہ ذیل تحریرات کی روشنی میں عرض ہے کہ چھ کونے والا اسٹار یہود کا شعار ہے تو پہلا سوال یہ ہے کہ ان کا مذہبی شعار ہے یا قومی شعار ہے یا سیاسی شعار ہے؟ یہود کے ساتھ اسلام کا پالا پہلے روز سے ہے، اور ان کی بہت سی چیزوں کا تذکرہ احادیث اور بعد کے اکابر کی کتابوں میں ہے لیکن جس طرح صلیب کے متعلق احادیث اور کتابوں میں تصریح ملتی ہے ایسی کوئی تصریح مذکورہ اسٹار کے متعلق میری نظر سے نہیں گذری، غالباً یہ دور حاضر کے یہود نے اپنی نشاۃ جدیدہ کے بعد اپنے لیے سیاسی نشان کے طور پر مقرر کیا ہے؛ نیز اس کا یہودی شعار ہونا ہماری مسلم بلکہ طبقۂ علماء کی اکثریت کو بھی معلوم نہیں۔ نیز اس کو وہ حضرات اپنے لباسوں میں اس انداز سے جو سوال میں مذکور ہے استعمال نہیں کرتے نیز ہمارے ہندوستان میں یہودیوں کی آبادی بھی کالعدم ہے؛ اس لیے اسطرح کا اسٹار بنی ہوئی ٹوپیاں پہننا زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی کہا جاسکتا ہے، اس سے زیادہ سخت حکم لگانے کے لیے کم از کم میری طبیعت آمادہ نہیں دیگر علماء سے بھی آپ تحقیق فرمالیں۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.　　کتبہ: العبد احمد خانپوری

۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

بجلی چوری کرنے کے مختلف حیلے (ترکیبیں) اور ان کا حکم شرعی

محترم المقام حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حسبِ ذیل سوالات میں شرعی حیثیت سے رہنمائی فرمانے کی درخواست ہے:

بجلی (الیکٹرک) آج گویا انسانی زندگی کا جزء لا ینفک بن گئی ہے، اور انسانی ضروریات کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے جدا ہو کر رہنا ممکن نہیں، حکومت یا حکومت کی ماتحتی میں کام کرنے والی کمپنیاں بجلی بناتی؛ نیز اسے دوسری جگہوں پر بھیجتی ہیں، بجلی حاصل کرنے کے لیے ضروری دستاویز کے ساتھ درخواست دینی پڑتی ہے، اور بجلی کمپنی اپنے مقرر کردہ اصول ڈپازٹ، لائن فیس، وغیرہ وصول کر کے متعین شروط منوا کر گاہک کو بجلی کا کنکشن دے دیتی ہے، بجلی کے استعمال کے حساب کے لیے میٹر لگایا جاتا ہے گھر کے استعمال، کسی کاروبار میں استعمال اور عام استعمال کرنے میں باعتبار یونٹ کے مقاصد کے مختلف ہونے سے الگ الگ قیمت ہوتی ہے۔

بہت سے گاہک بجلی کے بڑے بل سے بچنے کے لیے بجلی چوری کی مختلف صورتیں اپناتے ہیں، بجلی کی چوری قانوناً جرم شمار ہوتا ہے، اور اگر کوئی اس جرم میں گرفتار ہوتا ہے تو اس سے ایک بڑی رقم جرمانہ کے طور پر لی جاتی ہے، اور اگر بجلی کا چوری ہونا یقیناً معلوم ہو جائے تو بجلی کمپنی مقدمہ بھی دائر کر دیتی ہے، اور اخبارات میں بھی بجلی چوری کرنے والے کا نام شائع کیا جاتا ہے اور جرمانہ کی رقم اگر متعینہ مدت میں مجرم ادا نہ کرے تو بجلی کنکشن کاٹ دیا جاتا ہے۔

بجلی چوری کرنے میں گاہک جو مختلف صورتیں اپناتے ہیں ان میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں:

(۱) بلا واسطہ بجلی کے جو تار لگے ہوئے ہیں ان پر تار ڈال کر بجلی حاصل کرنا۔

(۲) بجلی میٹر پر لگے ہوئے سیل (لاک) کو ایک خاص طریقہ سے کھول کر اندر سے میٹر کی موجودہ سسٹم میں تبدیلی کر کے میٹر کو آہستہ چلانا۔

(۳) بجلی کا میٹر کھول کر نمبرات کو پیچھے چلانا (ریورس کرنا)۔

(۴) بجلی کمپنی کے سروس تار میں سے بالا ہی بالا (بائی پاس) چوری کر کے بجلی حاصل کرنا۔

(۵) میٹر کے کانچ میں سے پتلی پٹی اندر ڈال کر میٹر کو بند رکھنا۔

(۶) پرانے میٹر پر مضبوط مقناطیس رکھ کر میٹر بند کرنا۔

(۷) میٹر پر وزنی چیز رکھ کر یا میٹر کو ٹیڑھا یا الٹا کر کے میٹر کو بند رکھنا یا آہستہ کرنا۔

(۸) جدید ریموٹ کنٹرول سے میٹر کو ہاتھ لگائے بغیر پیچھے کرنا (ریورس کرنا)۔

غرض کہ صورت کوئی بھی اپنائی جائے مگر ان سب کا ماحصل یہی ہے کہ کسی طرح بل کم آئے، قانونی طور پر مذکورہ تمام صورتیں سزا یا جرمانہ کو واجب کرنے والی ہیں، اب موجودہ صورت حال میں حسبِ ذیل سوالات کے جوابات شریعت کی روشنی میں دے کر ممنون فرمائیں تاکہ مسلم سماج کو اس کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

سوال: (۱) بجلی کمپنی قیمت زیادہ لیتی ہے، خاموشی سے قیمت میں اضافہ کر دیتی ہے مختلف طریقے اپناتی ہے، ناقص اور تیز پھرنے والے میٹر رکھتی ہے، کچھ نہ کرنے کے باوجود میٹر میں نقص نکال کر جرمانہ عائد کرتی ہے وغیرہ وغیرہ، طرح طرح کے بہانوں کا عذر نکال کر لوگ بجلی چوری کرتے ہیں تو ایسے اعذار اگر واقعۃً سچے ہوں تو کیا بجلی کی چوری کرنا جائز ہے؟

(۲) بجلی لائن میں غیر قانونی طور پر چوری کرنے والے کے ذمہ کمپنی ایک بڑی رقم جرمانہ کی عائد کرتی ہے جس سے انسان کی بے عزتی ہوتی ہے اور وقار مجروح ہوتا ہے تو اس طرح سے ایک مسلمان کو اپنی عزت داؤ پر لگانا جائز ہے؟

(۳) بجلی چوری کرنے میں بعض بجلی کام کو جاننے والے حضرات تعاون کرتے ہیں تو بجلی چوری کرنے میں معاون بننے والے کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟

(۴) بجلی کمپنی کی طرف سے وقتاً فوقتاً بجلی کی چوری کو روکنے کے مقصد سے گاہکوں کے بجلی میٹر کی اچانک جانچ کی جاتی ہے، اس جانچ کرنے والی جماعت پر بہت سی مرتبہ لوگوں کی طرف سے حملہ کیا جاتا ہے، اور جانچ کو روکنے کی کوششیں کی جاتی ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ ''فلانے محلّہ میں جایئے وہاں کیوں نہیں جاتے، فرقہ وارانہ رویہ اپناتے ہو میٹر خراب رکھتے ہو قیمت زیادہ لیتے ہو............ وغیرہ وغیرہ'' تو کیا اس طرح جانچ کو روکنا جائز ہے؟

(۵) اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاں بجلی کا زیادہ استعمال ہوتا ہے وہی بجلی چوری کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، گھر میں بجلی کا استعمال زیادہ ہوگا تو بجلی کے بل کا زیادہ آنا قرین قیاس ہے، اس میں بجلی کمپنی کو زیادہ نقصان ہوتا ہے اس کے باوجود باضابطہ گاہکوں سے وصول کیا جاسکے ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کیوں کہ بجلی کمپنی کے پاس نقصان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے قیمت میں اضافہ کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہوتی تو کیا اس صورت میں بجلی کی چوری کرنا دوسروں کی حق تلفی شمار ہوگی؟

(۶) ایمان دار گاہک عامۃً اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ بجلی کا بے جا استعمال نہ ہو، بجلی چوری کرنے والے گاہک آزادانہ استعمال کرتے ہیں، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بجلی چوری کرنے والے پکانے کے لیے بھی الیکٹرک چولہے کا استعمال کرتے ہیں یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اگر ان کو بجلی چوری کرنے کا موقع نہ ملے تو اس طرح کی ہائی پاور والی اشیاء کا استعمال یہ حضرات خوب احتیاط سے کرنے لگیں، اور بجلی چوری کرنے کا ایک بہت برا پہلو یہ بھی ہے کہ ''ہمیں کہاں بل بھرنا پڑتا ہے؟'' ایسی غیر معقول وجوہات کو آڑ بنا

کر بھی بہت سارے گاہک اس کا بے جا استعمال کرتے ہیں، بجلی کمپنی والوں کو اس میں دو گنا نقصان ہوتا ہے کیوں کہ بجلی کے بیچنے کا بجلی کمپنی والوں کو کوئی نفع نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے برخلاف بجلی کمپنی والے ''بجلی بچاؤ'' کا اعلان کرتے ہیں اور حتی الامکان بجلی کا کم سے کم استعمال کرنے کی گاہکوں کو ہدایات اور مشورے دیے جاتے ہیں، تو اس طرح سوچ کر بجلی کا آزادانہ استعمال کرنے والے شخص کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اللہ کی نعمت کی ناقدری نہیں ہے؟

(۷) بجلی کمپنی کے قوانین کے بموجب بجلی کنکشن حاصل کرتے وقت اپنا استعمال کتنا رہے گا؟ اس کی تفصیل فارم میں درج کرنی ہوتی ہے اور اسی کے مطابق ڈپازٹ وصول کی جاتی ہے، اگر آپ زیادہ استعمال لکھیں تو زیادہ ڈپازٹ بھرنی پڑتی ہے، بجلی کمپنی کے قوانین کے موافق مانگی گئی بجلی سے زیادہ استعمال کرنا جرم شمار ہوکر جرمانہ لازم ہونے کا ذریعہ بنتی ہے، چاہے اس بجلی کو استعمال کرنے میں کوئی غیر قانونی طریقہ نہ اختیار کرے اور تحمل سے زیادہ بوجھ پڑنے کے باعث بجلی کمپنی کو لاکھوں روپیے ڈپازٹ کا نقصان بھگتنا پڑتا ہے، اور ٹیکنیکل کا ٹرانسفرمر کی طاقت، کیبل کے تحمل وغیرہ امور کا پروگرام بنانے میں مشکلیات پیدا ہوتی ہیں، مشینیں ہائی وولٹیج اور تحمل سے زیادہ بوجھ کی بنا پر جل جایا کرتی ہیں، وولٹیج آہستہ ہونے کی وجہ سے تمام حضرات کو تکلیف ہوتی ہے گاہکوں کی یہ دلیل ہوتی ہے کہ ہم جتنا چاہے بوجھ ڈالیں بجلی کی چوری تو نہیں کرتے، میٹر تو اتنا استعمال کرنا بتلا ہی دیتا ہے پھر گناہ کس بات کا؟ تو کیا قاعدہ کے موافق ڈپازٹ اور فیس (چارج) ادا کیے بغیر مزید بوجھ ڈال کر بجلی کا استعمال کرنے کی شرعاً گنجائش ہے؟

(۸) بجلی چوری کے مجرمین پکڑے جانے پر جرمانہ سے بری ہونے کے لیے

خوب ہاتھ پیر مارتے ہیں، اور کمپنی کے ملازم کو رشوت دے کر جرمانہ سے بچنے کی کوششیں کرتے ہیں، تو جرمانہ سے بچنے کے لیے رشوت دینا جائز ہے؟ رشوت لے کر گاہک کو بجلی چوری کا جرمانہ نہ عائد کرنے والے یا کم جرمانہ عائد کرنے والے ملازم کے متعلق شرعی کیا حکم ہے؟ کیا وہ خائن شمار ہوگا؟

(۹) بجلی کی چوری ثابت ہو جائے تو بجلی کمپنی چاہے گاہک تین سال سے چوری کر رہا ہو، یا تین دن سے چوری کر رہا ہو، تین مہینہ سے چوری کرنا شمار کرتی ہے، اس کے بعد آخری تین ماہ کا استعمال دیکھا جاتا ہے اور گاہک کے استعمال میں آنے والی اشیاء کو دیکھ کر انداز لگا لیا جاتا ہے کہ اتنی چیزوں کے استعمال پر تین ماہ میں کتنا بل آسکتا ہے اور گاہک کا میٹر کتنا بتا رہا ہے؟ جو فرق ہوگا اسے چوری میں شمار کیا جائے گا، اس کے بعد چوری کے ہر یونٹ کی قیمت عام قیمت سے تقریباً ڈھائی گنا زیادہ کر کے جرمانہ کا بل دیا جاتا ہے، ان حالات میں اس شخص کی جو تین ماہ سے کم مثلاً ۱۰، ۱۵ دن سے استعمال کر رہا ہے مخالفت کا اندیشہ ہے تو ایسا گاہک جرمانہ کی رقم نہ بھرے تو اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

بجلی روزمرہ کی زندگی کے ساتھ لازمی ایک ضرورت کی چیز بن چکی ہے، مذکورہ بالا سوالات کے جوابات مسلم معاشرہ کو شریعت کی روشنی میں ملنے از حد ضروری ہے، کیوں کہ مسلم معاشرہ میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد بجلی چوری کے جرم میں مبتلا ہیں، ایک ضلع کے ایک گاؤں میں مسلم معاشرہ بجلی چوری کرنے کے سلسلہ میں اتنا بدنام ہو چکا ہے کہ کئی مسلم علاقوں میں بارہ بارہ گھنٹوں تک بجلی کاٹ دی جاتی ہے، ٹرانسفر مر بھی ہٹا دیا جاتا ہے، بجلی جانچ کرنے والی جماعت پولس کی حفاظت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتی، لوگ اسے ''قومی تعصب'' سے بدنام کرتے ہیں مگر ان مسلم علاقوں میں ایک بہت بڑی مقدار

میں لوگوں کا بجلی کی چوری کرنا ایک تلخ حقیقت ہے جس کا انکار نہیں ہوسکتا تو بجلی کی چوری کرنا کہاں تک جائز ہے؟

اس کا جواب مذکورہ بالا سوالات کی روشنی میں دے کر ممنون فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہترین بدلہ نصیب فرمائے۔ سوال بہت طویل ہو چکا ہے معاف فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

چوری اسلام میں بہت ہی سخت گناہ کا کام ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، جس طرح کسی کی ذاتی ملکیت میں سے چوری کرنا گناہ ہے اسی طرح ملک اور قوم کی مشترکہ چیز میں سے چوری کرنا بھی گناہ کا کام ہے بلکہ کئی حیثیت سے یہ چوری زیادہ سنگین ہوجاتی ہے کیوں کہ ایک آدمی سے معاف کرانا تو ممکن بھی ہے؛ جب کہ پوری قوم سے معاف کرانے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ (ماخوذ از آپ کے مسائل اور ان کا حل ۲۸۴/۸،۲۸۵)

آدمی کسی بھی ملک میں رہتا ہو اور کوئی بھی حالت ہو مسلمان کو حرام کاموں سے بچنا واجب ہے، قرآن اور حدیث سے چوری کی حرمت ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے حرام ہونے پر پوری امت کا اتفاق بھی ہے، اس حرام کو حلال کرنے کی شکلیں اختیار کرنا مسلمان کا کام نہیں ہے، امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان جہاں کہیں بھی ہو، احکام اسلام کا پابند ہے۔ (فتاویٰ قاضی خان ۲۲۲،۲۲۳)

اسی طرح سے خیانت اور غصب نیز بغاوت بھی شرعاً سخت گناہ کا کام ہے، اس سے بچنا مسلمان کے لیے واجب ہے۔

اب آپ کے سوالات کے جوابات ترتیب وار دیے جاتے ہیں:

(۱) سوال میں مذکور وجوہات اور بہانوں کو عذر بنا کر بجلی کی چوری کرنا جائز نہیں ہے، سوال میں مذکور اعذار اگر واقعۃً سچے ہوں تو اس کے لیے سرکاری اور قانونی رو سے جو کاروائی ہو سکتی ہو کی جاوے، کورٹ یا گاہک سرکشا منڈل (گاہک کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کا ادارہ) وغیرہ جس طریقہ سے بھی اس کا حل ہو سکے اس کی اجازت ہے مگر بجلی کی چوری کرنا جائز نہیں ہے۔

ابتداءِ اسلام میں جانوروں نیز دیگر اموال کی زکوۃ وصول کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے آدمی مقرر کیے جاتے تھے وہ بعض مرتبہ واجب شدہ زکوٰۃ سے زائد وصول کرتے تھے، تو اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے ہم پر ظلم کرتے ہیں، (یعنی جتنی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس سے زائد وصول کرتے ہیں) تو کیا ہم ہمارے مال میں سے اتنا مال چھپا سکتے ہیں جتنی مقدار میں وہ ہمارے پاس زائد وصول کرتے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا کہ ”نہیں“۔

وعن بشير بن الخصاصية قال: قلنا ان اهل الصدقة يعتدون علينا افنكتم من اموالنا بقدر ما يعتدون؟ قال: لا. رواه ابو داؤد (مشكوٰة ص/۱۵۷)

(۲) ایک مسلمان کے لیے ایسا کام کرنا جس سے اس کی عزت داؤ پر لگے جائز نہیں ہے، شرعی حدود میں رہ کر اپنی عزت کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔

(۳) اس طرح سے بجلی چوری کرنے میں کسی مسلمان الیکٹریشن (الیکٹرک کام جاننے والا) کا معاون بننا شرعاً گناہ کا کام ہے، قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان ﴾ ترجمہ: گناہ اور نافرمانی کے کاموں میں معاون نہ بنو۔

(۴) اس طرح سے جانچ کو روکنا بھی شرعاً سخت گناہ ہے۔

(۵) جی ہاں! سوال میں مذکور نظریہ کے موافق بجلی چوری کرنا دوسروں کی حق تلفی شمار ہوگی۔

(۶) واقعۃً سوال میں مذکور حرکت کرنے والے اشخاص شرعاً سزا کے مستحق ہیں۔

وضو جیسی عبادت میں پانی کو زیادہ استعمال کرنا (مثلاً وضو میں اعضاء مغسولہ میں سے کسی عضو کو تین بار سے زائد دھونا وغیرہ) شرعاً مکروہ تحریمی ہے، جب کہ پانی اپنا ذاتی ہو چاہے نہر کے کنارہ ہی کیوں نہ ہو؟ (جیسا کہ ابن ماجہ شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے قریب سے گزر رہے تھے وہ وضو فرما رہے تھے، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ فضول خرچی کیسی؟ تو انھوں نے دریافت کیا کہ کیا وضو میں بھی فضول خرچی ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا جی ہاں! چاہے آپ جاری نہر پر وضو کر رہے ہوں) اور اگر وہ پانی وقف کا ہو تو اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ (درمختار شامی ۱/ ۹۷، ۹۸)

اس سے زیادہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے قوم کی ملکیت کی چیز چوری کر کے استعمال کرنا کتنا سخت گناہ کا کام ہے۔

(۷) بجلی کمپنی سے کنکشن لیتے وقت کمپنی کی طرف سے جو شرطیں مقرر کی گئی ہیں ان کی پابندی کرنا ضروری ہے، یہ ایک طرح کا عہد و پیمان ہے اور عہد و پیمان کو نبھانا اسلامی احکام کے بموجب ضروری اور فرض ہے، عہد شکنی کرنا کبیرہ گناہ ہونے کے ساتھ ساتھ منافق کی نشانی بھی بتلائی گئی ہے، بجلی کمپنی کے پاس سے مانگے گئے بوجھ سے زیادہ بوجھ کا استعمال کرنے سے بجلی کمپنی کو ڈپوزٹ کے نقصان کے ساتھ ساتھ اور کئی نقصانات ہوتے ہیں جن کی تفصیل آپ نے سوال میں درج کی ہے، شرعاً یہ تمام باتیں گناہ اور قابل

مذمت ہیں، گاہکوں کی طرف سے دی جانے والی دلیل صحیح نہیں ہے، گناہ کا ارتکاب بجلی چوری میں منحصر نہیں ہے، صورت مسئولہ میں اگر چہ میٹر پورے استعمال کو بتا دیتا ہے جس کی وجہ سے بجلی کی چوری کا گناہ تو نہیں ہوتا مگر بجلی کمپنی کو سوال میں درج کیے گئے نقصانات پہونچانے کے گناہ کے ساتھ ساتھ عہد شکنی کا کبیرہ گناہ بھی عائد ہوتا ہے، ویسے بھی کسی چیز کو اس کے استعمال کے صحیح طریقہ کو چھوڑ کر غلط طریقہ سے استعمال کرنا جس کے نتیجہ میں وہ چیز خراب ہو جائے اپنی ذاتی ملکیت ہونے کے باوجود شرعاً ممنوع ہے تو اگر وہ چیز دوسرے کی خصوصاً عوامی ملک ہو تو یہ ممانعت اشد ہو جاتی ہے۔

حدیث شریف میں چمڑے کے مشکیزہ کا منہ موڑ کر اس سے پانی پینے کی ممانعت آئی ہے، اس کی وجوہات بتلاتے ہوئے شراحِ حدیث نے ایک وجہ یہ بھی بتلائی ہے کہ اس طرح سے مشکیزہ کا منہ موڑ کر پانی پینے سے کچھ ہی مدت میں وہ ٹوٹ جاتا ہے اور پھر وہ مشکیزہ استعمال کے قابل نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ طریقہ چیز کو خراب کرنے والا ہے، اس وجہ سے ایسا طریقہ اپنانے سے روکا گیا۔ (بخاری شریف ص/۸۴۱ نیز حاشیہ) کئی احادیث میں ایک جانور پر تین یا اس سے زیادہ آدمیوں کے سوار ہونے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ لکھی گئی ہے کہ یہ ممانعت اس وقت ہے جب کہ وہ جانور تین یا اس سے زائد کا تحمل نہ کر سکتا ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی چیز سے اس کے تحمل سے باہر کام لینا چاہے وہ غیر ذی روح ہو یا جانور ہو شریعت اسے پسند نہیں کرتی۔

(۸) بجلی چوری کرنے والا مجرم گاہک اپنے پر لازم ہونے والے جرمانہ سے بچنے کے لیے کمپنی ملازم کو رشوت دیتا ہے تو یہ سخت گناہ کا کام ہے، اور ملازم کا بھی رشوت

لے کر اس شخص کو سزا سے بچا لینا اپنی ذمہ داری کے ادا کرنے میں ایک طرح کی خیانت ہے۔

(۹) گاہک نے آج تک جو بجلی چوری کی ہے اس کی رقم ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہے، بجلی چوری کرنے کی صورت میں اس طرح سے رقم وصول کی جائے گی اس کی وضاحت بجلی کمپنی کی طرف سے ہو جانے کے باوجود گاہک کا بجلی چوری کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بجلی کمپنی کی طرف سے متعین کردہ اس طریقہ پر رضامند ہے اس کے باوجود اگر وہ رقم ادا نہیں کرے گا تو وعدہ خلافی ہوگی۔

اخیر میں آپ نے مسلم معاشرہ کے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا اس گناہ میں مبتلا ہونے کے متعلق جو تلخ حقیقت لکھی ہے، اور اس کی وجہ سے اسلام اور اسلامی احکام کی جو غلط شبیہ غیر مسلموں کے سامنے آتی ہے، اس سے نبی کریم ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات اور اسلامی شکل وصورت جس طرح سے بدنام ہو رہی ہے، اور اس سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کا تو بس صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے، ہمارے یہ کام اور ہماری یہ بدعنوانیاں ہی اسلام کے مخالفین اور دشمنوں کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/ ۸/ ۱۴۲۶ھ مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک، ضلع نوساری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک، ضلع نوساری

موبائل کی گھنٹی کا بٹن بند کیے بغیر مسجد کی جماعت میں شرکت، موبائل کھلا (آن) رکھ کر مسجد میں آنا

سوال: بہت سے حضرات مسجد میں فرض نماز کے وقت بھی موبائل سوئچ آف نہیں کرتے، جس کی وجہ سے دوران نماز موبائل کی گھنٹی (جو میوزک ٹون میں بھی ہوتی ہے) بجتی رہتی ہے اس صورت حال کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نماز کے اوقات میں مسجد میں کوئی بھی ایسا فعل جو مصلیوں کی نماز میں مخل ہو جائز نہیں ہے اگر چہ وہ دینی کام کیوں نہ ہو۔ مثلاً نماز کے وقت جہراً تلاوت یا ذکر کرنا، بآواز بلند کتاب پڑھنا وغیرہ افعال، امور دین اور کارہائے ثواب ہیں پھر بھی؛ اس لیے ناجائز ہیں کہ ان سے مصلیوں کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے، آپ سوچ سکتے ہیں کہ دوران نماز مذکورہ امورِ دین اور کارہائے ثواب کی بھی اجازت نہیں دی گئی تو پھر نماز باجماعت جاری ہونے کی حالت میں کسی کے موبائل سے بلند آواز میں میوزک بجنے لگے اس کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے؟

خصوصاً اس لیے بھی کہ احادیث پاک میں میوزک کے بارے میں سخت وعیدیں مذکور ہیں۔ زمین میں دھنسا دینے، اور انسانی چہرے مسخ کر دیے جانے تک کی سخت وعیدیں اس برے فعل پر وارد ہوئی ہیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی بعثت کا اہم مقصد راگ اور باجوں کو ختم کرنے کا ذکر کیا ہو، ایسی حالت میں کسی امتی کا اپنی جیب میں ایسے آلہ کو کھلا (on) رکھتے ہوئے مسجد میں آنا اور نماز میں شامل ہونا پھر اس گھنٹی کی وجہ سے پوری مسجد کے مصلیوں کی نماز کے خراب ہونے کا اندیشہ لاحق ہو تو پھر یہ فعل کتنا برا اور قابلِ مذمت ہے یہ سمجھا جا سکتا ہے؛ لہذا جو حضرات اس طرح دانستہ یا نادانستہ نمازیں خراب کرنے کے گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں انھیں خوب غور و فکر کرنا چاہیے کہ وہ حضرات اس طرح مسجد میں آ کر اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں یا برباد کر رہے ہیں؟

مصلی کے سامنے سے گزرنے کی ممانعت جو حدیث پاک میں مذکور ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ سامنے سے گزرنے کی وجہ سے مصلی کا دھیان نماز سے ہٹ جاتا ہے

نبی کریم ﷺ کاارشادگرامی ہے:

عن بشر بن سعد قال: ارسلنی ابو جهم الی زید بن خالد أسأله عن المار بين يدى المصلى، فقال: لو يعلم المار بين يدى المصلى ماذا عليه لكان أن يقوم أربعين خريفا خيرا له من ان يمر بين يديه.

ترجمہ: نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو اگر معلوم ہو جائے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے تو چالیس سال وہاں کھڑا رہنا اسے گزر جانے کے مقابلہ میں آسان معلوم ہو۔ (کشف النقاب ۳۰۱/۵)

عن يزيد بن نمران قال: رأيت رجلا مقعدا فقال: مررت بين يدى النبی ﷺ وانا على حمار وهو يصلى فقال: اللهم اقطع اثره، فما مشيت عليها.

ترجمہ: یزید ابن نمران فرماتے ہیں کہ میں نے ایک اپاہج آدمی کو دیکھا جس نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نماز ادا فرمارہے تھے، اور میں گدھے پر سوار آپ ﷺ کے سامنے سے گزر گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! اس کے نشان قدم کو ختم کردے میں اسی وقت سے چلنے سے عاجز ہوں۔ (۳۰۰/۵)

رجل من اهل الطائف قال: جاء كلب والنبی ﷺ يصلى بالناس صلاة العصر ليمر بين ايديهم فقال: رجل من القوم اللهم احبسه، فمات الكلب فلما انصرف النبی ﷺ قال: ايكم دعا عليه؟ قال الرجل: أنا يا رسول الله! فقال النبی ﷺ: لو دعا على امة من الامم لا ستجيب له.

ترجمہ: ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ عصر کی نماز میں امامت فرمارہے تھے، اس درمیان میں ایک کتا آیا جو سامنے سے گزرنا چاہتا تھا نمازیوں میں کوئی بول پڑا کہ اے اللہ! اسے

روک دے، چنانچہ وہ کتا وہیں مر گیا، نماز سے فارغ ہو کر نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کس نے اس کے لیے بددعا کی تھی؟ ایک صاحب نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میں نے، حضور ﷺ نے اس پر فرمایا کہ اگر ایک پوری قوم کے لیے بددعا کی جاتی تو وہ بھی قبول ہو جاتی۔ (۳۰۰/۵)

مذکورہ احادیث پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے، ایک آدمی مصلی کے سامنے سے خاموش گزر جاتا ہے پھر بھی اس کے لیے اتنی سخت وعیدیں ہیں، کیوں کہ اس طرح گزرنے سے بھی مصلی کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے تو پھر جو حضرات اپنا موبائل کھلا (آن) رکھ کر نماز میں شامل ہوتے ہیں اور پھر دوران نماز ان کا موبائل شیطانی آواز یعنی میوزک بجا کر پوری مسجد کے مصلیوں کی نماز میں خلل انداز ہوتا ہے تو ایسے آدمی کو کیا کچھ نہیں کرنا چاہیے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے کسی بندے کی زبان سے کوئی بددعا نکل جائے اور ایسے آدمی کی ہلاکت کا سبب بن جائے۔

دنیا کے تمام شاہی درباروں اور عدالتوں کے خاص خاص آداب مقرر ہوتے ہیں، جن کو ہر شخص جانتا ہے چونکہ مسجد تمام بادشاہوں کے پیدا کرنے والے کا عظیم الشان دربار ہے؛ اس لیے اس کے بھی کچھ آداب ہیں، جو اس دربار کے ناظم یعنی نبی کریم ﷺ نے ہم کو سکھائے ہیں، ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ ان کو معلوم کر کے ان کے موافق چلنے کی کوشش کرے۔ (آداب المساجد ۲۶)

بعض بزرگان سلف سے نقل کیا جاتا ہے کہ جب وہ مسجد کے دروازے پر پہنچتے تھے تو بوجہ خوف ان کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ لوگ جب دنیا کے کسی حاکم کے دربار میں جاتے ہیں، تو ان پر اس کا رعب چھا جاتا ہے اور ڈرتے ہیں کہ

کوئی بات عدالت کے آداب اور حاکم کی شان کے خلاف نہ ہو جائے، تو کیا میں احکم الحاکمین کے دربار کی اتنی بھی وقعت نہ کروں جتنی ایک ادنی حاکم کی کی جاتی ہے، اس خوف سے میرا رنگ زرد ہو جاتا ہے کہ کہیں اس دربار کی شان کے خلاف کوئی بات صادر نہ ہو جائے۔ (آداب المساجد ۳۰)

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نماز میں تھے ایک شخص آیا جو کچھ لیے ہوئے تھا اس کو صف کے آگے ڈال دیا اور خود نماز میں شریک ہو گیا (جیسا کہ آج کل عموماً کیا جاتا ہے) فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب نماز سے فارغ ہوئے تو اس کو سزا دی کہ تو نے نمازیوں کو تشویش میں ڈالا۔ (کتاب الاعتصام للشاطبی)

اس حکایت کو نقل فرمانے کے بعد حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ رقم طراز ہیں کہ:

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کو نمازیوں کے آگے اس طرح ڈالنا یا اٹھانا کہ ان کی توجہ اس کی طرف پھر جائے برا ہے؛ لیکن اگر بضرورتِ حفاظت اپنے ضروری سامان کو آہستہ سے اس طرح سامنے رکھ دے کہ نمازیوں کو تشویش نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ (آداب المساجد ۴۰)

مذکورہ واقعہ میں اس شخص نے اپنا سامان آہستہ رکھنے کے بجائے ڈال دیا جس کی آواز سے مصلیوں کی نماز میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی بنیاد پر اس کو سزا دی۔

جو حضرات اپنا موبائل کھلا (آن) رکھ کر مسجد میں آتے ہیں اور دورانِ نماز ان کا موبائل بجنے لگتا ہے تو اس سے مسجد میں موجود تمام مصلیوں کی نماز میں جو شدید خلل واقع ہوتا ہے اس سے کوئی ناواقف نہیں ایسا شخص کتنی سخت سزا کا مستحق ہوگا یہ سوچا جا سکتا ہے۔

اگر موبائل کا رنگ ٹون سادہ گھنٹی کی آواز میں ہو تو اس کی برائی کا اندازہ بھی نبی

کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے ہوسکتا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''سفر کے ایسے رفقاء (اور قافلہ) جن کے ساتھ کتا یا گھنٹی ہو فرشتے ان کے ہمراہ نہیں چلتے'' (مسلم شریف) ایک اور حدیث میں ہے ''گھنٹی شیطان کی بانسری ہے''۔ (ابوداؤد)

گھنٹی کی آواز جس میں کوئی کشش نہیں ہوتی اس کے بارے میں بھی نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات ہوں تو پھر آج کل موبائل میں جس قسم کے ٹونس (Tones) عام ہو رہے ہیں، اس سے تو میوزک جیسی حرام چیز کی ترویج اور اشاعت ہورہی ہے، قرآن کریم کی سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ شیطان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿واستفزز من استطعت منهم بصوتك﴾ ''تو اپنی آواز کے ذریعہ جس کو چاہے بہکا لے''۔ امام ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اس آیت میں شیطانی آواز سے گانا بجانا مراد ہے، امام مجاہدؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ابلیس! تو انھیں کھیل، تماشوں اور گانے بجانے کے ساتھ مغلوب کر، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس آیت میں ہر وہ آواز مراد ہے جو اللہ کی نافرمانی کی طرف دعوت دے یہی قول حضرت قتادہؒ کا ہے اور اسی کو ابن جریرؒ نے اختیار فرمایا ہے۔

حافظ ابن قیمؒ اسی کے ذیل میں فرماتے ہیں: اور سب کو معلوم ہے کہ معصیت کی طرف دعوت دینے والوں میں گانا بجانا سب سے بڑھ کر ہے، اسی وجہ سے ''شیطان کی آواز'' کی تفسیر اس کے ساتھ کی گئی۔ (احسن الفتاویٰ ۳۸۱/۸)

بخاری شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''میری امت میں کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور راگ باجوں کو حلال قرار دیں گے''۔

آج کل موبائل کے مختلف ٹون (tone) کے معاملہ میں جس طرح کی غفلت

اور چشم پوشی کرتے ہیں اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کے ٹون (tone) کو حلال سمجھتے ہیں۔

مسند احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں روایت ہے حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو راہ چلتے ایک گدڑریے کی بانسری کی آواز سنائی دی تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور راستہ سے ایک طرف ہٹ کر چلنے لگے، اور مجھ سے بار بار پوچھتے کیا بانسری کی آواز تمھیں سنائی دے رہی ہے؟ میں جواب دیتا جی ہاں! اسی طرح انگلیاں کانوں میں دیے چلتے رہے حتی کہ میں نے کہا: اب آواز نہیں آرہی ہے تب انگلیاں کانوں سے ہٹائیں اور راستہ چلنے لگے پھر فرمایا: ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی بعینہ یہی واقعہ پیش آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کانوں میں انگلیاں دے لیں اور یہی عمل فرمایا۔ (احسن الفتاویٰ ۸/۳۸۳)

سوچنے کا مقام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شیطانی آواز کو لمحہ بھر سننا گوارا نہ فرمایا، آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اس پر اس درجہ فریفتہ ہیں کہ انھیں لمحہ بھر اس کی جدائی گوارہ نہیں، نماز کے لیے مسجد میں آتے ہیں تو اس وقت بھی موبائل کھلا رکھ کر مسجد جیسے مقدس مقام کو اس طرح کی شیطانی آواز کے ذریعہ خراب کرنے کی حرکت کر بیٹھتے ہیں۔

نماز کے لیے مسجد میں آنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی تمام تر دنیاوی مصروفیات سے منقطع ہو کر مقررہ وقت تک اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرے، اسی لیے ہر وہ کام جو نماز سے توجہ ہٹانے والا ہو جائز نہیں ہے، کسی کو اگر قضائے حاجت کا تقاضا ہو تو اس حال میں نماز ادا کرنا مکروہ تحریمی اور بحکمِ حدیث ممنوع ہے کیوں کہ ایسی حالت میں نماز پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص ظاہری حالت میں تو نیت کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہے مگر در حقیقت اس کا دل اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ نہیں۔

اسی طرح نماز کی ادائیگی کے لیے جو پیشگی تیاریاں شریعت نے لازم قرار دی ہیں، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان جب ادائیگی فرض کے لیے کھڑا ہو تو مکمل طور پر نماز میں مگن ہو جائے، اور اسی لیے فرض نماز سے قبل کچھ سنتیں بھی رکھی گئیں؛ تاکہ سنت کے ذریعہ یک گونہ تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جائے اور اس کے بعد فرض نماز اس حالت میں ادا ہو کہ اس کا دل تمام علائق سے مکمل طور پر منقطع ہو کر اللہ کی جانب متوجہ ہو چکا ہو۔

اس اہتمام کا تقاضا یہ تھا کہ موبائل کو اپنے ساتھ مسجد میں ہی نہ لایا جائے؛ لیکن اگر یہ حکم دیا جائے تو ایسے آدمی کو دشواری لاحق ہو جاتی جو سفر میں ہو یا جو گھر سے دیگر ضرورت سے موبائل لے کر نکلا ہو چنانچہ بند (آف) حالت میں تو موبائل مسجد میں لے جانا ممنوع نہیں؛ لیکن کھلا (آن) موبائل مسجد میں لے جانا نماز کے لیے مسجد میں جانے کے مقصد کے بالکل خلاف ہے؛ لہذا موبائل استعمال کرنے والے تمام حضرات کے لیے ضروری ہے کہ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنا موبائل بند کرلیں، اور جو حضرات عمداً موبائل کھلا (آن) رکھ کر مسجد میں آتے ہیں وہ گنہ گار اور قابلِ مذمت ہیں۔

اگر کوئی شخص پہلے سے موبائل بند کرنا بھول گیا، اور دورانِ نماز گھنٹی بجنے لگی تو عملِ کثیر کے بغیر گھنٹی بند کرنا ممکن ہو تو بند کر دی جائے؛ لیکن اگر اس کے لیے عمل کثیر کا ارتکاب کیا گیا تو اس طرح موبائل بند کرنے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

عملِ کثیر کسے کہتے ہیں؟ اس بارے میں راجح قول یہ ہے کہ ہر وہ کام جس کے کرنے والے کو دور سے دیکھنے والا شخص سمجھے کہ یہ شخص نماز میں نہیں وہ عملِ کثیر ہے، اور اگر وہ حرکت اتنی زیادہ نہ ہو تو عمل قلیل ہے، جس سے نماز فاسد نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/۲/ ۱۴۲۶ھ

ایک تبلیغی مقرر صاحب کا واقعۂ شاہِ ہرقل سے غلو آمیز استدلال کا جواب

سوال: حیات الصحابہ مؤلفہ حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ کے حوالہ سے ایک صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا کہ شاہِ ہرقل کا جس میں چند اصحاب ﷺ بادشاہ کے پاس بغرض دعوت اسلام حاضر ہوتے ہیں، اور آگے یہ کہ بادشاہ انھیں ایک بکس میں سے چند تصاویر دکھلاتا ہے جو انبیاء کرام کی تھیں، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کی تصویر بھی دکھلائی اور آپ کی رسالت کا اقرار بھی کیا، اور اخیر میں اسلام لانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ کے یہاں اپنے غلام سے جو سب سے زیادہ بدتر سلوک کرے، میں اس کا بدتر غلام بننے کو تیار ہوں؛ لیکن اسلام لانے کو تیار نہیں، آگے سلسلۂ کلام میں حضرت موصوف (مقرر صاحب) نے فرمایا کہ یعنی اس پر اسلام واضح ہو چکا تھا اور وہ جانتا تھا……یہی حق ہے اور اس پر علامات واضح ہو چکی تھیں پھر بھی اس نے اسلام لانے سے انکار کر دیا، (چوں کہ وہ موقعہ ہمارے محلّہ کی مسجد کی ہفتہ واری گشت کے بعد عمومی بات کا تھا؛ اس لیے موقع کی مناسبت سے تبلیغی کام کی ترغیب دیتے ہوئے) آگے حضرت موصوف نے سلسلۂ کلام میں فرمایا ''معلوم ہوا کہ کسی کام کو صرف حق جاننا اور صحیح سمجھنا کہ یہ کام صحیح ہے یا بہت اچھا ہے یہ نجات کے لیے کافی نہیں ہے، یا یہ ہدایت نہیں، جیسا کہ آج امت کا ایک بہت بڑا طبقہ اور ہم میں سے بہت سے لوگ اس دعوت کے کام کو حق سمجھتے ہیں؛ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ نکلو تو……اب کیا کہا جائے''۔ براہِ کرم بتلاویں کہ حضرت موصوف کا مذکورہ بالا واقعہ کا اس طرح کا استعمال کیا درست ہے؟ اور کیا حضرت موصوف کا استینا د درست ہے؟ اور اگر ہے تو ان اکابرین علماء کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے جن کا اس خاص طریقۂ کار میں کوئی وقت نہیں لگا جب کہ وہ ساری زندگی اس کام کو درست اور حق جانتے رہے اور دوسروں کو بھی

اس کام کی تلقین کرتے رہے، اللہ کے واسطے جواب مفصل و مدلل تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس سوال کا جواب سمجھنے سے پہلے موجودہ تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت سمجھ لینا ضروری ہے:

حضرت مفتیٔ اعظم فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ اس سوال کے جواب میں کہ ''ایک صاحب تبلیغی جماعت میں جانے کو فرض عین فرماتے ہیں'' تحریر فرماتے ہیں: ''اصل یہ ہے کہ دین سیکھنا فرض عین ہے۔ اس کی ایک صورت مدارس میں پڑھنا ہے، اور ایک صورت تبلیغ میں جانا ہے، اور بھی صورتیں ہیں۔ میوات کے لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ دین سیکھنا فرض ہے؛ اس لیے یا مدارس قائم کرو یا دوسری صورتیں اختیار کرو، اگر تم کوئی دوسری صورت اختیار نہ کر سکو تو متعین طور پر تبلیغ ہی میں نکلو؛ اس لیے وہاں یہی کہہ کر لوگ نکلتے ہیں کہ دین سیکھنے کے لیے چلو! اتنی بات میں کسی کو اختلاف نہیں۔

(فتاویٰ محمودیہ ۱/۴۵۳)

ایک اور سوال جواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال: قرآن کریم اور حدیث شریف کی روشنی میں موجودہ ''تبلیغی جماعت'' کی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: یہ دیکھنے سیکھنے پختہ کرنے اور اشاعت کا ایک ذریعہ ہے اصول کے ساتھ کیا جائے تو تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بے حد مفید ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱/۴۲۳)

آپ نے سوال میں مقرر صاحب کے واقعۂ ہرقل سے استدلال کی جو صورت بیان کی ہے وہاں مسئلہ کفر اور اسلام کا ہے، اور اس کو جس پر منطبق کرنا چاہا ہے وہ دین ہی کے مختلف

شعبے ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ضروری اور اہم ہے؛ اس لیے ان کا یہ استدلال یا تو کم فہمی پر مبنی ہے یا کج فہمی پر، دین کے تمام ہی شعبے مطلوب اور مقصود ہیں، جو حضرات کسی ایک شعبے سے متعلق ہو کر اس کی خدمت انجام دے رہے ہیں ان کے متعلق یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے شعبہ کی خدمات انجام دینے کے جو مخصوص فوائد ہیں وہ ان کو حاصل نہیں ہوں گے؛ لیکن نعوذ باللہ وہ ناحق پر ہیں یا گمراہی پر ہیں یا کسی مخصوص شعبہ میں نہ لگنے کی وجہ سے قابلِ مذمت ہیں، یہ نہایت خطرناک خیال ہے جس سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

ایک سوال جواب ملاحظہ ہو:

سوال: جو مسلمان ''تبلیغی جماعت'' میں داخل نہیں ہوتا اور نہ گشت و چلہ کشی کرتا ہے اس کے لیے شرع کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس کا جو فائدہ ہے اس کو حاصل نہیں ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱/۴۲۳)

اس لیے ان مقرر صاحب کا یہ طرز استدلال درست نہیں۔

ایک بات یاد رہے کہ دین کے ہر شعبے میں کام کرنے والے افراد میں اس شعبہ کے کام کا غلبہ ہونا ضروری ہے، مراکزِ علومِ دینیہ (مدارس) میں تعلیم و تعلم کا غلبہ، مراکزِ تزکیۂ باطن اور خانقاہوں میں مجالسِ ذکر اور اعمالِ تزکیہ و مجاہدات کا غلبہ، اور مراکزِ دعوت و تبلیغ میں دعوت و تبلیغ کے کام کا غلبہ ہونا چاہیے، تو ان شاء اللہ یہ سارے دینی کام آگے بڑھیں گے اور کسی پر کسی عمل کا غلبہ ان اعمال کی محدودیت کے ساتھ مطلوب بھی ہے؛ تاکہ کام خوب آگے بڑھے اگر کوئی اپنی کج فہمی سے کسی دینی کام کی تنقیص یا تردید کرتا ہے، یا دوسرے کام کی تحقیر کرتا ہے تو اسے غلبہ نہیں کہا جائے گا بلکہ غلو کہا جائے گا، اور دین میں غلو مذموم اور مردود ہے، اگر مدارس والے ذکر و اذکار اور دعوت و تبلیغ کی تنقیص کریں یا

خانقاہوں میں دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتعلم کی تنقیص ہو یا اربابِ دعوت وتبلیغ تبلیغی کام کو ہی اصل سمجھیں، اور دوسرے کام کی تنقیص وتحقیر کریں تو بالیقین ان کا یہ طرز فکر وعمل مذموم اور قابلِ مذمت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۱۵/ رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

عورتوں (مستورات) کی تبلیغی جماعت کی شرعی حیثیت

سوال: آج کل مبلغین حضرات (جن کا شمار تبلیغی ذمہ داروں میں ہوتا ہے وہ) مستورات کی جماعت بنا کر بھیجتے ہیں؛ اس طرح کہ ان کے ساتھ ان کے محرم ہوتے ہیں مگر ٹرین وغیرہ میں سیٹیں آمنے سامنے ہونے کی وجہ سے نزدیکی حاصل ہوتی ہے، اور جس جگہ جماعت کا قیام ہوتا ہے وہاں پردہ کا اہتمام ہوتا ہے مگر پھر بھی اجنبی ونامانوس جگہ میں ہونے کی وجہ سے بے احتیاطی کا اندیشہ رہتا ہے، عورتیں چوبیس گھنٹے گھروں میں قیام کرتی ہیں، اور ان کے محرموں کو مساجد میں بھیج دیا جاتا ہے جب کہ صاحبِ خانہ (گھر کا مالک) بجائے مسجد میں جانے کے اسی گھر میں (جہاں عورتوں کا قیام ہے) رہتا ہے، شرعی رو سے یہ کیسا ہے؟ اس پُرفتن دور میں عورتوں کا دین کی اشاعت اور تبلیغ کرنا کیسا ہے؟ شریعت میں اس کی کوئی نظیر ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عورتوں کو تبلیغی جماعت میں بھیجنے کے سلسلہ میں علماءِ عصر کے دو نظریے اور دو رائیں ہیں۔ بعض علماء واکابر نے تبلیغی اہمیت وضرورت کے احساس کے باوجود مفاسد کے غالب ہونے کے پہلو کو مدِ نظر رکھ کر اجازت نہیں دی؛ چنانچہ مفتیٔ گجرات حضرت

مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ اور مفتیٔ پاکستان حضرت مولانا رشید احمد لدھیانویؒ کے فتاوی اسی پہلو کے غماز ہیں۔

حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب نوراللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:

''عورتوں کو جماعت میں لے جانا مطلوب و پسندیدہ نہیں ہے، اور ﴿واثمهما اکبر من نفعهما﴾ (ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے) کا مصداق ہے، عورتیں غیر محتاط ہوتی ہیں''۔ (فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۴۹۸)

اور حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی نوراللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:

''عورتوں کا گھروں سے نکلنا بہت بڑا فتنہ ہے؛ اس لیے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے مسجد کی جماعت، جمعہ، طلبِ علم اور وعظ سننے کے لیے عورتوں کے نکلنے کو ناجائز قرار دیا ہے، جب ایسی اہم عبادات و ضروریات دین کی خاطر تھوڑے سے وقت کے لیے قریب تر مقامات تک نکلنے پر بھی اس قدر پابندی ہے تو تبلیغ کے لیے کئی کئی دنوں بلکہ مہینوں اور چلوں کے لیے دور دراز مقامات میں جانا بطریق اولیٰ ناجائز ہونا چاہیے''۔

آگے حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ ''بصیرتِ فقہیہ'' کا عنوان لگا کر تحریر فرماتے ہیں:

''حضرات فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی عبارات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ امورِ دینیہ کے لیے خواتین کے خروج کی ممانعت قرآن وحدیث میں منصوص نہیں بلکہ ان حضرات نے اپنے زمانے کے حالات اور شیوع فتن وفسادات کی وجہ سے اصولِ شریعت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی آراء وافکار کا اظہار فرمایا ہے؛ لہٰذا ان حضرات کا فیصلہ کوئی نصِ قطعی اور حرفِ آخر نہیں بلکہ تغیرِ زمانہ سے اس میں ترمیم کی گنجائش ہے۔

دورِ حاضر میں غلبۂ جہل اور دین سے بے اعتنائی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ

خواتین کے لیے ضرورات شرعیہ سے خروج کو مطلقاً حرام وممنوع قرار دینا اور کسی بھی ضرورتِ شرعیہ کے لیے خروج کی اجازت نہ دینا اقامتِ دین کے بجائے ہدمِ دین ہے؛ چنانچہ اسی کے پیشِ نظر مجموع النوازل میں مسائلِ شرعیہ معلوم کرنے کی ضرورت سے خروج کی اجازت دی گئی ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۸/ ۵۸)

اس کے بالمقابل بعض دوسرے علماءِ کرام نے عصرِ حاضر کے لوگوں میں دین سے غفلت، اسلامی تہذیب وکلچر سے بعد ودوری، علومِ اسلامیہ کی تحصیل وترویج سے سستی وبے زاری وغیرہ دیگر حقائق؛ نیز تبلیغی جماعت کے فوائدِ کثیرہ من جملہ ان میں سے لوگوں میں اس کے ذریعہ علومِ دینیہ کی تحصیل کا شوق وجذبہ سنتِ نبوی علیہ الصلوۃ والسلام سے والہانہ لگاؤ شریعت اسلامی وتہذیب محمدی ﷺ کی ترویج واشاعت کا شوق وعزم وغیرہ پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر چند اہم وضروری شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے؛ چنانچہ مفتیٔ اعظم ہند فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحبؒ کے فتاویٰ ان ہی حقائق کی طرف مشیر ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''تبلیغی جماعت کا مقصد دین سیکھنا، اس کو پختہ کرنا دوسروں کو دین سیکھنے، پختہ کرنے کے لیے آمادہ کرنا ہے اور اس جذبہ کو عام کرنے کے لیے طویل سفر کیے جاتے ہیں، جس طرح مرد اپنے دین کو سمجھنے اور پختہ کرنے کے محتاج ہیں عورتیں بھی محتاج ہیں اور گھروں میں عامۃً اس کا انتظام نہیں ہے؛ اس لیے اگر لندن یا کسی بھی دور دراز مقام پر محرم کے ساتھ حدودِ شرع کی پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے جائیں اور کسی کے حقوق تلف نہ ہوں تو شرعاً اس کی اجازت ہے بلکہ دینی اعتبار سے مفید واہم ہے، اگر بچے اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ بغیر والدہ کے تڑپیں گے، اور ان کی پرورش نہیں ہو سکے گی، اور بچوں کی نانی ان کی

دیکھ بھال اطمینان بخش طریقے پر کرے گی تو پھر اجازت ہے''۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۴/ ۱۰۷)

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''دین سیکھنا مردوں اور عورتوں سب کے ذمہ ضروری ہے، عورت کے لیے اگر مکان میں ان کے شوہر باپ بھائی وغیرہ دین سیکھنے کا انتظام کر دیں تو کہیں جانے کی ضرورت نہیں؛ لیکن جب اس کا انتظام نہ ہو تو ان کے اجتماع کو منع نہ کیا جائے؛ البتہ اس کا اہتمام کیا جائے کہ پردہ کا پورا انتظام ہو، بلا محرم کے عورتیں سفر نہ کریں، تقریر میں ان کی آواز نامحرموں تک نہ پہنچے، حضرت نبی کریم ﷺ نے بھی عورتوں کا اجتماع فرمایا اور اس میں خود تشریف لے جا کر دین سکھایا ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۴/ ۱۱۶)

شہیدِ ملت حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ عورتوں کا تبلیغی جماعتوں میں جانا کیسا ہے؟ اس سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ تبلیغ والوں نے مستورات کے تبلیغ میں جانے کے لیے خاص اصول وشرائط رکھے ہیں، ان اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے عورتوں کا جماعت میں جانا بہت ہی ضروری ہے، اس سے دین کی فکر بھی اپنے اندر پیدا ہوگی اور امت میں دین والے اعمال زندہ ہوں گے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷/ ۲۷۵)

بہر حال یہ مسئلہ دیانت سے تعلق رکھتا ہے اس کی پوری بنیاد ہی دیانت پر ہے؛ لہذا جو حضرات بھیجنے والے ہیں، (یعنی ذمہ دار) اور جو حضرات ساتھ جا رہے ہیں، ان کی بہت بڑی اور بہت اہم ذمہ داری ہے وہ سب سے پہلے اس بات کا مکمل اطمینان حاصل کرلیں کہ جماعتِ تبلیغ میں بھیجی جانے والی یہ خواتین کس نوع کی ہیں آج تک کے ان کے طرزِ عمل اور رویہ سے اس بات کا اطمینان ہو کہ یہ عورتیں اس سلسلہ میں جو خاص اصول اور شرائط تجویز کیے گئے ہیں ان کی مکمل پابندی کریں گی تو بھیجنے کی اجازت وگنجائش ہے،

رہا شب میں بسا اوقات شوہروں یا محرموں کا ان خواتین سے الگ رات گزارنا تو یہ عدمِ جواز کی وجہ نہیں بن سکتا؛ اس لیے کہ اس سلسلہ میں وضع کیے گئے اصول وشرائط کی بنیاد پر ان عورتوں کو ایسی جگہوں پر ہی رکھا جاتا ہے، جہاں ان کی عفت وعصمت کی حفاظت وغیرہ کا مکمل اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اخیر میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ کی تحریر جو بذات خود مستورات کی تبلیغی جماعت کے ساتھ شرکت فرما کر لکھی ہے پیش کی جارہی ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

بسم الله الرحمن الرحيم

مستورات کی تبلیغی جماعت میں مجھے بذاتِ خود اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ساتھ شرکت کا موقع ملا، مستورات کے تبلیغی عمل کا میں نے خود مشاہدہ کیا، جس میں شریعت کے تمام احکام کی مکمل پابندی کی جاتی ہے، اور پردے کے تمام احکامات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، مستورات کی تبلیغ کے سلسلہ میں تبلیغی جماعت کے اکابرین نے جو شرائط رکھی ہیں وہ مکمل شریعت کے مطابق ہیں اور ان شرائط کی پابندی نہ کرنے والی مستورات کو تبلیغی عمل میں شرکت کی اجازت نہیں ہوتی، ان تمام امور کے بعد میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ مستورات کی تبلیغی جماعت میں شرکت کے عدمِ جواز کا فتویٰ کیوں دیا جاتا ہے، میری رائے میں مستورات کا اس طرح تبلیغ کے لیے جانا درست ہے، مستورات کی جماعتوں کی وجہ سے ہزاروں عورتوں کی اصلاح ہوگئی ہے، اور بہت سی عورتیں جو بے حجاب کھلے بندوں بے پردہ نکلتی تھیں، اور قرآن کریم نے جس کو تبرج الجاهلية کہا ہے اس کا پورا پورا مظاہرہ کرتی تھیں، الحمدللہ ان مستورات کو دیکھ کر ان کے پاس بیٹھ کر اور ان کی دینی باتیں سن کر ان کی اصلاح ہوگئی ہے اور وہ اب مکمل حجاب کے ساتھ نکلتی ہیں؛ اس لیے اس ناکارہ کے نزدیک

تو شرائط مرتبہ کے مطابق نہ صرف مستورات کا تبلیغ میں نکلنا جائز ہے بلکہ ضروری ہے؛ کیوں کہ مثل مشہور ہے کہ ''خربوزہ خربوزہ سے رنگ پکڑتا ہے'' ہمارے یہاں بے پردگی کا جو عام رواج ہوا ہے اور الا ماشاء اللہ کوئی گھرانہ مشکل ہی سے اس طوفان بلاخیز سے محفوظ رہا ہوگا، اس کی ابتداء انگریز نے غیر مسلم استانیوں کے ذریعہ کی اور بالآخر اس تحریک نے طوفان کی شکل اختیار کرلی، اگر بشرائطِ معروفہ تبلیغی جماعت میں مستورات کی نقل وحرکت کو رواج دیا جائے تو انشاء اللہ اس کے بہت مبارک اثرات ظاہر ہوں گے۔ وللہ الحمد اولا و آخرا. (ماہنامہ بینات ماہ صفر ۱۴۱۹ھ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۹/ ۵/ ۱۴۲۵ھ

نظر اور شرمگاہ کی حفاظت کے متعلق اسلامی تعلیم

سوال (۱) آج کے اس دور میں جہاں لڑکیاں برائے نام کپڑے پہن کر اور اپنے تن کی نمائش کرتے ہوئے گھومتی ہیں، اس صورت میں اپنی نظر کی حفاظت کرنا بھی دشوار ہوتا ہے، اپنے آپ کو برائی سے اور بدنظری سے بچانے کی کیا صورت ہے اور کیا طریقہ ودعا ہے؟

(۲) اس صورت حال میں جب شہوانیت حد سے زیادہ پریشان کررہی ہو تو نفس پرستی، گندی ذہنیت وسوچ اور اس شہوانیت سے بچنے کی کیا صورت، طریقہ اور دعا ہے؟ اگر ایسی حالت میں مشت زنی کی جائے تو کیا یہ جائز ہے؟

(۳) زنا اور اس سے منسلک دیگر برائیوں سے بچنے کا واحد حل شادی (نکاح) ہے؛ پر (لیکن) ۲۲، ۲۳ سال کی عمر میں شادی اور دوران تعلیم شادی کرنا یہ سب کے بس کی بات

نہ ہونے کے ساتھ ساتھ آسان بھی نہیں ہے اور ایسا کرنا خود لڑکے کے لیے بہت مصیبتوں کو بلاوا دینے کے مساوی ہے، جیسے تعلیم کو بخوبی مکمل کرنا، بیوی کی کفالت کرنا اور اس کے حقوق کی ادائیگی کرنا وغیرہ وغیرہ تو اس صورتِ حال میں بدنظری، مشت زنی، شہوانیت، نفسانیت، زنا اور شیطان اور نفس کے دھوکے سے بچنے کی کیا صورت، طریقہ ودعا ہے؟

(۴) کل ملا کر آج کے اس ماحول میں اور آنے والے ہر ماحول میں جو اس سے بھی بدتر ہوگا کیسے بچا جا سکتا ہے؟ اور مندرجۂ بالا تمام برائیوں اور خرابیوں نیز شیطان اور نفس کے دھوکے سے بچنے کی کیا صورت، دعا اور طریقہ ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك ازكىٰ لهم ان الله خبير بما يصنعون﴾ (سورۂ نور)(۳۰) "یغضوا" غض سے مشتق ہے، جس کے معنی کم کرنے اور پست کرنے کے ہیں۔ (راغب) نگاہ پست اور نیچی رکھنے سے مراد نگاہ کو ان چیزوں سے پھیر لینا ہے جن کی طرف دیکھنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے۔ (ابن کثیر) ابن حبان نے یہی تفسیر فرمائی ہے اس میں غیر محرم عورت کی طرف بری نیت سے دیکھنا تحریماً اور بغیر کسی نیت کے دیکھنا کراہۃً داخل ہے، اور کسی عورت یا مرد کے سترِ شرعی پر نظر ڈالنا بھی اس میں داخل ہے۔ (مواضع ضرورت جیسے علاج و معالجہ وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں) کسی کا راز معلوم کرنے کے لیے اس کے گھر میں جھانکنا، اور تمام وہ کام جن میں نگاہ کے استعمال کرنے کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے اس میں داخل ہیں۔ "ويحفظوا فروجهم" شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ نفس کی خواہش پورا کرنے کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں ان سب سے اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھیں،

اس میں زنا، لواطت اور دو عورتوں کا باہمی سحاق جس سے شہوت پوری ہوجائے، ہاتھ سے شہوت پوری کرنا یہ سب ناجائز وحرام چیزیں داخل ہیں۔ مراد اس آیت کی ناجائز وحرام شہوت رانی اور اس کے تمام مقدمات کو ممنوع کرنا ہے جن میں سے ابتداء اور انتہاء کو تصریحاً بیان فرمادیا، باقی درمیانی مقدمات سب اس میں داخل ہوگئے۔ فتنۂ شہوت کا سب سے پہلا سبب اور مقدمہ نگاہ ڈالنا اور دیکھنا ہے اور آخری نتیجہ زنا ہے، ان دونوں کو صراحۃً ذکر کرکے حرام کردیا گیا ان کے درمیانی حرام مقدمات مثلاً باتیں سننا، ہاتھ لگانا وغیرہ یہ سب ضمناً آگئے، ابن کثیر نے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ: کل ما عصی اللّٰہ به فهو كبيرة وقد ذكر الطرفين یعنی جس چیز سے بھی اللہ کے حکم کی مخالفت ہوتی ہو سب کبیرہ ہی ہیں؛ لیکن آیت میں ان کے دو طرف ابتداء وانتہاء کو ذکر کردیا گیا۔ ابتداء نظر اٹھا کر دیکھنا اور انتہاء زنا ہے۔ طبرانیؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نظر ایک زہریلا تیر شیطان کے تیروں میں سے ہے، جو شخص باوجود دل کے تقاضے کے اپنی نظر پھیر لے تو میں اس کے بدلے اس کو ایسا پختہ ایمان دوں گا جس کی لذت وہ اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ کلبی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اگر بلا ارادہ اچانک کسی غیر محرم عورت پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اپنی نظر اس کی طرف سے پھیرلو۔ (ابن کثیر) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ پہلی نظر تو معاف ہے دوسری گناہ ہے، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ پہلی نظر جو بلا ارادہ اچانک پڑ جائے وہ غیر اختیاری ہونے کے سبب معاف ہے، اور بالقصد پہلی نظر بھی معاف نہیں۔ (معارف القرآن ۶/ ۳۸۶، ۳۸۷)

(۲) اپنی شرم گاہ کی حفاظت کا اصل طریقہ وہی ہے جو قرآن اور حدیث میں بتلایا گیا یعنی آدمی اپنی نگاہ کی حفاظت کرے، جب نگاہ کی حفاظت کرے گا تو دل وساوس سے محفوظ رہے گا، اور جب دل محفوظ رہے گا تو شرم گاہ کی بھی حفاظت ہوگی، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کے ذریعہ مدد بھی چاہتا رہے۔ اپنے ہاتھ سے منی خارج کرنا حرام اور موجب وبال ہے، اور اس پر تعزیر لازم ہے۔ قرآن پاک کی آیت ﴿فمن ابتغی وراء ذلک اُولئِك هم العدون﴾ کی تفسیر میں حضرات مفسرین نے اس فعل بد (ہاتھ سے منی خارج کرنے) کی حرمت کی تصریح کی ہے؛ لیکن اگر کسی نوجوان پر شہوت کا غلبہ ہو کہ شدت شہوت کی وجہ سے اس کا ذہن اس قدر متوحش ہو کہ کسی طرح اس کو سکون وقرار حاصل نہ ہو، اور اس کے پاس تسکینِ شہوت کا کوئی حلال ذریعہ بھی موجود نہ ہو، ایسی اضطراری حالت میں اگر وہ بطور علاج اس عمل کے ذریعہ شہوت کی تسکین کرلے تو اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے توقع کی جاتی ہے کہ اس پر وبال نہ ہوگا یہ فقیہ ابواللیث کا قول ہے۔

درمختار میں ہے: فی الجوھرۃ: الاستمناء حرام وفیه التعزیر (درمختار) اس کی شرح میں علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: قوله الاستمناء حرام ای بالکف اذا کان لاستجلاب الشهوة، اما اذا غلبت الشهوة ولیس له زوجة، ولا امة، ففعل ذلك لتسکینها فالرجاء انه لا وبال علیه، کما قاله ابواللیث. (شامی کتاب الحدود)

اس کی مثال ایسی ہے کہ رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے؛ لیکن اگر کوئی مظلوم دفعِ ظلم کے خاطر رشوت دینے پر مجبور ہوجائے تو توقع کی جاتی ہے کہ اس مظلوم پر مواخذہ نہ ہوگا۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل ۹/۱۶۵)

لیکن یاد رہے کہ استمناء بالید کا جب ایک مرتبہ تجربہ کرلیا تو پھر یہ عادت اس کا

پیچھا نہیں چھوڑتی اور اس کے نتیجہ میں ایسا آدمی شہوت کا ذبہ کا شکار ہو کر ہمیشہ اس شنیع حرکت کا ارتکاب کر کے اپنی دنیا و عاقبت برباد کر لیتا ہے؛ اس لیے سلامتی اسی میں ہے کہ اس دروازے کو کھولا نہ جائے۔

(۳،۴) دورِ حاضر کی جدید تہذیب نے انسانی ضرورتوں کا دائرہ اتنا پھیلا دیا ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے آدمی صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح کمائی کے واسطے مزدوری کرتا رہتا ہے، (چاہے تجارت کی شکل میں ہو یا ملازمت وغیرہ) پھر بھی اس کی ضرورتیں پوری ہونے کا نام نہیں لیتی، یہ دراصل نتیجہ ہے اس چھوٹے معیار زندگی کا جو آج کل پڑھے لکھے اور ترقی یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر سوار ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کے سلسلہ میں اس طرح کا غلو اور افراط جس میں آج کا انسان مبتلا ہے، شریعت کی نگاہوں میں درست نہیں، اور ایسے ہی معیار زندگی کو پانے کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی جاتی ہیں اور اسی تعلیم کے حصول میں عمر کا ایک بڑا حصہ لگایا جاتا ہے، اور جب تک آدمی یہ سب کچھ کر کے اپنا معیار زندگی اعلیٰ نہ بنالے وہاں تک نکاح اور شادی کو بھی معیوب سمجھا جاتا ہے، یہ سب اسلامی تعلیمات سے میل کھانے والی چیز نہیں؛ بہر حال اپنی شہوانی تقاضوں کی شدت کے نتیجہ میں یا تو آدمی نکاح شادی کر کے اپنی ضرورت پوری کرے، یا پھر شہوت کو کنٹرول کرنے کے لیے شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ نگاہ کی حفاظت، روزوں کا اہتمام؛ نیز فحاشی عریانی اور بے حیائی والے شہوت کو برانگیختہ کرنے والے ماحول سے اپنے آپ کو دور رکھے، اور اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کرے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے، اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت کا اہتمام اور ہر معاملہ میں سنت وشریعت کا اتباع لازم پکڑے، اس سلسلہ میں

قرآن وحدیث میں جو ہدایات تفصیل سے دی گئی ہیں، اور علماء اور صلحاءِ امت نے اپنی کتابوں میں قرآن وحدیث کے ان نصوص کی جو تفصیل وتشریح کی ہے اس کا مطالعہ کثرت سے کرے، نیز اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور پیش ہوکر روز قیامت اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اس چیز کو ہر وقت مدنظر رکھ کر اللہ سے ڈر کر اپنے آپ کو ان گناہوں سے بچائے ﴿فاما من خاف مقام ربه و نهى النفس عن الهوىٰ فان الجنة هى المأوىٰ﴾ اس سلسلہ میں مختلف کتابیں اور رسائل مطبوعہ شکل میں موجود ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے، ہمارا ایک رسالہ ''نگاہ اور شرم گاہ کی حفاظت'' آپ کی خدمت میں بذریعۂ ڈاک بھیجا جارہا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

۱۰/ رمضان ۱۴۲۷ھ

دینی مجالس وغیرہ میں عورتوں کی شرکت کا حکم

سوال: آج کل یہاں برطانیہ میں عورتوں کو مساجد میں بلانے کا رواج عام ہوتا جارہا ہے، تراویح میں ختم قرآن کے موقعہ پر، مدرسہ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر، اسی طرح کسی عالم کے وعظ و بیان کے موقعہ پر باقاعدہ اعلان کرکے مسجد میں عورتوں کو بلایا جاتا ہے اور انہیں صحن مسجد میں یا مسجد کے احاطہ میں کسی کمرے میں بٹھلایا جاتا ہے، اکثر عورتیں شوق وذوق سے شریک ہوکر اس میں حصہ لیتی ہیں، یہاں عورتوں کی عام حالت کچھ اس طرح سے ہے کہ ان کا چہرہ کھلا ہوتا ہے، عمدہ لباس زیب تن اور وہ بھی ایسا کہ اس میں سے جسم کی ساخت اور بناوٹ جھلکتی ہے، بعضوں کے چہرے پر نقاب ہوتا ہے اور بعض خواتین فیشنی برقعہ پہنتی ہیں وہ ایسا چست ہوتا ہے کہ اس میں سے جسم کی ساخت جھلکتی ہے، عورتوں کی نظر راستہ چلتے ہوئے لوگوں پر نہ صرف پڑتی ہے بلکہ وہ راہ گزروں کو خوب اچھی

طرح دیکھتی ہوئی جاتی ہیں، اگر کوئی جاننے والا ہوتا ہے تو اس سے سلام علیک کہہ کر خیر خبر بھی دریافت کرلیتی ہیں، اسی طرح راستہ سے گزرنے والے بھی عورتوں کو دیکھتے ہوئے گزرتے ہیں، یہاں اکثر وبیشتر مساجد میں آلۂ نشر لگا ہوا ہے جس کے ذریعہ مساجد میں ہونے والے تمام پروگرام اذان نماز خطبۂ جمعہ وعیدین تراویح علماء کرام کے بیانات وغیرہ نشر کیے جاتے ہیں، اور ان تمام پروگراموں کو سننے کے لیے تقریباً ہر گھر میں ریڈیو (ریسیور) بھی موجود ہے جس کے ذریعہ مساجد سے نشر ہونے والے تمام پروگرام گھر میں بیٹھے ہوئے سنے جاسکتے ہیں، اس کے علاوہ لوگ ٹیپ رکارڈ لے کر مساجد میں آتے ہیں اور مساجد میں ہونے والے پروگرام رکارڈ کر لیتے ہیں، کیا ان تمام سہولتوں کے باوجود پروگراموں میں شریک ہونے کے لیے اس پُرفتن اور بے حیائی کے زمانہ میں عورتوں کو مساجد میں بلانا یا عورتوں کو ان پروگراموں میں شرکت کے لیے مساجد میں جانا شرعاً جائز ہے؟ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہاں عورتیں عام طور پر ان کے شوہر کی عدم موجودگی میں جب کہ وہ کام پر ہوتے ہیں بچوں کو اسکول، مدرسہ لے کر آتی جاتی ہیں، بازار سے سودا خرید کر لاتی ہے، شادی بیاہ کے موقع پر دعوت میں شریک ہونے کے لیے ہال میں جاتی ہیں، تو کیا دین کی باتیں سننے کے لیے مسجد میں نہیں جاسکتیں؟ اسی طرح بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہند وپاک میں سیکڑوں مکاتب ومدارس ہیں، وہاں بھی ہر سال انعامی جلسے ہوتے ہیں، اسی طرح بکثرت دارالعلوم ہیں جن میں ختم بخاری شریف کی تقریب منعقد ہوتی ہے، دعا کا اہتمام ہوتا ہے، فارغین طلباء کی دستار بندی ہوتی ہے، علماء کرام کے بیانات مساجد ومدارس اور دارالعلوم میں ہوتے ہی رہتے ہیں وہاں کیوں عورتوں کو مدعو نہیں کیا جاتا؟ کیا وہاں عورتوں کو دین کی باتیں سننے کی ضرورت نہیں؟ جب کہ وہاں یہاں

کی طرح سہولتیں بھی نہیں؟ امید ہے کہ مندرجۂ بالا تمام حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تسلی بخش جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ عورتوں کے مجالس وعظ میں جانے سے متعلق پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''عورتوں کو فقہاءِ حنفیہ نے نماز کی جماعتوں اور عیدین اور مجالس وعظ میں جانے سے منع کیا ہے، اور کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ عورتوں کے لیے مجالس وعظ اور جماعت نماز اور عیدین میں جانا مکروہ تحریمی ہے جو حرام کے قریب ہے، اور اس حکم فقہی کی دلیل یہ حدیث ہے جو بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے: عن عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنها قالت: لو أدرك رسول الله ﷺ مااحدث النساء لمنعهن المسجد، كما منعت نساء بنى اسرائيل، فقلت لعمرة او منعن، قالت: نعم. رواه البخارى.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ اگر عورتوں کی یہ حرکات جو انھوں نے اب اختیار کی ہے رسول اللہ ﷺ ملاحظہ فرماتے تو انہیں مسجدوں میں آنے سے روک دیتے جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئیں تھیں، راوی کہتا ہے کہ میں نے عمرہ سے پوچھا کہ کیا بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئیں تھیں؟ انھوں نے فرمایا ہاں۔ انتہیٰ۔

اس حدیث سے نہایت صاف طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں ہی عورتوں کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ان کا گھروں سے نکلنا اور جماعتوں میں جانا سبب فتنہ تھا، اور اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہؓ و دیگر اکابر

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین عورتوں کو جماعت میں آنے سے منع کرتے تھے۔

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری شرح بخاری میں اس حدیث کے تحت میں جس میں عورتوں کا زمانۂ رسالت پناہی میں عیدین میں جانا مذکور ہے، تحریر فرماتے ہیں:

قال العلماء: کان ھذا فی زمنه ﷺ وأما الیوم فلا تخرج الشابة ذات الھیئة، ولھذا قالت عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھا: لو رأی رسول اللّٰہ ﷺ مااحدث النساء لمنعھن المسجد کما منعت نساء بنی اسرائیل، قلت: ھذا الکلام من عائشة بعد زمن یسیر جدا بعد النبی ﷺ وأما الیوم فنعوذ باللّٰہ من ذلك فلا یرخص فی خروجھن مطلقا للعید وغیرہ. (عینی شرح بخاری).

ترجمہ: علماء نے فرمایا کہ عورتوں کا عیدین میں جانا رسول خدا ﷺ کے زمانے میں؛ اس لیے تھا کہ وہ زمانہ خیر و برکت کا تھا، اور فتنہ کا خوف نہ تھا، اور آج کل جوان خوب صورت خوش وضع ہرگز نہ جائیں، اور اسی لیے حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ ﷺ عورتوں کی یہ حرکات ملاحظہ فرماتے تو ان کو مسجد میں آنے سے روک دیتے جیسے بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئیں تھیں۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا یہ فرمانا رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ مبارک کے بہت تھوڑے دنوں کے بعد کا ہے، اور آج کل تو خدا کی پناہ! پس مطلقاً عورتوں کو عید اور غیر عید میں جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ انتہیٰ۔

(من المؤلف) جب کہ علامہ عینیؒ اپنے زمانہ میں یوں فرماتے ہیں کہ آج کل کی عورتوں کے حالات سے خدا کی پناہ، تو پھر ہمارے اس زمانہ میں چودھویں صدی کی عورتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے؟

(از احقر احمد) حضرت مفتی اعظم صاحبؒ یہ بات آج سے نوے سال قبل فرما

رہے ہیں، جبکہ ٹی، وی کے نتیجہ میں بے حیائی کا وہ سیلاب بھی آیا نہیں تھا جس نے اس وقت سب کو اپنا شکار بنا رکھا ہے تو پھر اس زمانہ کی عورتوں کا حال تو نا قابل بیان ہے۔فقط۔

اور علامہ عینیؒ عمدۃ القاری میں دوسری جگہ فرماتے ہیں: ومذهب أصحابنا ما ذكر صاحب البدائع أجمعوا على أنهم لا يرخص للشابة الخروج فى العيدين والجمعة وشيء من الصلاة لقوله تعالىٰ: ﴿وقرن فى بيوتكن﴾ ولأن خروجهن سبب للفتنة، وأما العجائز فيرخص لهن الخروج فى العيدين، ولا خلاف أن الفضل أن لا يخرجن فى صلاة. (عینی شرح بخاری، بدائع ۱/ ۲۷۵)

ترجمہ: ہمارے اصحاب یعنی حنفیہ کا مذہب وہ ہے جو صاحبِ بدائع نے ذکر کیا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جوان عورت کو عیدین و جمعہ بلکہ کسی نماز میں جانے کی اجازت نہیں بوجہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿وقرن فى بيوتكن﴾ کے اور اس لیے کہ عورتوں کا گھر سے نکلنا فتنہ کا سبب ہے، ہاں بڑھیا عیدین کے لیے جا سکتی ہے، اور اس میں خلاف نہیں کہ افضل بڑھیوں کے لیے بھی یہی ہے کہ کسی نماز کے لیے نہ نکلیں۔انتہیٰ۔

اور بدائع میں ہے: ولا يباح للشواب منهن الخروج الى الجماعة بدليل ماروى عن عمر رضی اللہ عنہ انه نهى الشواب عن الخروج، ولأن خروجهن سبب للفتنة، والفتنة حرام وما أدى الى الحرام فهو حرام. (بدائع ۱/۱۵۷) یعنی جوان عورتوں کا جماعتوں میں جانا مباح نہیں اس روایت کی دلیل سے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے جوان عورتوں کو نکلنے سے منع فرما دیا تھا اور اس لیے کہ عورتوں کا گھروں سے نکلنا فتنہ کا سبب ہے، اور فتنہ حرام ہے، اور جو چیز حرام کی طرف پہنچائے وہ بھی حرام ہوتی ہے۔انتہیٰ۔

اور فتاویٰ ھندیہ معروف بہ ''عالمگیری'' میں ہے: والفتویٰ الیوم علی الکراھة فی کل الصلوات لظھور الفساد کذا فی الکافی (فتاوی عالمگیری ۱/ ۹۳) یعنی اس زمانہ میں فتویٰ اس پر ہے کہ عورتوں کا تمام نمازوں میں جانا مکروہ ہے کیوں کہ ظہورِ فساد کا زمانہ ہے۔

اور بدائع میں ہے: وأما المرأة فلأنها مشغولة بخدمة الزوج ممنوعة عن الخروج الی محافل الرجال لکون الخروج سببا للفتنة، ولھذا لا جماعة علیھن ولا جمعة علیھن أیضا (۱/ ۲۵۸)

عورت کا حکم یہ ہے کہ وہ خاوند کی خدمت میں (شرعاً) لگائی گئی ہے اور مردوں کی مجلسوں میں جانے سے (شرعاً) روکی گئی ہے کیوں کہ عورتوں کا گھروں سے نکلنا فتنہ کا سبب ہے اور اسی لیے عورتوں پر جماعت اور جمعہ نہیں ہے۔

(من المؤلف) ان تمام عبارتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورتوں کو نماز پنج گانہ، عیدین اور جمعہ کی جماعتوں میں جانا مکروہ تحریمی ہے اور گھروں سے ان کے نکلنے ہی میں فتنہ ہے، اور یہ ممانعت حضرت عمر، حضرت عائشہ، عروہ بن زبیر، قاسم، یحیٰ بن سعد انصاری، امام مالک اور ابو یوسف (رضی اللہ عنہم) وغیرہم سے منقول ہے، اور ائمۂ حنفیہ کا بالاتفاق یہی مذہب ہے جیسا کہ عینی اور بدائع کی عبارت سے واضح ہے۔

باوجود یہ کہ نماز پنج گانہ اور عیدین اور جمعہ کی جماعتوں میں رسول خدا ﷺ کے زمانے میں عورتیں جاتیں اور شریک ہوتی تھیں، اور یہ جماعتیں فرائض کی جماعتیں ہیں، اور شعار اسلام میں سے ہیں مگر اختلاف زمانہ اور تغیر حالات کی وجہ سے صحابۂ کرام اور ائمۂ عظام نے عورتوں کو ان جماعتوں سے روک دیا اور ائمۂ حنفیہ نے بالاتفاق عورتوں کو

جماعت میں جانے کو مکروہ فرمادیا، تواس سے ہر سمجھ دار شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب فرائض کی جماعتوں کا یہ حکم ہے تو وعظ کی مجلسوں میں جانا عورتوں کو کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا، اول تو آج کل وعظ کی اکثر مجلسیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ عورتیں تو عورتیں مردوں کو بھی ان میں جانا جائز نہیں، اس وجہ سے کہ اکثر واعظ نام کے مولوی ہوتے ہیں، دو چار اردو کے قصے کہانیوں کی کتابیں دیکھی اور واعظ بن گئے، پھر ان کے وعظ میں سوائے قصے کہانیوں، جھوٹیں سچی روایتوں، منگھڑت باتوں کے اور کیا ہوگا؟ سوایسے وعظ میں کسی کو بھی جانا جائز نہیں اور بعض واعظ مولوی بھی ہیں؛ لیکن چوں کہ وعظ سے ان کا مقصود دنیا کمانا ہے اور عوام کو خوش کرنا اور اپنا معتقد بنانا؛ اس لیے وہ بھی عام پسند باتوں کے بیان کرنے میں ہی اپنا فائدہ سمجھتے ہیں، اور عوام کو خوش کرنے کے لیے صرف قصے کہانیوں پر وعظ کو ختم کردیتے ہیں، مجلس وعظ کی گرمی کے لیے اولیاءِ کرام کے کچھ فرضی واقعات سنا دیے، کچھ بے سند موضوع روایات بیان کردیں اور اپنا الوسیدھا کرلیا ایسے مولویوں کے وعظ میں بھی جانا مفید نہیں، اور کسی مرد عورت کو ان کے وعظ میں جانا جائز نہیں۔

رہے وہ صرف معدودے چند علماء جو فی الواقع عالم بھی ہیں اور وعظ سے ان کا مقصود بھی تعلیمِ دین اور تبلیغ مذہب اور اشاعت اسلام ہے، دنیا طلبی انہیں مقصود نہیں، ان کا وعظ رطب ویابس قصوں، جھوٹی سچی روایتوں سے خالی اور پاک ہوتا ہے تو ایسے وعظ میں صرف مردوں کو حاضر ہونا جائز ہے عورتوں کو نہیں، کیوں کہ جب فرائض کی جماعتوں میں عورتوں کا جانا مکروہ اور ناجائز ہے تو مجلس وعظ میں جانا بدرجۂ اولی مکروہ اور ناجائز ہوگا؛ چنانچہ فقہائے کرام نے اس کی تصریح فرمادی ہے، اور متعدد معتبر فتاویٰ فقہاءِ حنفیہ میں یہ مضمون بصراحت موجود ہے جو ناظرین کے اطمینان کے لیے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

ولا یحضرن الجماعات لقوله تعالیٰ: ﴿وقرن فی بیوتکن﴾ وقال ﷺ: صلاتها فی قعر بیتها افضل من صلاتها من دارها، وصلاتها فی صحن دارها افضل من صلاتها فی مسجدها، و بیوتهن خیر لهن۔ الی قوله قال المصنف فی الکافی: والفتویٰ الیوم علی الکراهة فی الصلاة کلها لظهور الفساد ومتی کره حضور المسجد للصلاة فلأن یکره حضور مجالس الوعظ خصوصا عند هؤلاء الجهال الذین تحلوا بحلیة العلماء أولی ذکره فخر الاسلام. (البحر الرائق ۱/ ۳۸۰)

ترجمہ: اورعورتیں جماعتوں میں نہ جائیں بوجہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿وقرن فی بیوتکن﴾ کے، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کی نماز کوٹھڑی کے اندر اس نماز سے اچھی ہے جو گھر کے صحن میں ہو، اور صحن کی نماز اس نماز سے اچھی ہے جو مسجد میں ہو، اور ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہے الی قولہ مصنف یعنی صاحب کنز الدقائق نے ’’کافی‘‘ میں فرمایا کہ آج کل فتویٰ اس پر ہے کہ عورتوں کا تمام نمازوں میں جانا مکروہ ہے بوجہ ظہور فساد کے، اور جب کہ مسجد میں نماز کے لیے جانا مکروہ ہوا تو وعظ کی مجلسوں میں جانا اور بالخصوص ان جاہل واعظوں کی مجلسوں میں جنھوں نے علماء کی سی صورتیں بنا رکھی ہیں بدرجۂ اولی مکروہ ہے، یہ فخر الاسلام نے ذکر کیا ہے۔ انتہیٰ۔

اور علامہ بدرالدین عینیؒ ’’شرح کنز‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں: ولا یحضرن ای النساء سواء کن شواب او عجائز الجماعات لظهور الفساد، وعند ابی حنیفة للعجوز ان تخرج فی الفجر والمغرب والعشاء، وعندهما فی الکل، وبه قالت الثلاثة، والفتویٰ علی المنع فی الکل، فلذلك أطلق المصنف ویدخل فی قوله الجماعات الجمعة و الاعیاد والاستسقاء ومجالس الوعظ ولا سیما عند الجهال

الذین تحلوا بحلیة العلماء وقصدهم الشهوات وتحصیل الدنیا. (عینی شرح کنز ۳۹)

ترجمہ: یعنی عورتیں خواہ جوان ہوں یا بوڑھیاں جماعتوں میں نہ جائیں کیوں کہ ظہورِ فساد کا زمانہ ہے، امام ابوحنیفہؒ سے بوڑھیوں کے لیے فجر اور مغرب اور عشاء میں جانے کی اجازت مروی ہے، اور صاحبینؒ سے تمام نمازوں میں جانے کی، اور اسی کے ائمۂ ثلاثہ قائل ہیں، اور آج کل فتویٰ اس پر ہے کہ تمام نمازں میں جانا جوان عورتوں اور بوڑھیوں دونوں کو منع ہے، اور مصنف کے قول الجماعات میں جمعہ اور عیدین اور استسقاء اور وعظ کی مجلسیں بھی داخل ہیں بالخصوص ان جاہل واعظوں کی مجلسیں جو علماء جیسی صورتیں بنا لیتے ہیں اور مقصود ان کا خواہشات نفسانی کو پورا کرنا اور دنیا کمانا ہے۔

اور ''الدر المختار'' میں ہے: (ویکره حضورهن الجماعة) ولو الجمعة وعید ووعظ (مطلقا) ولو عجوزا لیلا (علی المذهب) المفتی به لفساد الزمان. (فی التنویر وشرحه ۲/۳۰۷)

یعنی عورتوں کا جماعت میں جانا خواہ جماعت جمعہ کی ہو یا عید کی یا وعظ کی مکروہ ہے خواہ جانے والی بوڑھی عورت ہو یا رات کو جائے مذہبِ مفتی بہ کی بنا پر اور یہ حکم بوجہ ظہور فساد زمانہ کے ہے۔ انتہیٰ۔

(من المؤلف) بحر الرائق، عینی شرح کنز الدقائق اور در المختار کی عبارتوں سے صراحۃً یہ بات ثابت ہوگئی کہ عورتوں کو مجالس وعظ میں جانا مکروہ اور ناجائز ہے، اور بالخصوص ایسے واعظوں کی مجلسوں میں جن کا مقصود دنیا کمانا ہے یعنی اگر واعظ جاہل یا دنیا کمانے والا ہو تو اس کی مجلس میں تو قطعاً ناجائز ہے، اس میں تو کلام ہی نہیں، عالموں اور اچھے واعظوں کی مجلس وعظ میں جانا بھی فساد زمانہ کی وجہ سے مکروہ اور ناجائز ہے۔

ملاعلی قاریؒ ''مرقات شرح مشکوۃ'' میں تحریر فرماتے ہیں: ویمکن حمل النهی علی عجائز متطیبات او متزینات او علی شواب ولو فی ثیاب بذلتهن لوجود الفتنة فی خروجهن علی قیاس کراهة خروجهن الی المساجد. (مرقات ۱/ ۴۷۰)

یعنی آپ ﷺ نے عورتوں کو زیارت قبور سے جو منع فرمایا ہے تو اس ممانعت کو ان بوڑھیوں پر جو خوشبو لگا کر نکلیں یا زینت کر کے نکلیں، یا جوان عورتوں پر خواہ وہ معمولی لباس میں نکلیں محمول کر سکتے ہیں کیوں کہ ان کے گھر سے نکلنے میں ہی فتنہ ہے، اور یہ ممانعت ان کے مسجدوں میں جانے کی کراہت پر قیاس کی جاتی ہے۔ انتہیٰ۔

(من المؤلف) اس عبارت سے اور اسی طرح پہلی عبارتوں سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوگئی کہ عورتوں کا گھر میں سے نکلنا اور جماعتوں میں شریک ہونا موجبِ فتنہ ہے اور ممانعت کا حکم اس فتنہ سے بچنے کے لیے ہے، زیارت قبور، جمعہ، عیدین، وعظ، استسقاء سب اسی حکم میں داخل ہیں، اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جوان عورتیں خواہ بناؤ سنگار کر کے نکلیں یا معمولی حالت میں؛ بہرحال ان کا نکلنا ناجائز ہے، اور اگرچہ بعض روایتوں سے بوڑھیوں کے لیے نماز فجر و مغرب وعشاء میں جانا بشرطیکہ زینت اور بناؤ سنگار کر کے نہ جائیں جائز معلوم ہوتا ہے؛ لیکن قول مفتی بہ یہ ہے کہ بوڑھیوں کو جانا بھی جائز نہیں جیسا کہ علامہ عینی کی ''شرح کنز'' میں اور ''درالمختار'' کی عبارت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے، اور جب کہ ان عوارض کا لحاظ کیا جائے جو سوال میں مذکور ہیں کہ مجلس وعظ میں خوش الحانی سے اشعار پڑھے جاتے ہیں اور مضامین عشقیہ کے اشعار سنائے جاتے ہیں تو ایسے وعظ میں عورتوں کے جانے کا حکم ایسا نہیں ہے جس میں کسی ذی علم کو کچھ بھی تردد اور تامل ہو سکے۔

عن انس رضی اللہ عنه قال: کان للنبی ﷺ حاد یقال له: انجشة و کان

حسن الصوت، فقال له النبی ﷺ: رویدك یا انجشة ! لا تکسر القواریر، قال قتادة: یعنی ضعفة النساء. متفق علیه. (مشکوٰۃ ۴۱۰)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ کا ایک حُدی خواں تھا اس کا نام انجشہ تھا، اور وہ خوش آواز تھا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے انجشہ ! ٹھیرو کہیں شیشیاں نہ توڑ دینا، قتادہ فرماتے ہیں: شیشیوں سے آپ کی مراد عورتیں ہیں۔ انتہیٰ۔

اس پر مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں: أمر رسول اللہ ﷺ انجشة أن یغض من صوته الحسن و خاف الفتنة علیهن من حُداہ لأن یقع من قلوبهن موقعا لضعف عزائمهن سرعة تأثرهن. (لمعات کذا فی حاشیة المشکوٰۃ)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے انجشہ کو حکم فرمایا کہ اپنی آواز کو پست کردے، اور آپ ﷺ کو خوف ہوا کہ کہیں یہ عورتوں کے دلوں میں کھُب نہ جاوے اور فتنہ واقع ہو کیوں کہ عورتوں کا استقلال کمزور ہوتا ہے اور ان کے دلوں میں ایسی باتوں کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔

(من المؤلف) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک خوش آواز شخص کو زور سے شعر پڑھنے سے صرف اس لیے منع فرمادیا کہ عورتیں ساتھ تھیں، اور اندیشہ تھا کہ اس کی خوش آوازی کی وجہ سے عورتوں کے دلوں میں کسی قسم کی بدخیالی پیدا ہوجائے اور اس کی خوش آوازی سے متأثر ہوکر فتنہ میں پڑ جائیں۔

پس جب کہ آپ ﷺ کو اپنے زمانے کی عورتوں پر جو ہر طرح آنحضرت ﷺ کے فیض سے مشرف تھیں، یہ اندیشہ ہوا کہ خوش آوازی سے وہ بگڑ نہ جائیں تو پھر آج کل کی عورتوں کا کیا ٹھکانہ ہے، پس جس طرح مردوں کے لیے غیر محرم کا گانا سننا حرام ہے، اسی طرح عورتوں کو مردوں کا گانا سننا حرام ہے، اور کسی طرح عورتوں کو ایسے وعظ میں جانا جائز

نہیں جہاں خوش آوازی سے اشعار پڑھے جاتے ہوں اور گایا جاتا ہو۔

رہا یہ امر کہ مجالس وعظ میں اگر عورتوں کے لیے کسی خاص طرف پردے کا انتظام کردیا جائے تو پھر عورتوں کو وعظ میں جانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عورتوں کا گھروں سے نکلنا ہی مکروہ ہے، اور اس نکلنے میں ہی چونکہ فتنے کا احتمال ہے؛ اس لیے اکثر فقہاء نے خروج کو ہی ناجائز قرار دیا ہے کیوں کہ جب عورتوں کے لیے جماعت نماز یا وعظ وغیرہ کے لیے گھر سے نکلنے کی اجازت ہو جائے، اور وہ نکلنے لگیں تو اب ہر وقت اس کی تحقیقات کرنا بہت مشکل ہے کہ آیا وہ مسجد میں ہی گئی اور وعظ میں ہی حاضر ہوئی یا اور کہیں چلی گئی، اور گھر آ کر نماز یا وعظ کا بہانہ کردیا، نیز فقہاء کا یہ حکم کہ عورتوں کو جماعات نماز و وعظ و جمعہ وعیدین میں جانا ناجائز ہے کیوں کہ یہ باعث فساد ہے صراحۃً ان روایات سے معلوم ہو چکا جو اوپر لکھی گئی ہیں، اب غور طلب امر یہ ہے کہ اسباب فتنہ کیا ہیں؟

(۱) عورت گھر سے نماز یا وعظ کے بہانے سے نکلے اور اپنی خباثت نفسانی سے کسی اور جگہ چلی جائے اور گھر والے یہ سمجھیں کہ نماز و وعظ میں گئی ہے۔

(۲) جماعت نماز و مجلس وعظ میں جا کر مردوں کی نظریں اس پر پڑیں گی اور اس لیے اندیشہ ہے کہ کسی غیر مرد کا کسی عورت سے ناجائز تعلق نہ ہو جائے۔

(۳) عورت کی نظر غیر مردوں پر پڑے گی اور اس لیے احتمال ہے کہ عورت کا کسی غیر مرد پر دل آ جائے اور نتیجہ برا ہو۔

یہ تین احتمال ہیں، ان میں سے پہلا احتمال تو اس طرح رفع نہیں ہو سکتا کہ مجلس وعظ میں ان کے لیے پردے کا انتظام کردیا جائے کیوں کہ فتنہ کا احتمال تو نفس خروج عن الدار کو لازم ہے ...... بلکہ اس کا علاج اگر ہے تو یہ ہے کہ عورت کے گھر سے نکلنے کے وقت

سے اس کی واپسی تک کوئی معتبر شخص جو اس کی حرکات وسکنات کو دیکھتا رہے اس کے ساتھ رہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی نہیں کرتا اور نہ اس قدر نگہداشت ان تمام عورتوں کی ہوسکتی ہے جو بصورت نماز یا وعظ میں جانے لگیں گی، اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے عورتوں کو جانے ہی سے منع کیا ان کی نظر زیادہ تر اسی احتمال پر تھی اور عورتوں کے حالات بھی اس کے مقتضی ہیں، اور حضرت عائشہؓ کی روایت کے یہ الفاظ "ما احدث النساء" بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کیوں کہ انھوں نے بد نیتی پیدا کرنے اور ٹٹی کی اوٹ شکار کھیلنے کی نسبت عورتوں کی جانب کی ہے، اور روایت "یتخذنه دغلا" کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی اگر عورتوں کو اجازت خروج عن الدار کی دیدی جائے گی تو وہ اسے اچھا خاصہ بہانہ بنالیں گی اور اس کی آڑ میں اپنی خواہشیں پوری کریں گی، ورنہ اگر اس احتمال کی رعایت فقہاء کو مدِ نظر نہ ہوتی تو یہ بات آسان بھی تھی کہ مساجد میں عورتوں کی نماز کے لیے پردے کی جگہ بنادی جاتی اور عورتوں کو جماعت میں شرکت اور وعظ کی مجلس میں حاضری سے فقہاء منع نہ کرتے؛ لیکن کسی فقیہ نے کسی کتاب میں یہ ترکیب نہیں لکھی کہ مسجد میں عورتوں کے لیے ایک پردے کی جگہ بنادو اور ان کو جماعت میں آنے دو، اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے نفس خروج کو موجب فساد سمجھ کر گھر سے نکلنے کو ہی منع فرمادیا اور اسی وجہ سے اکثر فقہاء کی عبارت میں اس مقام پر خروج کے ہی لفظوں سے اس مسئلہ کو ذکر بھی کیا گیا ہے۔

نیز مندرجۂ ذیل حدیث سے بھی اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

عن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنه عن النبی ﷺ قال: المرأۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفها الشیطان. (رواہ الترمذی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ عورت سرتا

یا پردہ کی چیز ہے، جہاں وہ گھر سے نکلی اور شیطان اس کی تاک میں لگا۔انتہیٰ۔

یہاں رسول خداﷺ نے عورت کے گھر سے نکلنے ہی کو محل فتنہ قرار دیا، اور فرمایا کہ شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے کہ خود اسے بہکا کر کسی نامناسب جگہ لے جائے یا کسی مرد کو بہکا کر اس عورت کی طرف لے آئے اور فتنہ برپا کردے، اور اس روایت پر مکرر نظر ڈالیے جو بحرالرائق کی عبارت میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ رسولِ خداﷺ نے عورت کی اس نماز کو جو کوٹھری کے اندر پڑھے صحن کی نماز سے بہتر، اور اس نماز کو جو صحن مکان میں پڑھے مسجد کی نماز سے بہتر فرمایا ہے یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ عورت اپنے مکان اور اپنے حیزِ استتار واطمینان سے جس قدر دور ہوتی جائے گی اسی قدر احتمال فتنہ قوی ہوتا جائے گا، اسی لیے اخیر میں احتمال آنحضرتﷺ نے ”وبیوتھن خیر لھن“ فرمادیا یعنی ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہے، پس ثابت ہوگیا کہ عورتوں کا گھر سے نکلنا ہی محلِ فتنہ ہے؛ اس لیے مجلسِ وعظ میں پردے کی جگہ مقرر کرنا کچھ مفید نہیں، اور نہ اس کا جواز پر کچھ اثر ہے ورنہ لازم ہے کہ مساجد میں پردہ کی جگہ مقرر کرکے ان کو نمازوں میں حاضر ہونے اور جماعت میں شریک ہونے کی اجازت بھی دیدی جائے اور یہ کسی کتاب سے ثابت نہیں۔

اب دوسرے احتمال پر نظر ڈالیے کہ غیر مردوں کی نظریں عورتوں پر پڑیں گی سو اگرچہ بظاہر یہ وہم ہوسکتا ہے کہ مجلسِ وعظ میں پردے کا انتظام کردینے کی صورت میں یہ احتمال مرتفع ہوجاتا ہے؛ لیکن حقیقت شناس خوب جانتے ہیں کہ مجلسِ وعظ کا پردہ اس احتمال کو بھی رفع نہیں کرسکتا، اکثر ایسی بے احتیاطیاں عمل میں آتی ہیں کہ غیر مردوں کی نظر عورتوں پر پڑجاتی ہیں، اور ایسے مجمعوں میں شریک ہونے والے حضرات اس کی تصدیق کرتے ہیں، اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ مجلس وعظ کا پردہ عورتوں پر غیر مردوں کی نظر پڑنے سے مانع

ہوتا ہے تاہم تیسرا احتمال کہ عورتوں کی نظر مردوں پر پڑے اس پردے سے کسی طرح مرتفع نہیں ہوتا، عورتیں پردے میں سے تمام مجلس کے لوگوں کو جھانکتی تاکتی ہیں، اور آج کل کی عورتوں میں یہ مرض ایسا عام ہے کہ شاید دو چار فیصد عورتیں ہی اس سے مستثنیٰ ہوں تو ہوں ورنہ اتنی بھی نہیں، پس یہ احتمال فتنہ اس پردے سے جو مجلسِ وعظ میں عورتوں کے لیے کیا جاتا ہے کسی طرح مرتفع نہیں ہوتا بلکہ حقیقت پوچھیے تو یہ پردہ کرنا اصل میں عورتوں کو غیر مردوں کے تاکنے جھانکنے کا موقع دینا ہے، اس بات سے کوئی شخص واقف کار بروئے ایمان وانصاف انکار نہیں کرسکتا، اور یاد رہے کہ جس طرح مردوں کو غیر عورتوں پر نظر ڈالنا حرام ہے اسی طرح عورتوں کو غیر مردوں کا دیکھنا حرام ہے، اس کے لیے حدیث ذیل ملاحظہ ہو:

عن ام سلمة رضی اللہ عنها أنها كانت عند رسول الله ﷺ وميمونة اذاقبل ابن ام مكتوم فدخل عليه فقال رسول الله ﷺ احتجبا منه، فقلت: يا رسول اللّٰه! اليس هو اعمى لا يبصرنا، فقال رسول اللّٰه ﷺ: افعميا وان أنتما ألستما تبصرانه. (رواه احمد والترمذی وابوداؤد كذافی المشكوٰة)

ترجمہ: ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میمونہؓ اور ام سلمہؓ دونوں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھیں کہ عبداللہ بن ام مکتوم نے جو نابینا تھے آنے کا ارادہ کیا، آپ نے ان دونوں بیبیوں سے فرمایا کہ پردہ کرو! ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ یہ تو نابینا ہیں ہمیں نہیں دیکھیں گے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم دونوں تو نابینا نہیں ہو تم تو انھیں دیکھو گی۔

اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوگیا کہ عورت کو بھی غیر مرد پر نظر ڈالنا حرام ہے، جب ہی تو آپ ﷺ نے دونوں بیبیوں کو پردہ کرنے کا حکم دیا۔

وكان اصحاب النبی ﷺ يَسُدُّون الثقب والكوى فی الحيطان لئلا

تطلع النساء على الرجال ورأى معاذ امرأته تطلع فی کوة فضربها فينبغی للرجل ان يفعل كذلك ويمنع امرأته عن مثل ذلك. (مجالسِ ابرار ۵۶۳)

اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا یہ طریقہ تھا کہ دیواروں کے سوراخ بند کر دیا کرتے تھے تاکہ عورتیں مردوں کو نہ جھانکیں اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو دیکھا کہ ایک جھروکے سے جھانک رہی تھی تو ان کو مارا، پس مردوں کو چاہیے کہ ایسا ہی کریں اور اپنی بی بی کو ایسی باتوں سے روکیں۔

پس واضح طور سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجلس وعظ کا پردہ کچھ مفید نہیں، اور اس برائے نام رسمی پردے سے فتنہ کے احتمال مرتفع نہیں ہوتے بالخصوص احتمال نمبر (۱) ایک کے رفع کرنے میں تو اس کو کچھ دخل نہیں حالانکہ اصل الاصول وہی ہے، اور احتمال نمبر (۲) بھی بنظر بے احتیاطی اس پردے سے مرتفع نہیں ہوتا، اور احتمال سوم عورتوں کے حالات اور عادات کو دیکھتے ہوئے قطعاً اس پردے سے مرتفع نہیں ہوتا، پس اب ناظرین خود ہی انصاف کرلیں کہ اس پردے کا جواز پر کیا اثر ہوسکتا ہے؟ (کفایت المفتی ۵/۳۹۱ تا ۴۰۱)

حضرت مفتی اعظم نور اللہ مرقدہ کے مندرجۂ بالا مضمون میں آپ کے سوال میں اٹھائے گئے تمام نکات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا، اس کے بعد بھی اگر یہ لوگ تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر یا مکتب کے سالانہ انعامی اجلاس کے موقع پر یا کسی عالم کے وعظ و بیان کے موقع پر عورتوں کو مساجد میں بلانے پر اصرار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان حضرات کو قرآن وحدیث میں موجود حکم شرعی پر عمل کرنے کے بجائے فتنہ انگیزی میں زیادہ دل چسپی ہے، ویسے بھی اس پُرفتن زمانے میں عورتوں کی بے پردگی، بے حیائی اور عریانی کے نتیجہ میں جو خرابیاں معاشرہ میں پھیل چکی ہیں وہ کیا کم ہیں؟ جو دین وایمان کے نام پر

ان کو اور زیادہ ان خرابیوں کو پھیلانے کا موقع فراہم کیا جائے۔ فالی اللّٰہ المشتکی.
قوم کے ذمہ داروں کو چاہیے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور فتنوں کے ان دروازوں کو مزید کھولنے کے بجائے جو کھل چکے ہیں ان کو بند کرنے کی تدابیر اختیار کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　　۱۸/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ

دینی اداروں میں ہونے والی کوتاہیوں کا ذمہ دار کون؟

سوال: ایک مسئلہ عرض خدمت ہے وہ یہ ہے کہ آج کل اکثر دینی مدارس میں تعلیم کی کمزوری کی شکایت کی جاتی ہے، اور اس کا سارا الزام مدرسین کے سر پر ڈالا جاتا ہے کیا یہ ٹھیک ہے؟ کیا انتظامیہ اس کی ذمہ دار نہیں ہے؟ یقیناً مدرسین کی بھی بہت سی کوتاہیاں ہیں؛ لیکن بندہ کے نزدیک بچند وجوہ منتظمین اس کے اہم ذمہ دار ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

(الف) اکثر وبیشتر مدارس میں ایسے مدرس کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اس درجہ کے مناسب نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف سفارشات پر تقرر ہوتا ہے حالانکہ آج دنیوی اداروں کے اندر ایک چھوٹے سے کارکن کو جو رکھا جاتا ہے تو اس پر بھی ان کو سندوں کی ضرورت ہوتی ہے، کیا ہمارے مدارس میں کسی سند کی ضرورت نہیں ہے؟ اکثر مدرسین ایسے ہوتے ہیں مثلاً درجہ تجوید کا مدرس ہے اور اس کے پاس تجوید کی سند ہی نہیں ہے، یا پھر دینیات اور قرآن مجید ناظرہ کا مدرس ہے اور مؤذن بھی ہے، اور حالت یہ ہے کہ وہ صحیح اذان بھی نہیں دے سکتا، اور اس کو مدرس بنایا جاتا ہے، آیا یہ تو بتایئے جو اذان صحیح نہ دے سکے وہ قرآن مجید کو کیا پڑھائے گا پھر اگر تعلیم کی کمزوری ہے تو مدرس کے سر کیوں؟ ایک

مکتب میں ایک ایک مدرس کے سر ۵۰،۵۰ بچے ہیں اور وقت ہے صرف دو گھنٹہ تو کیا یہ قوم کے بچوں کے ساتھ کھلواڑ نہیں ہے؟ اور دینی تعلیم کا مذاق نہیں؟ بہت سے مدارس اور جامعات میں صرف اور صرف جو مدرس کا تقرر ہوتا ہے وہ سفارشات ہی ہوتی ہیں، اور اپنا آدمی رکھا جاتا ہے چاہے کتنا ہی نااہل ہو، وہاں ذرہ بھر استعداد اور قابلیت کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا کیا، اس کو مدرسین کی کوتاہی کہہ سکتے ہیں؟ ایسے حالات میں تعلیمی کمزوری کا واویلا کرنا اور سارا الزام مدرسین کے سر دینا یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اور یہ سب صرف اور صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ یا تو تنخواہ کم دینی پڑے یا پھر مدرس سر نہ اٹھاویں یہ کہاں کے انصاف کی بات ہے؟ حضرت والا کے سامنے تو یہ حالات اور بھی بہت واضح ہیں؛ لہٰذا ان حالات میں مدرسین، منتظمین کی کیا ذمہ داری ہے اس کو خوب وضاحت سے تحریر فرمائیں۔

(ب) بسا اوقات مدرسین کے ساتھ منتظمین کی ان بن یا پھر مدرس کی کسی غلطی پر اس کو رسوا کر کے مدرسہ سے علاحدہ کرنا کیا کہیں یہ طریقہ ثابت ہے؟ آخر مدرس بھی انسان ہے کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہے کہ مدرس کی غلطی پر اس کو محبت، بھائی چارگی اور اس کی کوتاہیوں کی ستر پوشی کر کے اس کو راہِ راست پر لانے کی فکر کی جائے، کیا شریعت اس مسئلہ میں بالکل خاموش ہے؟ آخر یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ اہل مدارس نے مدرسین کو خادم دین نہیں سمجھا بلکہ ان کو ایک عام نوکر تصور کیا جاتا ہے لہٰذا جیسا نوکر کے ساتھ سلوک کرتے ہیں، اسی طرح مدرسین کے ساتھ کیا جاتا ہے؛ نیز مدرسین کی غربت اور کمزوری کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے لہٰذا اب علماء اور بزرگان دین اور مفتیانِ کرام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کی شرعی حیثیت کو لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے، اور سر جوڑ کر اس کی فکر کی جائے اس کی صحیح رہنمائی شریعت کی روشنی میں بیان کی جائے تا کہ مدارس کا بگاڑ ختم ہو، حضرت

بات یہ ہے کہ کسی پر نہ کوئی حملہ ہے نہ کسی پر کوئی نشان لگایا ہے، صرف اور صرف اپنے ایک دلی احساس کا اظہار ہے جو ہم علماء کی ذمہ داری ہے، امید ہے کہ حضرت والا اس پر خوب کھل کر شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف) ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں ''اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں، ان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کردیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے بلکہ ان پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کے لیے اپنے دائرۂ حکومت میں اس کے مستحق کو تلاش کریں۔

پوری اہلیت والا سب شرائط کا جامع کوئی نہ ملے تو موجودہ لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے۔

ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی اور تعلق کی مد میں بغیر اہلیت معلوم کیے ہوئے دیدیا اس پر اللہ کی لعنت ہے، نہ اس کا فرض مقبول ہے، نہ نفل یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔ (جمع الفوائد ۳۲۵)

بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کے لیے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے، تو اس

نے اللہ کی خیانت کی اور رسول اللہ ﷺ اور سب مسلمانوں کی، آج جہاں نظامِ حکومت کی ابتری نظر آتی ہے وہ سب اس قرآنی تعلیم کو نظر انداز کردینے کا نتیجہ ہے کہ تعلقات اور سفارشوں اور رشتوں سے عہدے تقسیم کیے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نااہل اور ناقابل لوگ عہدوں پر قابض ہو کر خلق خدا کو پریشان کرتے ہیں، اور سارا نظامِ حکومت برباد ہو جاتا ہے اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة. یعنی جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کردی گئی جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں تو (اب اس فساد کا کوئی علاج نہیں) قیامت کا انتظار کرو۔ یہ ہدایت صحیح بخاری کتاب العلم میں ہے۔'' (معارف القرآن ۲/ ۴۴۷،۴۴۶)

مشہور مؤرخ اور محدث علامہ شمس الدین ذہبیؒ نے اپنی کتاب ''سیر اعلام النبلاء'' میں حضرت ابو بردہ ابن ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ یزید ابن المهلب جب خراسان کے حاکم مقرر ہوئے تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا آدمی بتلاؤ جس میں تمام خوبیاں موجود ہوں تو حضرت ابو بردہ اشعری رضی اللہ عنہ کی نشان دہی کی گئی جب وہ تشریف لائے تو ان کو بہت فائق پایا، پھر جب ان سے گفتگو کی تو ان کے باطنی حالات ظاہر سے بھی بہتر پائے تو ان سے کہا کہ میں نے آپ کو فلاں فلاں کام کی ذمہ داری سونپی تو حضرت ابو بردہ نے معذرت چاہی؛ لیکن یزید نے معذرت قبول کرنے سے انکار کیا، اس پر حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے کہا اے امیر! میں آپ کو وہ بات سناتا ہوں جو میرے ابا نے مجھے بتلائی انھوں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی کوئی ایسی ذمہ داری قبول کرے جس کے متعلق اس کو بخوبی معلوم ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے الخ (۴/ ۳۴۵)

مندرجۂ بالا دونوں مضامین سے یہ ثابت ہوا کہ منتظمین کا کسی ایسے آدمی کو تدریس کی ذمہ داری سونپنا جو اس کا اہل نہیں ایک قسم کی خیانت ہے، اور جس کو یہ ذمہ داری سونپی جارہی ہے اس کا یہ جانتے ہوئے کہ میں اس کا اہل نہیں اس کو قبول کرنا اپنے آپ کو جہنم کے لیے پیش کرنا ہے۔

البتہ آپ کے سوال میں تضاد ہے ایک طرف آپ لکھ رہے ہیں کہ نااہل کو مدرس بنادیا جاتا ہے جس میں تدریسی ذمہ داری کو انجام دینے کی بالکل صلاحیت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف اس پر تعلیمی کمزوری کا الزام عائد کیا جاتا ہے تو اس کو بھی آپ درست قرار نہیں دیتے۔

(ب) آپ جس مرض کی شکایت کررہے ہیں وہ نیا نہیں بلکہ پرانا ہے، حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ حضرت مولانا عبدالحی کفلیتویؒ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: ''یہاں کے لوگ مدرسین کو جیسے بظاہر خادم سمجھتے ہیں ویسے ہی ان کو حقیقت میں بھی خادم سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ ان پر جابرانہ حکومت کی جاتی ہے جیسے ادنیٰ نوکر پر ایسی حالت میں مدرسین سے مدارس کی ترقی کی امید رکھنا کس قدر تعجب خیز امر ہے، اور آئندہ کس امید پر آدمی کو علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوسکتا ہے۔'' (سوانح علوم اسلامیہ ۳۸)

یہ سب کچھ ہورہا ہے روزمرہ کے نئے نئے قانون بنا کر تنگ کیا جاتا ہے، ایام تعطیلات میں تنگی، رخصت دینے میں سختی کا برتاؤ، خوشامد کرنے والوں سے درگزر کا سلوک، جو خوشامد نہ کرے ان سے سختی کا برتاؤ، نیک نامی خوشامد پر موقوف ہے، ملاحظہ فرمائیں:

علامہ کفلیتویؒ فرماتے ہیں یہاں کے لوگوں کے طبائع میں مادہ خوشامد طلبی کا اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ باوجودیکہ علماء نہایت بزرگ خیال کیے جاتے ہیں تاہم ان کی تعظیم اور ان کے ساتھ سلوک کرنا ان کی خوشامد پر موقوف ہے؛ لیکن جو لوگ دور دراز ملک کا سفر

بغرض تحصیل علوم کرتے ہیں اور دولت علوم سے مالا مال ہوکر آتے ہیں، اور دولت علم پر قانع ہوکے خوشامد سے پہلوتہی کرتے ہیں تو ان کی تعظیم تو درکنار ہے ان کو تنگ کرنے کے لیے اس قدر اسباب فراہم کیے جاتے ہیں کہ ان کے جس قدر خیالات علومِ اسلامیہ کی ترقی کی بابت ہوتے ہیں وہ سب خاک میں مل جاتے ہیں۔(۳۸)

اور فرماتے ہیں: مدرسین کی نیک نامی اور بدنامی یہاں صرف خوشامد اور عدم خوشامد پر مبنی ہے مدرس گوکتنا ہی لائق ہو اور پڑھانے میں گوکیسی ہی جان فشانی کرتا ہو؛ لیکن جب تک خوشامد نہ ہوگی نہ اس کے مشاہرہ میں ترقی ہوسکتی ہے، نہ نیک نامی کا اسے تمغہ مل سکتا ہے۔(سوانح علوم اسلامیہ ۳۸)

بے علم وعمل فاسقوں کو ایسے معزز عہدے سپرد کرنے میں ان کی تعظیم لازم آتی ہے حالاں کہ فاسق واجب الاہانت ہے تعظیم کا مستحق نہیں۔(شامی ۱/۵۲۳)

حاملین قرآن کو جہال وفاسقوں کی ماتحتی اور تابع داری کرنے سے ان کی توہین وتذلیل لازم آتی ہے، جیسے مردوں کا عورتوں کی ماتحتی اور تابع داری میں رہنا تذلیل سمجھا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:اذا کان أمراء کم شرارکم، و اغنیاء کم بخلاء کم، وامورکم الی نسائکم فبطن الارض خیر لکم من ظهرها. (مشکوٰۃ ۴۵۹)

یعنی جب تمھارے سردار فاسق ہوں، اور تمھارے دولت مند بخیل ہوں، اور تمھارے کام عورتوں کے کہنے پر ہوتے ہوں، تب تمھارے لیے زمین کا پیٹ (دفن ہو جانا) بہتر ہے اس کی پشت (جینے) سے۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:"اکرموا حملة القرآن فمن اکرمهم فقد اکرمنی" یعنی حاملین قرآن کی تعظیم کرو، بے شک جنھوں نے ان کی عزت کی اس نے میری عزت

کی۔ (الجامع الصغیر للامام الحافظ السیوطی ۱/ ۴۵)

ایک اور حدیث میں ہے: "حامل القرآن حامل رایة الاسلام، من اکرمه فقد اکرم اللّٰہ، و من اهانه فعلیه لعنة اللّٰہ" **یعنی حاملین قرآن اسلام کے علم بردار ہیں، جس نے ان کی تعظیم کی اس نے خدا کی تعظیم کی، اور جس نے ان کی تذلیل کی اس پر خدا کی لعنت ہے۔** (الجامع الصغیر للسیوطی ۱/ ۱۲۲)

جب متولی و مہتمم وغیرہ نااہل ہوں گے تو ان کے ماتحت ائمہ و مؤذنین اور مدرسین حضرات بھی نااہل ہوں گے، وہ ان علماء کی قدر نہ کرسکیں گے، جو غیرت مند اور خود دار ہوں نتیجہ یہ ہوگا کہ جو علماء اہل ہوں گے وہ بددل ہوکر الگ ہوجائیں گے، نااہل پڑے رہ جائیں گے جس سے ادارہ کے کاموں میں ابتری ہوگی، نہ تعلیم ہوسکے گی، نہ کوئی تبلیغی کام ہوسکے گا جیسا کہ مشاہدہ ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲/ ۱۶۶ تا ۱۶۸)

مدرس کی کسی غلطی پر اس کو رسوا کر کے مدرسہ سے علاحدہ کرنا نہایت کمینہ و قابل مذمت حرکت ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: "قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿ولا تجسسوا﴾ کسی کے پوشیدہ عیوب کو تلاش مت کرو۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ جو زبان سے مسلمان ہوگئے مگر ان کے دلوں تک ایمان نہیں پہونچا وہ سن لیں کہ مسلمانوں کو ایذا نہ پہونچاؤ، ان کے پوشیدہ عیوب کے پیچھے مت پڑو، ان کو گزشتہ عیوب پر عار نہ دلاؤ کیوں کہ جو شخص کسی مسلمان بھائی کے عیوب ڈھونڈتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو ڈھونڈنے لگتے ہیں، اور جس کے عیوب اللہ تعالیٰ ڈھونڈیں قریب ہے کہ اس کو رسوا کردیں گے اگرچہ وہ اپنے بند مکان میں مستور ہو۔ (ترمذی، الجمع الفوائد ۲/ ۱۶۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ بیت اللہ پر نظر ڈالی اور فرمایا اے بیت اللہ تیری شان کتنی بلند ہے اور تیری عزت کتنی بڑی ہے اور مومن کی عزت اور حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے زیادہ بڑی ہے۔ (ترمذی، جمع الفوائد)

اور حدیث میں ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے، نہ اس پر عیب لگاوے، اور جو شخص اپنے کسی بھائی کے کام میں لگے اللہ تعالیٰ اس کے کام میں لگ جاتے ہیں، اور جو شخص کسی مسلمان کو مصیبت وتکلیف سے نکالے اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کی مصیبتوں سے نکال دیں گے، اور جو شخص کسی مسلمان کے عیب چھپائے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیوب چھپائیں گے۔ (ترمذی وقال حسن صحیح غریب از زواجر)

آج کل یہ کبیرہ گناہ بھی وبا کی طرح عام ہوگیا ہے عوام وخواص سب اس میں مبتلا ہوگئے، لوگوں کے پوشیدہ عیوب کی تلاش اور کوئی بات مل جاوے تو اس کا چرچا کرنا رسوا کرنا عادت میں داخل ہوگیا، کسی کو دھیان بھی نہیں ہوتا کہ ہم نے اس میں کوئی گناہ کیا اور یہ وہ بےلذت گناہ ہے کہ اس میں کسی کا کوئی دنیوی فائدہ نہیں اور عمر بھر نہ کرے تو کوئی نقصان نہیں مگر بےحسی اور بدمذاقی سے بہت سے لوگوں کو اسی میں ذائقہ ولذت محسوس ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔ آمین۔ (گناہ بےلذت ۱۱،۱۲)

اصل تو یہ ہے کہ کسی مدرس سے ہونے والی غلطی ایسی ہے جس سے مدرسہ کے نظام میں کوئی خلل واقع نہ ہو، نیز طلباء کے اخلاقیات پر کوئی غلط اثر مرتب نہ ہو تو محبت اور رواداری کے ساتھ اس کو اس غلطی سے آگاہ کرکے اس کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا جائے اس کی ذمہ داری اور مقام کا احساس دلاکر اس کی اصلاح کی پوری کوشش کی جائے، اس کے باوجود اگر وہ اس سے باز نہ آئے اور مزید چشم پوشی مدرسہ کے لیے مضر ہو تو بأحسن وجوہ

اس کو علاحدہ کیا جائے، نکاح جیسے پاکیزہ رشتہ میں اصل یہ ہے کہ طرفین آپسی حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کریں اور جب کسی طرح اس کا امکان باقی نہ رہے تو بھلے طریقے سے علاحدگی اختیار کرلے اسی کو قرآن پاک میں ﴿فامساك بمعروف او تسريح باحسان﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے یہی اصول یہاں بھی جاری ہونا چاہیے، مشکل یہ ہے کہ آپ نے اپنے سوال میں مدرسین کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کا تو تذکرہ کیا ہے؛ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مدرسہ کے ذمہ دار منتظمین اوپر بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق اصلاح کی تدابیر اختیار کر چکنے کے بعد جب علاحدگی والے پہلو کو اختیار کرتے ہیں تو علاحدہ ہونے کے بعد مدرس کی طرف سے ناظم مدرسہ کے خلاف مستقل ایک پروپیگنڈہ محاذ کھول دیا جاتا ہے اور وہ ساری باتیں جو اصلاح کے خاطر ناظم کی طرف سے چھپائی گئی تھی اس سے غلط فائدہ اٹھا کر عوام میں یہ بات پھیلائی جاتی ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں ہے مجھے بلا وجہ محض ذاتی عداوت کی بنیاد پر علاحدہ کیا گیا، اب یہ چیز اتنی عام ہونے لگی ہے کہ اس کے نتیجہ میں عوام میں ناظم کے خلاف غم وغصہ کی لہر پھیل جاتی ہے اور وہ نظام مدرسہ کی تبدیلی کی تحریک اختیار کر لیتی ہے، اور اچھا خاصہ چلتا ہوا مدرسہ تعلیمی اور انتظامی خلفشار کا شکار ہو جاتا ہے یہ محض خیالی چیز نہیں بلکہ واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں، اور اسی طرح کے پیش آنے والے بعد کے سنگین حالات سے نمٹنے کی غرض سے منتظمین حضرات مدرس کو پہلے ہی بدنام کر کے علاحدہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے جرائم چھپا کر عوام میں انتظامیہ کے خلاف کوئی غلط پروپیگنڈہ کرنے کے قابل نہ رہے یہ سب باتیں حقیقت میں فریقین میں امانت و دیانت کی قلت اور فقدان کا نتیجہ ہیں اسی لیے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں فریق اپنے مقام و منصب کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں امانت و دیانت

کے تقاضوں کو پورا کریں۔

حدیث پاک میں عورت کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد موجود ہے: "المرأة كالضلع ان اقمتها كسرتها و ان استمتعت بها استمتعت بها وفيها عوج" (بخاری شریف ۲/۷۷۹)

یعنی عورت کا حال پسلی کی طرح ہے کہ اس کی کجی کے باوجود اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو تو اٹھالو ورنہ اگر سیدھا کرنے جاؤ گے تو ٹوٹ جائے گی۔ مطلب کہ عورت کے مزاج میں قدرتی طور پر کجی ہے وہ ایک فطری وصف ہونے کی وجہ سے کوئی آدمی بالکل ختم کرنا چاہے تو یہ ممکن نہیں؛ البتہ اصلاح کی کوشش جاری رکھے اور اس فطری کجی کے نتیجہ میں پیش آنے والی تکالیف اور پریشانیوں پر صبر سے کام لے۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فیض الباری میں فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ اگر کسی نظام میں کوئی خلل اور کمزوری ہو اور اس کی اصلاح کرنے میں اس نظام کے بالکلیہ ختم ہوجانے کا اندیشہ ہو تو مناسب ہے کہ اس کی اس کمزوری کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس کو چھیڑا نہ جائے، اور اگر کسی کے لیے ایسا کرنا دشوار ہے تو اس کے حق میں اس کو خیرباد کہنا بہتر ہے۔ (فیض الباری ۴/۳۰۱)

آج کل مدارس عربیہ ہی کیا جتنے بھی ادارے دین یا دنیا کا کوئی کام کر رہے ہیں ان کا یہی حال ہے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص اور کمی ضرور ہے، اب اس کی اصلاح کا طریقۂ کار یہ نہیں کہ اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو لوگوں میں پھیلایا جائے بلکہ اپنی حیثیت مقام اور مرتبہ کے مطابق اس کی درستگی کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہو اس میں دریغ نہ کریں اور اس کے ساتھ اپنی وابستگی باقی رکھیں؛ لیکن اگر باوجود اپنی مخلصانہ مساعی کے اس کی درستگی کی کوئی توقع نہ رہے تو نہایت خاموشی اور شرافت کے ساتھ اس سے اپنی وابستگی ختم

کردے؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ مذکورہ طریقۂ کار اختیار کرنے کے بجائے عام طور پر اس سے وابستہ حضرات اس ادارہ یا مدرسہ کے عیوب اور کمزوریوں کو درست کرنے کی کوشش تو کیا کرتے ان عیوب کے حوالے سے اس ادارہ یا مدرسہ کو عوام مسلمین میں بدنام کر کے مارِ آستین ثابت ہوتے ہیں اور وقت آنے پر علاحدگی کے بعد کھلم کھلا میدان میں آکر اس ادارے کو ختم کرنے کے لیے پورا زور لگاتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۳/صفر المظفر ۱۴۲۴ھ

داڑھی کی شرعی حیثیت

کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ:

(۱) داڑھی کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

(۲) آیا ہر مسلمان کے لیے داڑھی رکھنا سنت ہے یا واجب؟

(۳) اگر کوئی داڑھی منڈ وائے تو اس کا یہ فعل حرام ہے یا ناجائز یا اور کچھ؟

(۴) اگر کسی کو سرکاری سروس میں مثلاً پولس، فوج وغیرہ میں داڑھی رکھنے سے روکا جائے تو کیا یہ مداخلت فی الدین نہیں ہے؟

تمام مذکورہ سوالات کے باحوالہ جوابات مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور و عندالناس مشکور ہوں۔

سائل: معزالدین احمد، مباحثِ فقہیہ جمعیت علماء ہند

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری نوراللہ مرقدہ نے آپ کے سوال میں اٹھائے ہوئے تمام نکات کا تفصیلی جواب دیا ہے اسی کی جستہ جستہ

عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

مردوں کے لیے ڈاڑھی رکھنا واجب ہے، اور اس کی مقدار شرعی ایک قبضہ یعنی ایک مشت ہے، ڈاڑھی رکھنا تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی متفقہ سنت مستمرہ ہے، اسلامی اور قومی شعار ہے، شرافت اور بزرگی کی علامت ہے، چھوٹے اور بڑے میں امتیاز وفرق کرنے والی ہے، اسی سے مردانہ شکل کی تکمیل اور صورت نورانی ہوتی ہے، آنحضور ﷺ کا دائمی عمل ہے، اور حضور ﷺ نے اسے فطرت سے تعبیر فرمایا ہے، اور آپ نے اپنی امت کو ڈاڑھی رکھنے کا تاکیدی حکم فرمایا ہے؛ لہذا ڈاڑھی رکھنا واجب اور ضروری ہے منڈانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اس پر امت کا اجماع ہے، حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتی ہیں: عشر من الفطرة قص الشارب واعفاء اللحية الخ یعنی دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: (۱): مونچھوں کا کتروانا۔ (۲): ڈاڑھی بڑھانا الخ (مسلم شریف ۱۲۹ باب خصال الفطرة، کتاب الطهارة)

اس حدیث میں جو کہ نہایت قوی ہے دس چیزوں کو جن میں سے ڈاڑھی کا بڑھانا اور مونچھوں کا کتروانا بھی ہے فطرت بتلایا ہے، اور فطرت عرفِ شرع میں ان امور کو کہا جاتا ہے جو کہ تمام انبیاء اور رسل کی معمول بہ اور متفق علیہ سنت ہو اور ہم کو ان پر عمل کرنے کا حکم ہو۔ صاحب مجمع البحار اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: عشر من الفطرة اى من السنة اى سنن الانبياء عليهم السلام التى امرنا بالاقتداء بهم فيها. ك. اى من السنة القديمة التى اختارها الانبياء عليهم السلام واتفقت عليها الشرائع فكأنها امر جبلى فطروا عليه. یعنی دس چیزیں فطرت یعنی سنت میں سے ہیں یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ان سنتوں میں سے جن کی اقتداء کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

(اولئك الذين هدى الله فبهدا هم اقتده) یعنی اس سنتِ قدیمہ میں سے جس کو انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا اور اس پر تمام شرائع متفق ہیں گویا کہ وہ امر جبلی ہے جس پر انبیاء علیہم السلام کو پیدا کیا گیا ہے۔ (مجمع البحار ۴/ ۱۵۵ فطر) امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں: قالوا ومعناه انها من سنن الانبياء صلوات الله وسلامه عليهم یعنی فطرت کے معنی یہ ہیں کہ وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں میں سے ہے۔ (نووی شرح مسلم ۱/ ۱۲۸) اس حدیث سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ڈاڑھی بڑھانے کا حکم تمام شریعتوں میں تھا اور یہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت رہی ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: قال النبی ﷺ خالفوا المشركين اوفروا اللحى واحفوا الشوارب وفى رواية انهكوا الشوارب واعفوا اللحى متفق عليه. (مشکوٰۃ شریف ۳۸۰ باب الترجل)

یعنی مشرکین کی مخالفت کرو مونچھیں پست کرو (چھوٹی کرو) اور ڈاڑھی کو معاف رکھو۔ (یعنی اسے نہ کاٹو) اور ایک حدیث میں ہے ارخوا اللحی ڈاڑھی لٹکاؤ۔ ان احادیث میں حضور ﷺ صیغۂ امر کے ساتھ ڈاڑھی رکھنے کا حکم فرما رہے ہیں، اور امر حقیقت میں وجوب کے لیے ہوتا ہے، نیز ڈاڑھی منڈانے میں کفار، اناث (عورتیں) اور مخنثوں کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے جس کا ناجائز اور حرام ہونا احادیث سے ثابت ہے۔ من تشبه بقوم فهو منهم (ابوداؤد شریف) ایک حدیث میں ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں: اللہ لعنت کرتے ہیں ان مردوں پر (جو ڈاڑھی منڈا کر یا زنانہ لباس پہن کر) عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف ۳۸۰) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اللہ کے رسول ﷺ

نے لعنت فرمائی ہے ان مردوں پر جو مخنث بنتے ہیں، اور اسی طرح ان عورتوں پر (جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں) اور فرمایا انہیں اپنے گھروں سے نکال دو۔

عن ابن عباس قال:لعن النبی ﷺ المخنثین من الرجال والمترجلات من النساء وقال اخرجوھم من بیوتکم. (مشکوٰہ شریف ۳۸۰)

مالابدمنہ میں ہے: مرد را تشبہ بہ زنان وزن را تشبہ بہ مردان ومسلم را تشبہ بہ کفار وفساق حرام است یعنی مرد کو عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا اور عورت کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔ (مالابدمنہ ص ۱۳۱)

لہذا کفار وفساق کی مشابہت اختیار کرنے سے بچنا ضروری ہے۔

مفسرین نے ”ولآمرنھم فلیغیرن خلق اللّٰہ“ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ڈاڑھی منڈانا بھی تغییر خلق اللہ ہے یعنی اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑنا ہے۔ (بیان القرآن ۱۵۹ پارہ ۵ حاشیہ) (ترجمۂ شیخ الہند ۱۲۷ تفسیر حقانی ۳/۲۲۹ پارہ ۵ سورۂ نساء)

اور بالاتفاق تغییر خلق اللہ حرام ہے۔ شیطان لعین نے یہ کہا تھا کہ میں خدا کے بندوں کو حکم دوں گا کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بگاڑیں، معلوم ہوا کہ جو لوگ ڈاڑھی منڈا کر اپنی فطری صورت بگاڑتے ہیں وہ شیطان لعین کے حکم کی تعمیل اور اس کی مرضی کا کام کرتے ہیں اور جو لوگ شیطان مردود کے فرماں بردار ہیں وہ بڑے ہی خسارے میں ہیں۔ ارشاد خداوندی میں ہے: ﴿ومن یتخذ الشیطان ولیا من دون اللّٰہ فقد خسر خسرانا مبینا﴾ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بناوے گا وہ صریح نقصان میں پڑے گا۔

تفسیر روح البیان میں ہے: حلق اللحیۃ قبیح بل مثلۃ وحرام وکما ان

حلق شعر الرأس فی حق المرأة مثلة منهی عنها وتفویت للزینة کذلك حلق اللحیة مثلة فی حق الرجال وتشبه بالنساء منهی عنه وتفویت للزینة قال الفقهاء اللحیة فی وقتها جمال وفی حلقها تفویت للزینة علی الکمال ومن تسبیح الملائکة سبحان من زین الرجال باللُّحیٰ وزین النساء بالذوائب.

یعنی ڈاڑھی منڈانا قبیح ہے بلکہ مثلہ اور حرام ہے جس طرح عورت اگر اپنے سر کے بال منڈادے تو یہ مثلہ ہے جو ممنوع ہے اور اس سے عورت کی زینت ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح مرد اگر ڈاڑھی منڈادے تو یہ بھی مثلہ ہے اور اس سے مردانہ شان ختم ہو جاتی ہے، فقہاء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ڈاڑھی اپنے وقت میں جمال ہے اور اس کو منڈادینا زینت کو ختم کرنا ہے اور ملائکہ کی تسبیح ہے، ''سبحان......'': پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھی سے زینت بخشی اور عورتوں کو لٹوں اور چوٹیوں سے۔(روح البیان ۲۲۲ تحت الآیة واذا ابتلی ابراهیم ربه بکلمات فاتمهن)

ہدایہ میں ہے: لان حلق الشعر فی حقها مثلة کحلق اللحیة فی حق الرجال یعنی عورت کا سر کا بال منڈانا مثلہ ہے جس طرح مرد کا ڈاڑھی منڈانا مثلہ ہے۔

(هدایه ۱/۲۳۵ باب الاحرام کتاب الحج، هکذا فی الجوهرة النیرة ۱/ ۱۶۷ کتاب الحج)

ڈاڑھی منڈانا قوم لوط کی ہلاکت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، درمنثور میں ہے قوم لوط دس برے کاموں کی وجہ سے ہلاک کی گئی ان میں سے ایک ڈاڑھی منڈانا بھی ہے۔ واخرج اسحاق بن بشیر والخطیب وابن عساکر عن الحسن قال: قال رسول الله ﷺ عشر خصال عملتها قوم لوط بها اهلکوا وتزیدها امتی نجلة اتیان الرجل بعضها بعضا الی قوله وقص اللحیة وطول الشارب الخ.

(درمنثور ٤/ ٣٢٤ سورۂ انبیاء پارہ ١٧ تحت الآیۃ ولوطا آتیناہ حکما وعلما ونجینا ہ من القریۃ الخ)

جب کسریٰ کے دو قاصد ڈاڑھی منڈائے اور مونچھیں بڑھائے ہوئے حضرت رسول مقبول ﷺ کے دربار میں حاضر ہوئے تو آپ ان کی یہ صورت دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوئے پوچھا کہ ایسی صورت بنانے کا تم کو کس نے حکم دیا ہے؟ کہنے لگے ہمارے رب کسریٰ نے، آپ نے فرمایا: لکن امرنی ربی ان احفی شاربی واعفی لحیتی یعنی لیکن میرے رب نے تو مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں پست کرنے کا حکم دیا ہے۔

(طبقات ابن سعد جلد اول بحوالہ ڈاڑھی کا وجوب مصنفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ)

بڑی عبرت کا مقام ہے حضور ﷺ نے جب کافر کو ایسی حالت میں دیکھا تو اس ہیئت وصورت کو ناپسند فرماتے ہوئے نفرت کا اظہار کیا، اور ہم حضور ﷺ کے نام لیوا ہو کر اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی محبت کے دعوی دار بن کر یہ شنیع حرکت کریں! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کو اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔

رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ان سے فرمایا میرے بعد قریب ہے کہ تیری زندگی دراز ہو لوگوں کو خبر دینا کہ جو شخص اپنی ڈاڑھی میں گرہ لگائے یا ڈاڑھی چڑھائے یا تانت کا قلادہ ڈالے یا گوبر اور ہڈی سے استنجاء کرے تو محمد (ﷺ) اس سے بری ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے: عن رویفع بن ثابت قال: قال لی رسول اللہ ﷺ یارویفع لعل الحیوۃ ستطول بك بعدی فاخبر الناس ان من عقد لحیته او تقلد وترا او استنجی برجیع دابة او عظم فان محمدا منه بریٔ. رواہ ابو داؤد.

(مشکوٰۃ شریف ٤٣ باب آداب الخلاء)

جب ڈاڑھی لٹکانے کے بجائے چڑھانے پر یہ وعید ہے تو منڈانے اور شرعی مقدار (قبضہ) سے کم کرنے پر کیا وعید ہوگی؟ (ملخص از فتاویٰ رحیمیہ ۶/۲۳۶ تا ۲۴۲)

صاحب درمختار تحریر فرماتے ہیں: واما الاخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة و مخنثة الرجال فلم يبحه احد واخذ كلها فعل هنود الهند ومجوس الاعاجم. (درمختار مع الشامی ۲/ ۱۵۵)

ترجمہ: اور ڈاڑھی میں سے لینا اس حال میں کہ وہ مشت سے کم رہ جائے جیسا کہ بعض مغربی اور مخنث کرتے ہیں، پس اس کو کسی نے مباح نہیں کہا اور کل کا منڈانا ہند کے کفار کا فعل ہے اور عجم کے مجوسیوں کا طریقہ ہے۔ كذا فى فتح القدير (غاية الاوطار ۱/ ۵۲٤ باب ما يفسد الصوم ومالا يفسده)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں قوله لم يبحه احد نص فى الاجماع. (بوادر النوادر ۲/ ٤٤٣) یعنی صاحب درمختار (وفتح القدیر) کا قول "لم يبحه احد" ڈاڑھی منڈانے اور کٹوانے کی حرمت پر اجماع کی صریح دلیل ہے۔

تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ میں ہے: وقال العلائى فى كتاب الصوم قبيل فصل العوارض ان الاخذ من اللحية وهى دون القبضة كمايفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال لم يبحه احد، وأخذ كلها فعل يهود الهندومجوس الاعاجم. فحيث ادمن على فعل هذا المحرم يفسق وان لم يكن ممن يستخفونه ولايعدونه قادحا للعدالة والمروءة. (تنقيح الفتاوى الحامدية ۱/ ۳۵۱)

خلاصہ یہ ہے کہ ایک مشت سے کم ڈاڑھی رکھنے کو کسی نے مباح قرار نہیں دیا۔

علامہ محمود خطاب لکھتے ہیں: فلذلك كان حلق اللحية محرما عند ائمة

المسلمين المجتهدين ابی حنيفة ومالك والشافعی وغيرهم (المنہل ۱/۱۸۶ بحوالہ ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں) **یعنی اسی وجہ سے تمام ائمۂ مجتہدین جیسے امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد وغیرھم رحمہم اللہ کے نزدیک ڈاڑھی منڈانا حرام ہے۔**

فیض الباری شرح البخاری میں ہے: واما قطع مادون ذلك فحرام اجماعا بين الائمة رحمهم الله. **ڈاڑھی اس طرح کاٹنا کہ قبضہ سے کم رہ جائے باتفاقِ ائمہ حرام ہے۔** (۳۸۰/۴)

نصاب الاحتساب میں ہے: مسئله: هل يجوز حلق اللحية كمايفعله الجوالقيون؟ الجواب: لايجوز ذكره فی كراهية التجنيس والمزيد وفی جنايات الهداية، وقال عليه السلام احفوا الشوارب و اعفوا اللحی ای قصوا الشوارب واتركوا اللحی ولاتحلقوها ولا تقطعوها ولا تنقصوها فی القدر المسنون وهی القبضة.

ترجمہ: مسئلہ: ڈاڑھی منڈانا جائز ہے یا نہیں؟ الجواب: التجنیس والمزید کی کتاب الکراھیۃ اور ہدایہ کے باب الجنایات میں مذکور ہے کہ (ڈاڑھی منڈانا) جائز نہیں ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا اپنی مونچھوں کو چھوٹا کرو اور ڈاڑھیوں کو گھنی کرو اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دو اور مقدار مسنون سے کم نہ کرو اور وہ ایک قبضہ ہے۔ (نصاب الاحتساب ۱۴، ۱۵ قلمی باب ۶)

مالابدمنہ میں ہے: تراشیدن ریش بیش از قبضہ حرام است یعنی ڈاڑھی منڈانا اور ایک قبضہ سے کم رکھنا حرام ہے۔ (مالابدمنہ ۱۳۰)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: حلق کردن لحیہ حرام است، وروش افرنج وھنود است، وگذاشتن آن بقدر قبضہ واجب است، واورا سنت گویند بمعنی طریقۂ مسلوک در دین است یا بہ جہت آں کہ ثبوت آں بہ سنت است چناں کہ نماز عید

راسنت گفتہ اند۔یعنی ڈاڑھی منڈانا حرام ہے اور اہل مغرب اور ھندوؤں کا طریقہ ہے ڈاڑھی ایک مشت رکھنا واجب ہے، اور اس کو سنت اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ یہ دین میں طریقۂ مسلوکہ ہے یا؛ اس لیے سنت کہا جاتا ہے کہ یہ سنت سے ثابت ہے چناں چہ نماز عید کو (اسی معنی کے اعتبار سے) سنت کہا جاتا ہے۔ (حالاں کہ وہ واجب ہے) (اشعۃ اللمعات ۱/۲۱۲، فتاویٰ رحیمیہ ۶/۲۴۴ تا ۲۴۶)

مذکورہ بالا تفصیل میں آپ کے سوالات کے جوابات آچکے ہیں پھر بھی سہولت کی غرض سے نمبروار جواب دیا جاتا ہے۔

(۱،۲) مردوں کے لیے ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور اس کی مقدار شرعی ایک قبضہ یعنی ایک مشت ہے، ڈاڑھی رکھنا تمام انبیاء علیہم السلام کی متفقہ سنت مستمرہ ہے، اسلامی اور قومی شعار ہے۔

(۳) ڈاڑھی منڈانا حرام ہے۔

(۴) یقیناً یہ مداخلت فی الدین ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

قرآنی مسابقہ کا حکم

کیا فرماتے ہیں علماء شرع متین مسئلہ مذکورۃ الذیل میں کہ:

قرآن پاک کی تجوید وقراءت وغیرہ خالص دینی امور میں مسابقہ کا رواج دینا صحیح ہے؟ حدیث پاک میں وسائل جہاد، گھوڑ دوڑ اور ترامی میں ثابت ہے؛ لیکن وہ وسائل ہیں، دینی امر جو عبادت ہے اس میں اور وسائل میں زمین وآسمان کا فرق ہے، تلاوت قرآن خوانی اور قراءت وتجوید یہ تو عبادت اور خالص دین ہے اس میں مسابقہ کیسا؟ اگر

کسی نص سے یا فقہاء کے کلام سے ثابت ہو تو اس کی نشان دہی صراحت وصفائی کے ساتھ ظاہر فرمائیں، مجھے اس سلسلہ میں صرف خلجان ہی نہیں بلکہ نص صریح سے عدم صحت نظر آتی ہے؛ اس لیے اس کی وضاحت کا طالب ہوں۔ بخاری شریف جلد اول کتاب الجھاد ص: ۳۹۴ پر روایت موجود ہے: عن ابی موسی قال: جاء رجل الی النبی ﷺ فقال: الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر والرجل یقاتل لیری مکانه، فمن فی سبیل اللّٰہ؟ قال: من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللّٰہ. حدیث پاک کے کلمات میں غور کر لیجیے صاف نظر آ رہا ہے یہ روایت اور کتب حدیث میں بھی مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

لوگوں میں قرآن پاک کو صحتِ حروف اور تجوید کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کا شوق وذوق پیدا ہو، اور اس کا رواج عام ہو اس مقصد سے اگر کوئی ادارہ یا کوئی شخص اپنی طرف سے انعام کا نظم کر کے علومِ دینیہ کے طلبہ میں مسابقہ رکھے تو یہ جائز ہے، یہ چیز قرآن وحدیث اور علومِ دینیہ جو مدارِ دین ہیں ان کی ترویج اور تقویت کا باعث ہے، مدارس عربیہ میں امتحانات کے موقع پر تمام درجات وعلوم میں اعلیٰ نمبر پانے والے طلبہ کو خصوصی انعامات سے نوازنے کا دستور زمانۂ قدیم (زمانۂ اکابر) سے چلا آ رہا ہے۔

آپ نے جو روایت پیش فرمائی ہے اس سے عدمِ جواز ثابت نہیں ہوتا اس میں تو نیت پر کلام کیا گیا ہے، خود جہاد میں (جو اس روایت میں منصوص ہے) خصوصی کارنامہ انجام دینے والے مجاہدین کو نفل (یعنی خصوصی انعام) سے نوازا جانا کتبِ حدیث وفقہ میں مصرح ہے، کتبِ فقہ اور شروح حدیث سے چند عبارتیں پیش ہیں:

(ولا باس بالمسابقة فى الرمى والفرس) والبغل والحمار كذا فى الملتقى والمجمع ...... (والابل و) على (الاقدام) ...... (حل الجعل) ...... (ان شرط المال) ...... (من جانب واحد وحرم لو شرط) فيها (من الجانبين) لانه يصير قمارا (الااذا ادخلا ثالثا) محللا (بينهما)...... (و) كذا الحكم فى (المتفقهة) (تنوير الابصار مع شرحه الدر المختار) (قوله وكذا الحكم فى المتفقهة) اى على هذا التفصيل، وكذا المصارعة على هذا التفصيل وانما جاز لان فيه حثا على الجهاد وتعلم العلم فان قيام الدين بالجهاد والعلم فجاز فيما يرجع اليهما لا غير كذا فى فصول العلائى. (شامى ٥/ ٢٨٤ كوئٹه)

ولوقال واحد من الناس لجماعة من الفرسان اوللا ثنين فمن سبق فله كذا من مال نفسه او قال للرماة من اصاب الهدف فله كذا جاز لانه من باب التنفيل من بيت المال كالسلب ونحوه يجوز فما ظنك بخالص ماله. فصار انواع السبق اربعة: ثلاثة منها جائزة وواحد منها لا يجوز وقد ذكرنا الجميع ويعرف ذلك بالتأمل. وعلى هذا الفقهاء اذا تنازعوا فى المسائل وشرط للمصيب منهم جعل جاز ذلك اذا لم يكن من الجانبين على ماذكرنا فى الخيل لان المعنى يجمع الكل اذ التعليم فى البابين يرجع الى تقوية الدين واعلاء كلمة اللّٰه الخ (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق للزيلعى ٦/ ٢٢٨، شامى ٥/ ٥٣١)

وحكى عن الشيخ الامام الجليل ابى بكر محمد بن الفضل انه اذا وقع الاختلاف بين المتفقهين فى مسئلة وارادا الرجوع الى الاستاذ وشرط احدهما لصاحبه انه ان كان الجواب كماقلت اعطيتك كذا، وان كان

الجواب كما قلت فلا آخذ منك شيئا ينبغى ان يجوز على قياس الاستباق على الافراس، وكذلك اذا قال واحد من المتفقهة لمثله تعال حتى نطارح المسائل فان اصبت واخطأت اعطيتك كذا وان اصبت واخطأت فلا آخذ منك شيئا يجب ان يجوز وبه اخذ شيخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانى كذا فى المحيط وما يفعله الامراء فهو جائز ايضا بان يقولوا لاثنين ايكما سبق فله كذا. (عالمگیری ۵/ ۳۲٤)

ان اعرابيا جاء الى رسول اللّٰه ﷺ فقال ان الرجل يقاتل للذكر ويقاتل ليحمد ويقاتل ليغنم ويقاتل ليرى مكانه، فقال رسول اللّٰه ﷺ من قاتل حتىٰ تكون كلمة اللّٰه هى الاعلى فهو فى سبيل اللّٰه عز وجل (سنن ابو داؤد) ان الرجل يقاتل للذكر اى ليذكر بين الناس ويشتهر بالشجاعة ويقاتل ليحمد اى ليحمده الناس على شجاعته ويقاتل ليغنم اى ليحصل له من مال الغنيمة ويقاتل ليرى مكانه اى مرتبته من الشجاعة، فمرجع الذى قبله الى السمعة ومرجع هذا الى الرياء وكلاهما مذموم، فقال رسول اللّٰه ﷺ من قاتل حتى تكون كلمة اللّٰه هى الاعلى فهو فى سبيل اللّٰه عز وجل، قال الحافظ المراد بكلمة اللّٰه دعوة اللّٰه الى الاسلام يحتمل ان يكون المراد انه لا يكون فى سبيل اللّٰه الا من كان سبب قتاله طلب اعلاء كلمة اللّٰه فقط بمعنى انه لو اضاف الى ذلك سببا من الاسباب المذكورة اخل بذلك ويحتمل ان لا يخل اذا حصل ضمنا لا اصلا ومقصودا وبذلك صرح الطبرى فقال اذا كان اصل الباعث هو الاول لا يضره ماعرض له بعد ذلك وبذلك قال الجمهور والحاصل ان القتال منشأة القوة العقلية والقوة

الغضبية والقوة الشهوانية ولا يكون فى سبيل اللّٰه الا الاول. (بذل المجهود ۱۱/ ۴۳۵ بیروت)

(عن ابى هريرة رضى اللّٰه تعالىٰ عنه ان رجلا) لم اقف على تسميته (قال يارسول اللّٰه ﷺ رجل يريد الجهاد فى سبيل اللّٰه وهو يبتغى عرضا من عرض الدنيا) بفتح المهملة والراء اى متاعها وهذا القول يحتمل معنيين او لهما معناه يريد الجهاد فى سبيل اللّٰه باعتبار الظاهر والحال ان مطلوبه الاصلى ومقصوده الحقيقى عرض الدنيا وثانيهما معناه انه يريد الجهاد فى سبيل اللّٰه باعتبار نيته والحال انه يطلب معه عرض الدنيا ويخلط معه نية حصولها (فقال النبى ﷺ لااجر له) فعلى الاول معناه لا اجر له مطلقا وهو خائب ممقوت وعلى الثانى لااجر له كاملا (بذل المجهود ۱۱/۴۳۳،۳۳۴ بیروت)

وفى السير الكبير: ان طلب الدنيا على نوعين، الاول: ان يكون مقصودا فذاك هوذا والثانى تبعا فلا بأس به (ولا جناح عليكم ان تبتغوا فضلا من ربكم) الآية (حاشیۂ بذل المجهود ۱۲/ ۱۳)

اما المسئلة الثالثة: وهى هل يجوز الوعد بالتنفيل قبل الحرب ام ليس يجوز ذلك فانهم اختلفوا فيه فكره ذلك مالك واجازه جماعة وجه قوله ان الغزو انما يقصد به وجه اللّٰه العظيم ولتكون كلمة اللّٰه هى العليا واذا وعد الامام بالنفل قبل الحرب ضيف ان يسفك الغزاة دماءً فى حق غير اللّٰه و وجه قول الجماعة ظاهرحديث حبيب بن مسلمة ان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم كان ينفل فى الغزو فى البدء وفى القفول الثلث. (بذل المجهود ۱۲/ ۳۰۳)

ثم ذكر حديث ابى هريرة رضى اللّٰه تعالىٰ عنه ان رجلا سأل النبى ﷺ

فقال رجل يريد الجهاد فى سبيل الله وهو يريد عرض الدنيا فقال عليه الصلوٰة والسلام لااجر له الحديث قال ثم تاويله من وجهين احدهما ان يرى انه يريد الجهاد ومراده فى الحقيقة المال فهذا كان حال المنافقين ولااجر له او يكون معظم مقصوده المال وفى مثله قال عليه الصلوٰة والسلام للذى استؤجر على الجهاد بدينارين انما لك ديناراك فى الدنيا والآخرة واما اذا كان معظم مقصوده الجهاد ويرغب معه فى الغنيمة فهو داخل فى قوله تعالىٰ ﴿ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم﴾ يعنى التجارة فى طريق الحج فكما انه لا يحرم ثواب الحج فكذا الجهاد. (شامی ۳/ ۲۳۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۱۶/محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

عورتوں کا اصلاحی وانعامی اجلاس منعقد کرنا

محترم المقام عالی جناب حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون گزارش خدمتِ عالیہ میں یہ ہے کہ دینی اصلاحی اور تبلیغی لائن سے دنیا بھر میں کام ہو رہا ہے، مردوں کے ساتھ مستورات بھی اپنے محرموں کے ساتھ ساتھ آتی ہیں مردوں کا قیام مسجد میں اور مستورات کا کسی کے مکان میں رہتا ہے جہاں فضائل اعمال کی تعلیم اور اصلاحی بیان ہوتا ہے، جماعت میں جڑنے اور اپنی اصلاح کے لیے باہر نکلنے کی ترغیب دی جاتی ہے اسی طرح مستورات میں بھی پروگرام مکان میں ہوتا ہے، مقامی عورتیں شریک ہوتی ہیں بعض خواتین حجاب اور برقعہ میں ہوتی ہیں اور بعض اپنے عام لباس

میں سر پر دوپٹہ ڈالے ہوئے،عورتوں کی نظریں راہ گزروں پر قصداًیا غیرارادی طور پر پڑتی ہوں گی،اسی طرح مردوں کی بھی جسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے خیر علماء سے سنا ہے کہ عورتوں کو نماز کے لیے مسجد میں جانے کی اجازت نہیں ہے،سوال دریافت طلب یہ ہے کہ اس قسم کا اصلاحی پروگرام جس میں فضائل اعمال کی تعلیم ہوتی ہو اصلاحی بیان ہوتے ہوں جس میں صرف مستورات ہی بیان کرنے والی ہوں اور مستورات ہی سننے والی ہوں یہ پروگرام مسجد کے احاطہ میں کسی وسیع کمرے میں یا صحن مسجد میں رکھا جائے تو شرعاً اس کی اجازت ہے؟ اسی طرح مدرسہ کے سالانہ انعامی اجلاس کے موقع پر مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کو اردو عربی اور انگریزی میں نظمیں،تقریر اور مکالمے یاد کرائے جاتے ہیں ان طالبات کی ہمت افزائی کے لیے اس قسم کا پروگرام احاطۂ مسجد میں کسی وسیع کمرے یا صحن مسجد میں رکھا جائے اور صرف مستورات کو ہی مدعو کیا جائے تو کیا شرعاً اس کی اجازت ہے؟

امید ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں تسلی بخش جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: دین سیکھنا مردوں اور عورتوں سب کے ذمہ ضروری ہے،عورت کے لیے اگر ہر مکان میں ان کے شوہر،باپ،بھائی وغیرہ دین سیکھنے کا انتظام کردیں تو پھر کہیں جانے کی ضرورت نہیں؛لیکن جب اس کا انتظام نہ ہو تو ان کے اجتماع کو منع نہ کیا جائے؛البتہ اس کا اہتمام کیا جائے کہ پردہ کا پورا انتظام ہو،بلا محرم کے عورتیں سفر نہ کریں،تقریر میں ان کی آواز نامحرموں تک نہ پہنچے،حضرت نبی کریم ﷺ نے بھی عورتوں کا اجتماع فرمایا اور اس میں خود تشریف لے جاکر

دین سکھایا ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۱۱۶)

البتہ آنے والی عورتوں کو پردہ اور حجاب کی پابندیوں کا لحاظ کرتے ہوئے آنے کی تاکید کی جائے، چنانچہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ ایک اور جگہ پر تحریر فرماتے ہیں: شریعت نے عورتوں کو پردہ کی بہت تاکید فرمائی ہے ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ عورت چھپانے کی چیز ہے، جب وہ مکان سے باہر نکلتی ہے تو شیطان جھانکتا ہے، ایک حدیث میں ہے میں نے اپنے بعض مردوں کے حق میں عورتوں سے زیادہ مضر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا، ایک حدیث میں ہے کہ جو عورت خوشبو لگا کر مردوں کے قریب سے گزرتی ہے وہ ایسی ہے یعنی بدکاری کی دعوت دینے والی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ نظر شیطان کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے جو سیدھا دل پر جا کر لگتا ہے؛ اس لیے بلا ضرورت عورت کا مکان سے نکلنا منع ہے اگرچہ وہ پردہ کے ساتھ نکلے، ضرورت پر جب کہ بغیر مکان سے نکلے کام نہ چلے تو میلے کچیلے کپڑے پہن کر پردہ کے ساتھ نکلنے کی گنجائش ہے، اس طرح کہ مہکتی خوشبو نہ ہو کوئی چیز جاذب نظر نہ ہو، پھر ضرورت پوری ہونے پر فوراً واپس آ جائے، دین سیکھنے اور مسائل معلوم ہونے کا مکان پر اگر انتظام نہ ہو سکے تو دینی ضرورت کے خاطر بھی پردہ کے ساتھ نکل سکتی ہے، ضرورت کی چیز کوئی لانے والا نہ ہو مثلاً پانی وغیرہ تب بھی اس طرح نکل سکتی ہے۔ الحاصل تفریح وسیر کے لیے شہریوں کی ملاقات کے لیے، خوش طبعی کی محفلوں کے لیے، رسمی جلسوں کے لیے نکلنے کی اجازت نہیں، بے پردہ نکلنا تو ہر صورت میں ناجائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۷/ ۳۲۷، ۳۲۸)

حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں: نوعمر لڑکیوں کا اسی طرح جلسہ کرنا بظاہر ان کی تعلیمی ترقی اور غیر تعلیم یافتہ مستورات میں تعلیمی ترغیب کا ذریعہ بھی ہے، ان کو

معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں مافی الضمیر کے ادا کرنے کا سلیقہ بھی پیدا ہوتا ہے، تقریر کی مشق بھی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی اس میں فتنے بھی ہوتے ہیں خاص کر جب مرد بھی لاؤڈ اسپیکر پر ان کی تقریر، مکالمے سنتے ہوں اور دل چسپی لیتے ہوں اور نظمیں بھی ترنم کے ساتھ پڑھی جاتی ہوں، اگر چھوٹی بچیاں ہوں تو ان میں فتنہ نہیں، بڑی لڑکیوں کا حال دوسرا ہے ان کو اس طرح نہ تعلیم دی جائے، نہ تقریر کرائی جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۴/۱۲۲ ملخصا) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۱۸/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

طلبہ کے ناجائز لباس کو پھاڑنا ناجائز اور موجبِ ضمان ہے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بخدمت حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب دامت فیوضکم

بعد ما ھوالمسنون! ایک مسئلہ عرضِ خدمت ہے امید ہے کہ آنجناب والا اس کا مدلل جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے:

صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ ہم چند افراد ایک ادارے کے مدرسین ہیں اور طلبہ کرام کی اصلاح وتربیت کا نظم ونسق بھی ہمارے ذمہ کر دیا گیا ہے، اصلاح وتربیت کے سلسلہ میں ایک مسئلہ ہمیں یہ درپیش ہے کہ عزیز طلبہ کرام مہمانانِ رسول غیر شرعی لباس زیب تن کرتے ہیں مثلاً پتلون پہنتے ہیں یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹکاتے ہیں؛ لہذا ہم نے مکرر اعلان تختۂ سیاہ پر تحریر کیا کہ کوئی بھی طالب علم آئندہ ٹخنوں سے نیچے اپنا پاجامہ نہ لٹکائے ورنہ ضرورت سے زائد مقدار کو قطع کر کے شریعت کے حکم کے موافق کرنے پر مجبور ہوں گے اور ایک ہفتہ کی مہلت دی گئی پھر ہفتہ کے بعد ہم نے طلبہ کا جائزہ لیا اور جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے

پایا اسے اس انداز سے کاٹ دیا گیا کہ اس کی اصلاح ہو سکے اور وہ پاجامہ پہننے کے قابل رہے اور اسبال ازار کی وعید سے محفوظ رہے اور آئندہ اس فعل شنیع سے باز رہے، اسی طرح جس طالب علم کے بال غیر شرعی پائے تو اس کو شرعی طور پر کٹوانے پر از راہ تربیت مجبور کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ایک عالم دین کا کہنا ہے کہ اس طرح پاجامہ کاٹنا شرعی اعتبار سے ناجائز ہے کیوں کہ اس میں تضییع مال غیر ہے جو بلا اذن غیر ناجائز ہے تو کیا اس عالم دین کا کہنا صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو پھر آنجناب والا ہی کوئی ایسا طریقہ ارشاد فرمائیں جس پر ہم عمل کر کے طلبہ کرام کو اس مذموم حرکت سے محفوظ رکھ سکیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ اپنی کتاب ''آداب الصالحین'' میں احتساب یعنی امر بالمعروف اور نھی عن المنکر سے متعلق تفصیلی احکام بیان فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ''جاننا چاہیے کہ احتساب کے بھی مدارج ہیں؛ اس لیے کہ مقصود اصلی احتساب سے یہ ہے کہ معصیت کے صدور کو روکا جائے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا موجب نہ بنے، تو اگر صرف پند و نصیحت ہی سے کام چل جائے اور انسان برائی سے باز آجائے تو جنگ و جدال کی ضرورت ہی نہیں'' (اسوۃ الصالحین ترجمہ آداب الصالحین ۲۵۴)

آگے تحریر فرماتے ہیں: پانچواں درجہ کا احتساب یہ ہے کہ منکر کو ہاتھ سے مٹا دے مثلاً باجہ واجہ ہے تو اس کو توڑ ڈالے، شراب ہے تو اس کو گرادے اور اگر کوئی مرد ریشمی کپڑا پہنے ہوئے ہے تو اس کے بدن سے اتار دے یا کوئی شخص کسی کا گھر غصب کر کے اس میں رہ رہا ہے تو ہاتھ پکڑ کر اس کو اس سے نکال دے یا کوئی جنبی شخص مسجد میں ہے اور نرمی سے کہنے سے نہیں نکل رہا ہے تو دھکا دے کر اس کو باہر کر دے، اور یہ صورت انہیں گناہوں میں

ہوسکتی ہے جوزبان اور دل کے علاوہ ہیں باقی جومعاصی کہ زبان ودل سے متعلق ہیں ان کا ہاتھ سے ختم کرنا ممکن نہیں۔

(ادب) اور اگر ان مذکورہ بالاصورتوں میں سے کسی میں بغیر ہاتھ کے استعمال کیے ہوئے صرف زبان سے ہی کام چل جائے تو پھر ہاتھ کے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور چاہیے کہ ان حالات میں بھی بغیر ضرورت کے کچھ نہ کرے اور حداعتدال سے تو ہرگز تجاوز نہ کرے پس کہیں کسی جگہ نکالنا ہوتو داڑھی پکڑ کر یا اس کی ٹانگ کھینچ کر باہر نہ کرے جب کہ ہاتھ پکڑ کر باہر کرنا ممکن ہوتو اسی طرح سے اس کے ریشمی کپڑے پھاڑ نہ ڈالے بلکہ بند اور بٹن کھول کر بدن سے اتار دے اور کھیل کی چیزیں مثلاً باجہ وغیرہ کو جلا نہ دے بلکہ توڑ دینا کافی ہے اسی طرح شراب کا گرادینا کافی ہے اس کے برتن توڑنے کی ضرورت نہیں۔ (ایضاً ۲۶۱)

امام غزالیؒ تحریر فرماتے ہیں اس درجہ (یعنی احتساب کا پانچواں درجہ) کے دو ادب ہیں: پہلا ادب یہ ہے کہ جس پر نکیر کی جارہی ہے اس کو فعل منہی عنہ سے باز رکھنے سے جب تک عاجز نہ ہو اپنے ہاتھ سے تغییر منکر نہ کرے پس اگر غصب کی ہوئی زمین میں سے نکلنے کے لیے اس کو چلا کر یا مسجد میں سے نکلنے کے لیے اس کو نکلنے کا پابند بنا کر نکالنا ممکن ہے تو دھکا دے کر یا کھینچ کر نہ نکالے یا خود اس کے ہاتھ سے شراب بہانا اور آلات لہو ولعب توڑنا ممکن ہو، اسی طرح ریشمی کپڑے کے بند خود اس کے ہاتھ سے کھلوانا ممکن ہوتو محتسب اپنے ہاتھ سے یہ کام انجام نہ دے۔

...... دوسرا ادب یہ ہے کہ تغییر منکر میں بقدرِ ضرورت پر اکتفاء کرے مثلاً اگر ریشمی کپڑا پہنے ہوئے ہے اور اس کو بند کھول کر اس کے جسم سے اتارنا ممکن ہے تو کپڑا

پھاڑے نہیں، چناں چہ اگر قدر ضرورت سے آگے بڑھے گا تو اس پر ضمان لازم آوے گا۔

الدرجة الخامسة: التغيير باليد وذلك ككسر الملاهى واراقة الخمر و خلع الحرير من رأسه وعن بدنه. (احياء العلوم ۲/۶۹۰)

وفى هذه الدرجة ادبان: احدهما: ان لا يباشر بيده التغيير مالم يعجز عن تكليف المحتسب عليه ذلك فاذا امكنه ان يكلفه المشى فى الخروج عن الارض المغصوبة والمسجد فلا ينبغى ان يدفعه او يجره واذا قدر على ان يكلفه اراقة الخمر وكسر الملاهى و حل دروز ثوب الحرير فلا ينبغى ان يباشر ذلك بنفسه فان فى الوقوف على حد الكسر نوع عسر فاذا لم يتعاط بنفسه ذلك كفى الاجتهاد فيه وتولاه من لا حجر عليه فى فعله.

الثانى: ان يقتصر فى طريق التغيير على القدر المحتاج اليه وهو ان لا ياخذ بلحيته فى الاخراج ولا برجله اذا قدر على جره بيده فان زيادة الاذى فيه مستغنى عنه وان لايمزق ثوب الحرير بل يحل دروزه فقط، ولايحرق الملاهي والصليب الذى اظهره النصارى بل يبطل صلاحيتها للفساد بالكسر، وحد الكسر ان يصير الى حالة تحتاج فى استئناف اصلاحه الى تعب يساوى تعب الاستئناف من الخشب ابتداءً وفى اراقة الخمور يتوقّى كسر الاوانى ان وجد اليه سبيلا فان لم يقدر عليها إِلَّا بِأَن يرمى ظروفها بحجر فله ذلك وسقطت قيمة الظرف وتقومه بسبب الخمر اذ صار حائلا بينه وبين الوصول الى اراقة الخمر ولو ستر الخمر ببدنه لكنا نقصد بدنه بالجرح والضرب لنتوصل الى اراقة الخمر فاذا لا تزيد حرمة ملكه فى الظروف على حرمة نفسه ولو كان

الخمر فی قواریر ضیقة الرؤس ولو اشتغل باراقتها طال الزمان وادركه الفساق ومنعوه فله كسرها فهذا عذر وان كان لايحذر ظفرالفساق به ومنعهم ولكن كان يضيع فی زمانه وتتعطل عليه اشغاله فله ان يكسرها فليس عليه ان يضيع منفعة بدنه وغرضه من اشغاله لاجل ظروف الخمر وحيث كانت الاراقة متيسرة بلا كسر فكسره لزمه الضمان.(احیاء العلوم ۲/ ۲۹۰،۲۹۱)

صورت مسئولہ میں طلبہ سے ان پائجاموں اور پتلونوں کو اتروانا ممکن ہے تو اس کو پھاڑنا جائز نہیں ورنہ ضمان لازم آوے گا۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نوٹ: وجوبِ ضمان والا حکم امام غزالیؒ کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال نہ ہو کہ امام غزالیؒ تو شافعی المسلک ہیں؛ اس لیے کہ احیاء العلوم کی شرح اتحاف میں علامہ سید مرتضی زبیدی نے بھی احیاء العلوم میں بیان فرمودہ اس حکم پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۲۲/ جمادی الاخری ۱۴۲۵ھ

ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ تعلیم دینا کیسا ہے؟

سوال: ویڈیو پر کوئی آدمی دنیوی تعلیم دیتا ہے جیسا کہ آج کل قریوں (گاؤں) میں رہنے والے لڑکوں کو حکومت ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ تعلیم دیتی ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کالج میں یہ پروفیسر یا لکچرر پڑھاتا ہے اور اس کے سبق کو سننے کے لیے چند آدمی بیٹھتے ہیں، اور ادھر ویڈیو کیسٹ میں پورا اتار لیا جاتا ہے پھر قریوں میں ان کیسٹوں کو بھیج کر طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے تو کیا اس طرح پڑھنا، پڑھانا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر یہ عمل فوٹو کے ذریعہ ہواور فوٹو ذی روح کا ہوتو اس کا بنانا، دکھانا وغیرہ حرام اورنا جائز ہے، اوراگر یہ عمل فوٹو کے ذریعہ سے نہیں بلکہ صرف عکس کے ذریعہ سے ہوتا ہے تو جو چیزیں اس میں سنائی دے رہی ہیں یا نظر آرہی ہے اگران کا دیکھنا یا سننا بغیراس کے بھی جائز ہے تو اس میں بھی جائز ہوگا ورنہ نہیں۔(ماخوذ از منتخبات نظام الفتاوی)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

یہود ونصاری کا مذہبی نشان

سوال: یہود ونصاریٰ کا مذہبی نشان کیا ہے؟اس کی نشان دہی فرما کر بندہ کوممنون ومشکورفرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہود ونصاریٰ کا مذہبی نشان کیا ہے اس کی کوئی تصریح ہمارے فتاویٰ کی کتابوں میں نظر سے نہیں گزری؛ البتہ دیگر معلومات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نصاریٰ صلیب کو اور یہود شش کونہ والے ستارے کو مذہبی نشان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

پڑوسی کی لائٹ بجلی استعمال کرنا

سوال: ایک شخص اپنے پڑوسی کی لائٹ بجلی کواس کی اجازت سے استعمال کرتا ہے تو کیا اس شخص کے لیے اس روشنی سے فائدہ اٹھانا جائز ہے؟ اور کیا کرایہ دینے اور نہ دینے کی صورت میں حکم بدل سکتا ہے؟

۱　الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

پڑوسی کی اجازت سے اس کی لائٹ بجلی استعمال کرنا درست ہے؛ البتہ اگر کرایہ

سے استعمال کرتا ہے تو عقد اجارہ کے تمام شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

چرم قربانی فروخت کرنے کے بعد قیمت مدرسین کی تنخواہ وغیرہ میں صرف کرنا

سوال: ہمارے یہاں پورے شہر کی قربانی کی کھالیں اہل انجمن لے لیتے ہیں پھر شہر کے مکاتبِ قرآنیہ کے مدرسین واساتذہ کی تنخواہیں اسی طرح عیدگاہ، قبرستان کی صفائی ستھرائی اور مرمت وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں، کیا یہ شکل درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اہل انجمن جو قربانی کرنے والوں کے پاس سے قربانی کے جانوروں کی کھالیں وصول کرتے ہیں، وہ ان کھالوں کے نظم وانتظام میں قربانی کرنے والوں کے وکیل ہیں، اب اگر وہ ان کھالوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت حاصل کرتے ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس رقم کو زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کے مصرف میں خرچ کریں یعنی غرباء اور مساکین کو بطورِ تملیک دے کر مالک بنادیں۔ اس کے بعد وہ حضرات چاہیں تو اپنی مرضی اور اختیار سے سوال میں ذکر کردہ کاموں میں استعمال کر سکتے ہیں، اس رقم کو بلا تملیک براہ راست ان کاموں میں استعمال کرنا درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بالوں کی تراش وخراش کی حدود اور قزع کی تشریح

سوال: بہت سے لوگ اپنے سر کے بال اس طرح کٹواتے ہیں کہ سر کے پیچھے کے حصہ اور دونوں کانوں کے اوپر والے حصہ کے بال چھوٹے کرواتے ہیں، اور ”مقدم رأس“ سر کے آگے والے حصہ کے بال بڑے رکھتے ہیں، ایسے بال کٹوانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اگر جائز ہے تب تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اور اگر شرعا کوئی قباحت ہے تو کس قسم کی؟ گناہ صغیرہ یا کبیرہ؟ اگر گناہِ صغیرہ ہے تو بار بار کے ارتکاب سے کیا یہ کبیرہ بن سکتا ہے؟

مسلم شریف میں حدیث ہے: عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رأی صبیا قد حلق بعض رأسه وترك بعضه فنهاهم عن ذلك، وقال: احلقوا كله او اتركوا كله. (رواہ مسلم) **اس حدیث سے بعض راس کا حلق اور بعض کا ترک ہی مراد ہے یا بعض کا قصر اور بعض کا ترک بھی اس میں شامل ہے وہ صورت جو اوپر مذکور ہے۔**

مدارس دینیہ کے طلباء بھی ایسے بال کٹوانے کے عادی ہوتے ہیں اور کٹواتے ہیں ایسے بال کٹوانے میں شرعاً قباحت ہو اور ان بال کٹوانے کی اجرت اگر مدرسہ ادا کرتا ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ مدلل ومفصل تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

بالوں کی تراش وخراش کے سلسلہ میں ایک تو طریق سنت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے بال رکھے تھے اس کے مطابق بال رکھے جائیں۔ دوسرا طریقہ ممنوع ومکروہ ہے اس کی دو صورتیں ہیں: ایک قزع والا طریقہ ہے جس کی ممانعت کی حدیث میں صراحت موجود ہے، دوسرا وہ طریقہ جس میں دیگر اقوام کی مخصوص وضع کی مشابہت لازم آتی ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک بالوں کی تین صورتیں حدیث میں آتی ہیں: کبھی کندھوں تک دراز ہوتے تھے اس کو جُمّہ کہتے ہیں، کبھی کانوں کی لو تک ہوتے تھے اس کو وَفرہ کہتے ہیں، اور کبھی کبھی اس کے بین بین ہوتے تھے اس کو لِمّہ کہتے ہیں۔ (شرح سفر السعادۃ ۴۹۳)

ممنوع ومکروہ میں جو دو صورتیں آتی ہیں ان میں سے ایک قزع ہے، قزع کی تشریح کرتے ہوئے صاحبِ مجمع البحار رقمطراز ہیں: انه نهى عن القزع هو ان يحلق رأس الصبى ويترك منه مواضع متفرقة تشبيها بقزع السحاب (مجمع بحار الانوار ۴/ ۲۶۷) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قزع سے ممانعت فرمائی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ پیچھے

کے سر کو مونڈا جائے، اور اس کے مختلف ومتفرق مواضع پر بال چھوڑ دیے جائیں اس کو قزع نام قزع السحاب سے مشابہ ہونے کی وجہ سے دیا گیا۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: القزع بفتح القاف والزاء وبالعين المهملة وهو جمع قزعة، وهي القطعة من السحاب وسمى شعر الرأس اذا حلق بعضه قزعاً تشبيها بالسحاب المتفرق. (عمدة القاری شرح صحيح البخاری ۲۲/۵۷) یعنی قزع (قاف وزائے مفتوحہ اور عین مہملہ سے) قزعۃ کی جمع ہے، قزع لغت میں بادل کی ٹکڑی کو کہتے ہیں، سر کے بالوں کو جب کہ کچھ حصہ مونڈا جائے اور کچھ حصہ چھوڑ دیا جائے تو اسی لیے قزع کہتے ہیں کہ جب آسمان پر بادل کی مختلف ٹکڑیاں ہوں تو آسمان کا کچھ حصہ صاف اور کچھ حصہ سیاہ نظر آتا ہے۔

اس کی حکمت بیان فرماتے ہوئے علامہ عینیؒ تحریر فرماتے ہیں: فان قلت: ما الحكمة فى النهى عن القزع؟ قلت: تشويه الخلقة، وقيل زى اليهود، وقيل زى اهل الشر والدعارة. (ایضاً ۲۲/ ۵۸) یعنی اس میں مثلہ کی شکل ہوجاتی ہے، اور بعضوں نے اس کی علت بیان فرمائی ہے کہ یہ یہود کا فیشن ہے، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ اہل شر وفساد کا طریقہ ہے۔

اس کے حکم کے سلسلہ میں علامہ محمد بن طاہرؒ فرماتے ہیں: اجمعوا على كراهته اذا كان فى مواضع متفرقة الا ان يكون لمداواة، لانه من عادة الكفرة ولقباحة صورة. (مجمع بحار الانوار ٤/ ٢٦٧) یعنی اس کی کراہت پر اجماع ہے جب کہ متفرق مواضع میں ہو، البتہ بغرض علاج اس کی اجازت ہے، کراہت اس لیے کہ یہ کفار کا طریقہ ہے اور اس میں صورت بھی بگڑتی ہے۔

علامہ شامیؒ نے بھی اس کی کراہت کی تصریح فرمائی ہے: ویکرہ القزع وھو ان یحلق البعض ویترك البعض. (شامی ۵/ ۲۸۹)

اگر حلق شدہ حصہ ایک طرف ہو اور بال بھی ایک طرف ہوں (یعنی متفرق مواضع میں ہو) جیسا کہ انگریزی بال ہوتے ہیں تو یہ بھی قزع میں داخل ہو کر مکروہِ تحریمی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں: القزع فی اللغة: حلق بعض الرأس وترك بعضهم فهو مكروه تحريماً كيف ما كان لاطلاق النهى عنه.

(حاشیه لامع الدراری ۱۰/ ۱۰)

بالوں کی دوسری ممنوع صورت وہ ہے جس میں اغیار کی مشابہت لازم آتی ہو: من تشبه بقوم فهو منهم الحديث کی وجہ سے چنانچہ انگریزی بالوں کی ممانعت کی وجہ یہی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ فرماتے ہیں: انگریزی بال بنا بر تشبہ مکروہ ہے۔

(فتاویٰ محمودیہ ۵/ ۱۴۹)

تشبہ کے سلسلہ میں یہ یاد رہے کہ ''عادات میں مشابہت مثلاً جس ہیئت سے وہ کھانا کھاتے ہیں اسی ہیئت سے کھانا یا لباس ان کی وضع پر پہننا، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ہماری کوئی خاص وضع پہلے سے ہو اور کفار نے بھی اس کو اختیار کر لیا ہو خواہ ہمارا اتباع کر کے یا ویسے ہی، اس صورت میں مشابہت اتفاقیہ ہے، اور اگر ہماری وضع پہلے سے جدا ہو اور اس کو چھوڑ کر ہم کفار کی وضع اختیار کریں یہ ناجائز ہے، اگر ان کی مشابہت کا قصد بھی ہے تب تو کراہت تحریمی ہے، اور اگر مشابہت کا قصد نہیں ہے بلکہ اس لباس و وضع کو کسی اور مصلحت سے اختیار کیا گیا ہے تو اس صورت میں تشبہ کا گناہ نہ ہوگا مگر چوں کہ تشبہ کی صورت ہے؛ اس لیے کراہت تنزیہی سے خالی نہیں۔

قال هشام: رأيت على ابى يوسف نعلين مخسوفين بمسامير، فقلت اترى بهذا الحديد بأسا؟ قال: لا، قلت: فسفيان وثور بن يزيد كرها ذلك لان فيه تشبها بالرهبان، فقال: ان رسول الله ﷺ كان يلبس النعال التى لها شعر وانها من لباس الرهبان فقد اشار الى ان صورة المشابهة فيما تعلق به صلاح العباد لا يضر، فان الارض مما لا يمكن قطع المسافة البعيدة فيها الا بهذا النوع. اه قلت وفعله علیہ السلام محمول على بيان الجواز اذا كان بدون القصد.

مگر چوں کہ آج کل عوام جواز کے لیے بہانے ڈھونڈتے ہیں ان کا قصد تشبہ ہی کا ہوتا ہے؛ اس لیے اکثر احتیاط کے لیے عادات میں بھی تشبہ سے منع کیا جاتا ہے خواہ تشبہ کا قصد ہو یا نہ ہو۔ (امداد الاحکام ۱/۱۹۴)

اب اتنی بات رہ گئی کہ سوال میں مذکورہ صورت قزع کا مصداق ہے یا نہیں؟ تو عام طور پر قزع کی جو تعریف کتب حدیث وفقہ میں لکھی گئی ہے: حلق البعض وترك البعض اور پھر قزع کی جو وجہ تسمیہ شروحِ حدیث میں مذکور ہے: تشبيها بقزع السحاب اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ قزع کا مصداق ہو۔

لیکن حضرت قاری مولانا محمد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں: اسی طرح سر کا کچھ منڈانا اور کچھ چھوڑ دینا (جس کو قزع کہتے ہیں) ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ اس میں مثلہ کی سی شکل ہو جاتی ہے، اس میں ماضی وحال کی قومیں مختلف ہیئتوں کے ساتھ مبتلاء ہوئی ہیں، اور یہ ان کا شعار قرار دیا گیا ہے گذشتہ دورِ تمدن میں وسطِ سر کا کچھ حصہ منڈا کر جو گرد بال چھوڑ دیے جاتے تھے اور آج کے عہدِ زینت میں قدامت کے برعکس سر کا پچھلا حصہ اور کانوں کے اوپر کا دوطرفہ منڈایا یا کترایا جاتا ہے تا کہ سر کا بالائی اور وسطانی حصہ بلند اور

چوڑا دکھلائی دے، اس طرز عمل کے حامل طبقوں سے بھی تشبہ منقطع کرنے کا حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے: نهى رسول الله ﷺ عن القزع. رسول اللہ ﷺ نے قزع سے (جس کی تفسیر ابھی عرض کی گئی) منع فرمایا ہے۔ (التشبه في الاسلام ۱/۱۳۹)

اس لیے طلبہ علوم نبویہ کو جو طبقۂ علماء کا ایک جز ہیں اس ہیئت سے احتراز لازم ہے اور منتظمین مدرسہ کو بھی چاہیے کہ طلبہ کو اس کی اجازت نہ دیں۔ اس سلسلہ میں دیگر حضرات مفتیان سے بھی رجوع فرمالیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اہل فلیٹ سے مینٹنس (Menteness) کی رقم کتنی وصول کی جائے؟ مینٹنس کی رقم میں تاخیر پر جرمانہ لینا

سوال: (۱) میرا ایک فلیٹ ہے اسے میں نے ایک شخص کو کرایہ پر دیا ہے، اس بلڈنگ کے کمیٹی ممبران نے مجھ سے کہا کہ آپ کرایہ پر دے کر کمارہے ہیں تو بلڈنگ والوں کو بھی فائدہ ہونا چاہیے، لہٰذا کمیٹی ممبران نے یہ طے کیا کہ جو بھی فلیٹ کرایہ پر دے گا اسے ہر ماہ ۵۰۰/ روپے کمیٹی ممبران کو دینا ہوگا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کمیٹی کا اس طرح قانون بنا کر ہر ماہ ۵۰۰/ روپے لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) میرا ایک فلیٹ ہے اس کا مینٹنس ۳۰۰۰/ ہے، ہر ماہ کی ۲۱ تاریخ تک بھرنا ہوتا ہے، اگر ادا کرنے میں تاخیر ہوگئی تو ۲۱ فیصد پینلٹی لگائی جاتی ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ تاخیر ہونے کی وجہ سے کمیٹی ممبران کا پینلٹی لگا کر زائد رقم کا مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) بلڈنگ میں تمام فلیٹ والوں کی مشترکہ ضرورتوں کا نظم وانتظام کرنے کے لیے کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے اور ان مشترکہ ضرورتوں پر جو مصارف ہوتے ہیں وہ یہ کمیٹی

مالکان فلیٹ سے مینٹننس کے نام سے وصول کرتی ہے، خود اس مینٹننس کے لیے شرعاً یہ حکم ہے کہ جو حقیقی اور واقعی مصارف ہوں ان کے مطابق ہی رقم وصول کی جائے، اس سے زیادہ وصول کرنا درست اور جائز نہیں، رہا آپ کا یہ سوال کہ آپ نے اپنا وہ فلیٹ (خود رہنے کے بجائے) دوسرے آدمی کو کرایہ پر دیا ہے، اس کرایہ میں سے کمیٹی ممبران آپ سے مطالبہ کرتے ہیں تو ان کا یہ مطالبہ شرعاً درست نہیں، حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منه (مشکوٰۃ ۲۵۵)

(۲) مینٹننس کی مقررہ رقم کی ادائیگی میں تاخیر ہونے پر کمیٹی ممبران کا جرمانہ کے طور پر اکیس فیصد مزید وصول کرنا جائز نہیں۔

درمختار میں ہے: لا بأخذ مال فی المذهب. وفی الشامية (قوله لا بأخذ مال فی المذهب) قال فی الفتح وعن ابی یوسفؒ یجوز التعزیر للسلطان باخذ المال، وعندهما وباقی الائمة لا یجوز. اه ومثله فی المعراج وظاهره ان ذلك رواية ضعيفة عن ابی یوسف قال فی الشرنبلالية ولا یفتی بهذا لمافیه من تسلیط الظلمة علی اخذمال الناس الخ (درمختار مع الشامی ۳/ ۱۹۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

صحتِ قرآن کے لیے نورانی قاعدہ پڑھنا ضروری ہے یا نورانی شخصیت (استاذ) سے پڑھنا ضروری ہے؟

سوال: (۱) کیا قرآن شریف کی صحت ضروری ہے؟ یا نورانی قاعدہ پڑھنا ضروری ہے؟

(۲) کیا قرآن شریف کے صحت کے لیے ''نورانی قاعدہ'' ہی پڑھنا، پڑھانا فرض یا واجب ہے؟ یا اور کسی قاعدہ سے بھی قرآن شریف کی صحت کروائی جاسکتی ہے؟

(۳) مکتب کے اساتذہ کے تقرر کے لیے یہ شرط لگانا کہ ''نورانی قاعدہ'' پڑھا

ہوا ہونا چاہیے اور وہ بھی کسی مخصوص درس گاہ ہی سے، کیا اس طرح کی شرط لگانا جائز ہے؟ آج کل مکاتب میں علماء کی تقرری کے لیے یہ شرط عام ہو رہی ہے کہ ''نورانی قاعدہ'' ایک مخصوص درس گاہ ہی سے پڑھا ہوا ہونا چاہیے، باوجودیکہ وہ عالم صاحب اپنی مادر علمی میں ''نورانی قاعدہ'' پڑھ چکے ہوتے ہیں، پھر بھی انھیں اس درس گاہ میں داخلہ لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟

(۴) کیا نورانی قاعدہ (جو غیر ذی روح ہے) قرآن شریف کی صحت کا واحد ذریعہ ہے یا استاذ المحترم صاحب (جو ذی روح ہیں) سے قرآن شریف کی صحت کرا سکتے ہیں؟

نوٹ: نورانی قاعدہ کا ہم احترام کرتے ہیں اور اس کو مفید جانتے ہیں اور اس کو داخل نصاب کرنے میں ہمیں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱/۲): حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ فتاویٰ رحیمیہ میں تحریر فرماتے ہیں: قرآن کو صحت اور تجوید کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے، تجوید کلام الٰہی سے جدا نہیں ہوسکتی، اگر قرآن مجید سے تجوید جدا ہوگئی تو قرآن مجید اپنی اصلی ہیئت پر باقی نہیں رہے گا، اور اس طرح بے قاعدہ پڑھنے والا گنہ گار ہوگا، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: رب تال للقرآن والقرآن یلعنه. کتنے لوگ قرآن کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے، اسی لیے امام القراءۃ والتجوید علامہ جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والاخذ بالتجوید حتم لازم	من لم یجود القرآن اثم
لانه به الالٰه انزلا	وهکذا منه الینا وصلا

یعنی تجوید کا حاصل کرنا اور قرآن کو تجوید کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے جس نے بے قاعدہ

اور خلاف تجوید پڑھا وہ گنہ گار ہے؛ اس لیے کہ اللہ رب العزت نے قرآن مجید کو تجوید کے ساتھ نازل فرمایا ہے اور اسی طرح تجوید کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ لہذا قرآن کو تجوید اور قراءت کے ساتھ پڑھا جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۴/۲۵۳)

اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ مختلف علوم وفنون کی تعلیم کے لیے جو کتابیں تالیف وتصنیف کی جاتی ہیں ان کی حیثیت محض ایک آلہ اور وسیلہ کی ہے، وہ خود مقصود نہیں، مقصود تو وہ علم اور فن ہوتا ہے جس کی تعلیم کے لیے یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے، مدارس ومکاتب کے نصابوں میں جو کتابیں تجویز کی جاتی ہیں اس کا بھی مقصود دراصل علم وفن کی تعلیم ہوتا ہے جس کے لیے وہ کتاب ترتیب دی گئی ہے مثلاً فقہ کی تعلیم کے لیے ہمارے مدارس میں قدوری پڑھائی جاتی ہے، ظاہر ہے یہ کتاب بحیثیت کتاب کے مقصود ومطلوب نہیں، بلکہ اس سے مقصود علم فقہ کو حاصل کرنا ہے، اب اگر کسی مدرسہ کے منتظمین وذمہ داران اپنے نصاب میں قدوری کی جگہ پر کوئی اور کتاب علم فقہ کی تجویز کریں تو اس حیثیت سے کہ اس کتاب سے بھی علمِ فقہ اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے جس طرح قدوری سے تو ان کے اس فیصلہ پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ دورِ حاضر میں بڑے بڑے جامعات میں علوم وفنون کی تعلیم کا جو طریقہ رائج ہے اس میں تو بطور نصاب کسی خاص کتاب کی کوئی تعیین نہیں کی جاتی ہے بلکہ جو فن سکھلایا جارہا ہے اس کے مباحث متعین کرکے استاذ کو اس کی تعلیم وتدریس کا پابند کیا جاتا ہے اور یہ بات اس کی صواب دید پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ چاہے تو اس فن کی کسی کتاب کو سامنے رکھ کر ان مباحث کو پڑھاوے، چاہے تو اپنے طور پر کوئی مقالہ تیار کرکے اس کے ذریعہ سے تدریسی فرائض انجام دے۔

صحت کے ساتھ قرآن پاک کی تعلیم وتدریس کے سلسلہ میں بھی یہی اصول کار

فرما ہے کہ مقصود قرآن پاک کو صحت کے ساتھ پڑھنا ہے، چاہے اس کے لیے جونسا طریقہ اختیار کیا جائے؛ اس لیے کسی بھی آدمی کا یہ دعویٰ تو درست نہیں کہ قرآن شریف کی صحت کے لیے نورانی قاعدہ کا پڑھنا، پڑھانا ضروری یا فرض وواجب کا درجہ رکھتا ہے، کیا جن ملکوں میں صحت کے ساتھ قرآن کی تعلیم کا تو نظم ہے؛ لیکن نورانی قاعدہ نہیں پڑھایا جاتا ان کو گنہ گار قرار دیا جائے گا؟ ظاہر ہے کوئی بھی آدمی یہ حکم نہیں لگا سکتا؛ اس لیے یہ بات اپنی جگہ پر یقینی ہے کہ مقصودِ اصلی قرآن پاک کی صحت ہے جس طرح بھی حاصل ہو وہ طریقہ قرآن کی تعلیم وتدریس کے لیے اختیار کیا جائے چاہے وہ نورانی قاعدہ کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔

(۳) اب رہا آپ کا یہ سوال کہ مکتب کے اساتذہ کے تقرر کے لیے نورانی قاعدہ کا پڑھا ہوا ہونا اور وہ بھی کسی مخصوص درس گاہ سے کس حد تک جائز ہے؟ تو دراصل اس کا تعلق انتظامی امور سے ہے چوں کہ مکتب میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے کسی کا تقرر یہ شرعاً عقد اجارہ ہے، اور عقد اجارہ میں مستأجر اپنے جس کام کی انجام دہی کے لیے اجیر کو مقرر کر رہا ہے اس کام کو باحسن وجوہ انجام دینے کی جس میں بھی صلاحیت ہوگی اسی کو اس کے لیے منتخب کرے گا، اب اگر اس کا اپنا تجربہ یہ ہے کہ جو آدمی فلانی درس گاہ سے نورانی قاعدہ پڑھا ہوا ہو وہ اس کام کو عمدہ طریقہ سے انجام دیتا ہے تو شرعاً منتظم کے لیے کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے یہاں قرآن کی تعلیم کے فرائض انجام دینے کے لیے ایسے آدمی کا انتخاب کرے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی درس گاہ میں علیا کی کتابیں پڑھانے کے لیے اس درس گاہ کے منتظمین یہ شرط لگائیں کہ ہم اس کام کے لیے اسی کو تجویز کریں گے جس کے پاس عالم کی سند ہو اور وہ بھی دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی ہوئی، اب اگر ان کی اس تجویز پر کوئی آدمی یہ سوال کرے کہ اگر کسی شخص نے کسی مدرسہ میں داخلہ لیے بغیر خانگی طور پر کسی

ماہر عالم سے علم حاصل کیا ہے اور علیا کی کتابوں کی تدریس کے لیے جو صلاحیت اور استعداد مطلوب ہے وہ اس کو حاصل ہے آپ حضرات کیوں اس کو اپنے یہاں نہیں رکھتے اور کیوں یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس کے پاس عالم کی سند ہی ہو اور وہ بھی دارالعلوم دیوبند ہی سے حاصل کی ہو۔ظاہر ہے چوں کہ یہ ایک انتظامی معاملہ ہے؛ اس لیے معترض کے اعتراض کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اس سلسلہ میں جواز وعدم جواز کی بحث کو چھیڑا جائے گا ہاں ان منتظمین سے یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ آپ کا مقصود علیا کی کتابوں کی تدریس ہے اور یہ مقصود آپ کی لگائی ہوئی شرط کے بغیر بھی حاصل ہو رہا ہے تو آپ کو اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، اور خاص کر علم کے میدان میں اس طرح کی شرطیں تعصب وتحزب کو جنم دیتی ہیں، اور اہلِ علم کی جماعت میں اس کی وجہ سے افتراق وتشتت کی بنیاد پڑتی ہے علم تو ایسی اکائی ہے جس میں کوئی تقسیم نہیں۔

آگے آپ نے سوال میں تحریر فرمایا ہے ''وہ عالم صاحب اپنے مادرِ علمی میں نورانی قاعدہ پڑھ چکے ہوتے ہیں پھر بھی انھیں اس درس گاہ میں داخلہ لینے پر مجبور کرتے ہیں'' تو اگر وہ عالم صاحب اس طریق تدریس کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں جو اس مخصوص درس گاہ میں نورانی قاعدہ پڑھنے سے مطلوب ہے تو پھر اس طرح ان کو مجبور کرنا فضول اور لغو ہے، اور اگر اپنی مادرِ علمی میں نورانی قاعدہ پڑھنے کے بعد بھی ان میں وہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے تو پھر خود ان عالم صاحب کو چاہیے کہ اپنے اندر اس صلاحیت کو پیدا کرنے کے لیے حضرات منتظمین کی بات کو مان لیں ورنہ معذرت کردیں کہ میں آپ کے یہاں تدریسی خدمات انجام نہیں دے سکتا، ظاہر ہے اس طرح کی معذرت کے بعد ان کو منتظمین مجبور نہیں کریں گے؛ اس لیے یہ مسئلہ جواز اور عدمِ جواز کا نہیں بلکہ خالص انتظامی معاملہ ہے۔

(۴) جیسا کہ اوپر کی تمہید میں بتلایا جا چکا ہے کہ نورانی قاعدہ یا اور کوئی دوسرا قاعدہ بذاتِ خود مقصود نہیں بلکہ قرآن کی صحت مطلوب ہے؛ البتہ اگر استاذ جس مدرسہ میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں اس کے نصاب میں نورانی قاعدہ داخل ہے تو وہاں پر استاذ محترم کا یہ اصرار کہ میں آپ کے بچوں کو قرآن شریف صحت سے پڑھنا سکھا دینے کا ضامن ہوں نورانی قاعدہ کا مطالبہ مجھ سے نہ کیا جائے کہاں تک درست اور بامعنی ہے؟ وہ ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، مفتی: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک۔ ضلع: نوساری، گجرات

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک، ضلع: نوساری، گجرات

الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی، معین مفتی: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک۔ ضلع: نوساری، گجرات

دینی امور کے لیے مسجد میں چندہ اور چندہ کرنے والے کے ساتھ سلوک

سوال: ایک قریہ ہے اس میں مسجد مدرسہ کچھ نہیں تھا، صرف جماعت کبھی آجاتی تھی؛ لیکن صرف دو گھنٹہ ظہر میں سب کو جمع کر کے بیان کر کے چلے جاتے کیوں کہ ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس گاؤں میں محنت کر کے مسجد اور مدرسہ بنایا ۱۹/ سال محنت کر کے تیار ہوا اور بچے دینی تعلیم سے فیضیاب ہو رہے ہیں، عرض یہ ہے کہ:

(۱) بہت سی جگہ باہر لندن افریقہ کی امداد پر سنگ مرمر کی مسجد اور مدرسہ بنا لیا ہے؛ لیکن اور سفیروں کے لیے اعلان کی ممانعت کر رکھی ہے تو ان کے لیے لندن افریقہ کی طرف سے انتظام ہو چکا ہے، دوسری غریب بستیاں جو ہیں ان کے لیے اعلان کی پابندی ہے کیا یہ صحیح ہے؟ اور اگر اسی طرح ہر جگہ پابندی ہو جائے تو یہ غریب بستیاں کیا کریں گی اور ان کے بچے ویران ہو جائیں گے۔ فقط۔

(۲) ایک سفیر کو مسجد کے ذمہ دار نے اعلان کی اجازت تو دی؛ لیکن صرف اتنا ہی کہ فلاں مدرسہ کے لیے چندے کے لیے آیا ہوں امداد فرماویں تو اس سفیر نے عرض کیا کہ صرف دو منٹ کا موقع دیں تو منع کر دیا تو خیر اتنا ہی کہہ کر باہر بیٹھ گئے تو صرف پانچ روپے ہوئے، دو دن کے بعد دوسرے سفیر نے تعلقات کی نسبت پر اجازت لی تو دو تین منٹ کا وقت دیا تو یہ دو تین منٹ میں ان سفیر صاحب گاؤں کے حالات بتا کر بیٹھ گئے تو ان کے چندے میں ۱۲/ سو روپے ہوئے تو تھوڑی وضاحت سے مدرسہ کا فائدہ ہوتا ہو تو کیا دو تین منٹ کا وقت نہیں دینا چاہیے جب کہ اور کوئی سفیر بھی نہیں۔

(۳) حدیث شریف میں سنا ہے کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ہیں تو کیا ایسی غریب بستی کے مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے لیے کوئی حق ہوگا یا نہیں؟

(۴) ایک گاؤں میں بہت عالی شان مسجد بنی لندن کی امداد پر؛ لیکن ایک سفیر کو اعلان کی بھی اجازت نہ دی، اور نہ کوئی کھانے کا نظم، اور نہ گاؤں میں کوئی ہوٹل، اور گاؤں کے سب بنگلے والے ہیں، موذن کو کہہ دیا ہے کہ کسی کو چندے کا اعلان کرنے نہیں دینا تو وہ سفیر تین بجے گاؤں سے بھوکے ہی روانہ ہوئے، کیا یہ ایمان کی شان ہے یہ سب سفیر گجرات ہی کے ہیں اور گجرات ہی کی یہ کیفیت ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱/۲/۳): ایک مسجد کو شہید کر کے وسیع کیا جا رہا تھا، خود اس مسجد کے لیے اسی مسجد میں چندہ کیے جانے سے متعلق کیے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ تحریر فرماتے ہیں: بہتر اور مناسب صورت یہ ہے کہ مسجد سے باہر چندہ کیا جائے یا مسجد میں کسی بورڈ پر چندہ کی اپیل (درخواست) لکھ دی

جائے؛ البتہ اگر اس طرح چندہ کرنے سے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی ہو، اور مسجد میں جمعہ کے دن چندہ کرنے سے مسجد کا زیادہ فائدہ ہوتا ہو تو اس شرط کے ساتھ برائے مسجد مسجد میں چندہ کرنے کی گنجائش ہے کہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو، ان کی گردن نہ پھاندے، نمازی کے سامنے سے نہ گزرے، مسجد میں شور وشغب نہ ہو، مسجد کے احترام کے خلاف کام نہ ہو، اور لوگوں کے سامنے کسی کو شرم اور غیرت میں ڈال کر زبردستی چندہ وصول نہ کیا جائے، ان شرائط کی رعایت ضروری ہے اگر ان کی رعایت نہ ہو سکے تو مسجد میں چندہ نہ کیا جائے۔
(فتاویٰ رحیمیہ ۹/ ۲۳۹)

مسجد میں مدرسہ کے لیے کیے جانے والے چندہ سے متعلق کیے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: عام حالات میں مسجد میں مدارس کے لیے چندہ نہ کرنا چاہیے، مسجد میں شور وغل ہوگا، نمازیوں کو خلل ہوگا، مسجد کی بے احترامی ہوگی، لہذا مسجد میں چندہ نہ کیا جائے؛ البتہ اگر کوئی خاص حالت ہو مسجد میں شور وغل نہ ہو، نمازیوں کو تکلیف اور خلل نہ ہو تو گنجائش ہے۔ (۹/ ۲۴۰)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے: دینی ضرورت کے لیے مسجد میں چندہ کرنا، مرحباً اور سبحان اللہ کہنا درست ہے مگر نمازیوں کی نماز میں خلل وتشویش نہ ہونے پائے۔ (فتاویٰ محمودیہ کراچی ۱۵/ ۲۷۳)

مسجد میں چندہ کرنے کے متعلق تمام مفتیان کرام کا یہی جواب ہے جو اوپر نقل کیا گیا۔ آپ نے سفیر کے ساتھ کیے گئے جس سلوک کا اپنے سوال میں تذکرہ کیا ہے، اگر ان کا مقصد احترام مسجد کو باقی رکھنا اور آدابِ مسجد کی رعایت کروانا ہے تو ان کا یہ رویہ درست ہے؛ البتہ جیسا کہ آپ نے لکھا کہ دوسرے سفیر کو زیادہ وقت دیا گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آداب مسجد کی رعایت مقصود نہیں بلکہ ترجیحی سلوک پیشِ نظر ہے، اس صورت میں ان کا

یہ رویہ قابلِ مذمت ہے، ویسے مسلمانوں کے اجتماعی امور مساجد، مدارس وغیرہ کے لیے لوگوں کا اپنے مسلمان بھائیوں کے پاس تعاون حاصل کرنے کے لیے جانا، اور ان سے امداد کی اپیل کرنا ہمارے سلسلہ کے اکابر کے یہاں معمول بہ رہا ہے، کسی علاقہ یا بستی والوں کا اس طریق کار پر پابندی لگانا گویا ان دینی سلسلوں کو بند کرنا ہے جو اپنے انجام کے اعتبار سے نہایت خطرناک ہے؛ اس لیے جو لوگ اس طرح کی فکر اور ذہنیت لیے ہوئے ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہیں، اور اپنے اس طرز عمل سے ایسے لوگ ملت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت اور صحیح سمجھ عطا فرمائے۔

(۴) جو اجنبی مسافر کسی بستی میں اپنی ذاتی ضرورت یا مسلمانوں کی دینی اجتماعی ضرورت کے لیے پہنچتا ہے، اس کی میزبانی اور خاطر تواضع قدیم زمانہ سے مسلمانوں خصوصاً شرفاء کا معمول رہا ہے، یہ اسلامی تعلیم بھی ہے، اس کے برخلاف کسی دینی مدرسہ کی ضرورتوں کے لیے تعاون حاصل کرنے کے لیے گئے ہوئے شخص کو جس کو سفیر کے نام سے جانا جاتا ہے، بستی کی مسجد میں اعلان سے روکنا اور مسجد کے اس حصہ میں جہاں دین کی نسبت پر آنے والے حضرات قیام کرتے ہیں اس کو قیام کرنے سے روکنا اور بستی چھوٹی ہونے کی وجہ سے آنے والے کے لیے اپنا پیسہ خرچ کر کے کھانے پینے کا نظم کرنا دشوار ہونے کے باوجود اس کی میزبانی اور مسافر کے حق کی ادائیگی سے بستی والوں کا غفلت برتنا یقیناً قابل مذمت اور اسلام نے جن پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دی ہے اس کے سراسر خلاف اور مروت کے بھی منافی ہے، ایسے لوگوں کو اپنے طرز عمل پر نظرِ ثانی کر کے اس کی جلد از جلد اصلاح کرنی چاہیے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

شادی سے پہلے دعوت کا حکم

سوال: شادی سے پہلے دن دولہا کے گھر پر بڑی دعوت ہوتی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اور اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شادی سے پہلے دن دولہا کے گھر دعوت کا مسنون نہ ہونا ظاہر ہے، اب اگر مسئولہ دعوت رسم ورواج کے طور پر ہوتی ہے تو اس کا ناجائز و بدعت ہونا بھی ظاہر ہے، اور اس میں شرکت کی بھی اجازت نہیں، اور اگر باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو کھلانے کے لیے نظم کیا گیا ہے، کوئی رسم پیشِ نظر نہیں تو اس کی اجازت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایک انسان کا گردہ دوسرے کو لگانا

سوال: حافظ زید صاحب کی کڈنی کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے، تین مفتیان کرام کے سامنے ہم نے فتویٰ رکھا تھا، تینوں مفتیان کرام نے اجازت دی تھی، حافظ صاحب کی ڈیڑھ سال سے کڈنی خراب ہے، ڈایالسس ہفتہ میں تین مرتبہ ہوتا ہے، عمر ستائیس سال ہے، دو بچیاں ہیں، ڈاکٹروں سے مشورہ لیا تھا ان کا کہنا ہے کہ کڈنی بدلنے سے آپ کو راحت مل سکتی ہے اور بہت علاج کیا؛ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، صرف ڈایالسس سے وقتی فائدہ ہوتا ہے اسی لیے کڈنی بدلنے کا آپ سے مسئلہ پوچھتے ہیں آپ جو بھی فتویٰ دیں گے ان شاء اللہ اس پر ضرور عمل کریں گے، اور کڈنی دینے والے رشتہ دار ہیں اور وہ اپنی خوشی سے کڈنی دیتے ہیں اور کوئی لالچ نہیں ہے، اور ایک مفتی صاحب سے ہم نے مسئلہ پوچھا تھا انھوں نے اجازت نہیں دی تھی اور جن مفتیان کرام سے ہم نے فتویٰ پوچھا تو وہ فتویٰ کو کاغذ پر لکھ کر نہیں دیتے؛ بلکہ وہ زبانی فتویٰ دیتے ہیں اسی لیے بڑے بھائی ماننے کے لیے

تیار نہیں ہیں، آپ جو بھی فتویٰ دیں تو کاغذ پر لکھ کر دیویں تو آپ کا شکریہ ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

انسان اپنے بدن یا کسی عضو کا مالک نہیں ہے کہ اس میں آزادانہ تصرف کر سکے، اسی بناء پر اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنا کوئی عضو کسی دوسرے شخص کو قیمتاً یا بلا قیمت دے دے، اور اس کی بہت سی نظائر کتب فقہ میں ہیں۔ فتاوی قاضی خان میں ہے: مضطر لم یجد میتة و خاف الهلاك فقال له رجل: اقطع یدی و کلها، او قال اقطع منی قطعة فکلها لا یسعه ان یفعل ذلك و لا یصح امر ه به کما لا یسع للمضطر ان یقطع قطعة من لحم نفسه فیأکل. "یعنی کوئی شخص حالتِ اضطرار میں ہے، اور بھوک کی وجہ سے اس کو اپنی جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، اور مردار جانور تک نہیں ہے کہ اس کا گوشت کھا کر اپنی جان بچائے، اس حالت میں کسی شخص نے پیش کش کی کہ تم میرا ہاتھ کاٹ کر کھالو، یا یوں کہا کہ کسی جگہ سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر کھالو تو اس مضطر کے لیے اس شخص کا ہاتھ یا گوشت کاٹ کر کھانا جائز نہیں ہے، اور کسی شخص کو اس طرح کی پیش کش کرنا بھی صحیح نہیں ہے (اس لیے کہ وہ خود اپنے ہاتھ یا اپنے بدن کے گوشت پوست کا مالک نہیں ہے) جس طرح خود مضطر کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بدن میں سے گوشت کاٹ کر کھائے۔ (فتاویٰ قاضی خان ۳٦٥ کتاب الحظر والاباحة)

یہی وجہ کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے؛ اس لیے کہ کوئی شخص اپنی روح کا مالک نہیں ہے کہ اسے ضائع کر دے، لہذا کسی زندہ یا مردہ انسان کا گردہ آپریشن کر کے نکال کر دوسرے انسان کے جسم میں لگانا جائز نہیں ہے۔ الاشباہ والنظائر میں "الضرر لا یزال بالضرر" ضرر کو ضرر سے دفع نہ کیا جائے۔ (الاشباہ ص ۱۰۹) فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الانتفاع باجزاء الآدمی لم یجز قیل للنجاسۃ وقیل للکرامۃ ھو الصحیح، کذا فی جواھر الاخلاطی. ”یعنی انسان کے کسی جز سے انتفاع جائز نہیں ہے، انتفاع کے عدم جواز کی علت یا تو نجاست ہے یا کرامت واحترام، صحیح کرامت واحترام کو علت قرار دینا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿ولقد کرمنا بنی آدم﴾ تحقیق کہ عزت دی ہم نے اولادِ آدم کو۔ (پارہ ۱۵/ رکوع ۶) (فتاوی عالمگیری ٦/ ۲۳٦ مطبوعہ کانپور)

حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اللہ کی لعنت ہے واصلہ اور مستوصلہ پر (واصلہ: وہ عورت ہے جو دوسرے کے بال عورتوں کے بالوں میں لگاتی ہے تاکہ سر کے بال زیادہ اور لمبے معلوم ہوں۔ مستوصلہ: وہ عورت جو اپنے بالوں میں دوسرے کے بال لگوائے)۔ مشکوٰۃ شریف میں بحوالۂ بخاری ومسلم حدیث ہے: عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبی ﷺ قال: لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ. (مشکوٰۃ شریف ص: ۳۸۱ باب الترجل) شامی میں ہے: وفی الاختیار ووصل الشعر بشعر الآدمی حرام، سواء کان شعرھا او شعر غیرھا لقولہ ﷺ لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ الخ ”یعنی کسی دوسری عورت کے بال اپنے بالوں میں جوڑنا حرام ہے، چاہے خود اس کے بال ہوں یا کسی دوسری عورت کے بال ہوں۔ حضور ﷺ کے اس فرمان ”لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ الخ“ کی بنا پر۔ (شامی ۵/ ۳۲۸، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی النظر واللمس)

صورتِ مسئولہ میں شخص مذکور حافظ زید کے لیے جائز نہیں کہ اپنے رشتہ دار سے گردہ لے کر اپنے جسم میں لگوائے۔

آج کل کی تحقیق کے اعتبار سے نفع ہوتا ہو تو اس سے انکار نہیں مگر ﴿اثمھما اکبر من نفعھما﴾ کے اصول پر ناجائز ہی ہوگا، نیز اس طریقہ میں انسانیت کی توہین بھی ہے،

کہ اگر یہ طریقہ چل پڑا تو انسانی اعضاء ''بکری کا مال'' بن جائیں گے اور یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ جس کا گردہ لیا جائے گا اس کی صحت اور زندگی خطرہ میں پڑے گی اور جس کو گردہ دیا جائے گا اس کی صحت یقینی نہیں ہے، اللہ ہی سے شفاء کی امید رکھیں، دوا اور علاج کے ساتھ دعاؤں کا بھی خصوصی اہتمام رکھیں، صدقہ و خیرات بھی حسبِ حیثیت کریں کہ صدقہ بلاؤں کو دور کرتا ہے، اللہ کو منظور ہوگا تو ان شاء اللہ ضرور شفاء عطا فرمائے گا، قضائے الٰہی پر راضی رہیں، اور ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے رہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۶/ ۲۸۶ تا ۲۸۸)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کے بغیر رشتہ طے کرنا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

سوال: زید کی منگنی ان کے دادا بکر نے عائشہ بنت خالد سے طے کی، زید کی والدہ فاطمہ کو اس منگنی سے بے خبر رکھا گیا، زید کو لڑکی بھی دکھلا دی گئی مگر زید کی مرضی نہیں معلوم کی گئی، زید کی والدہ پر منگنی کے متعلق مبارک بادی کا فون آیا تب اسے علم ہوا، نیز زید کی والدہ اس منگنی سے راضی نہیں، بالجبر منگنی طے ہوئی ہے فریق ثانی میں عائشہ کو بھی منگنی کا پتہ نہیں تھا اس سے بھی اس کے والدین نے منگنی کو پوشیدہ رکھا؛ البتہ عائشہ کے والدین راضی تھے، عائشہ کی والدہ کو کسی نے پوچھا کہ کیا عائشہ کو منگنی کا علم ہے؟ تو اس کی والدہ نے کہا کہ عائشہ کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ زید کے والد عمران کے والد بکر کے کہنے سے راضی ہو گئے ہیں، زید اور گھر کے دیگر افراد کو جب منگنی کا علم ہوا تو تعجب میں پڑ گئے؛ لہٰذا مذکورہ مسئلہ کے بارے میں شرعی رہنمائی فرما کر ممنون کریں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ''قد تقرر عندنا من سبر

طریق الشارع ان کل امر یقوم بجماعة یراعی فیه حال الطرفین، والاحادیث فیه ترد فی الجانبین وذلك هو الاصلح لاقامة النظم، فالصواب فی هذه المواضع ان تجمع احادیث الطرفین ویوخذ المرادمن مجموعها ومن یقصر نظره علی حدیث الجانب الواحد فانه لایدرك من مراد الشارع الاشطرا منه“

صاحب شریعت حضور اکرم ﷺ کے طریق کار پر غور وفکر کے نتیجہ میں جو بات ہمارے نزدیک ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق ایک جماعت یعنی چند افراد سے ہو ایسے معاملہ میں دونوں جانب کی حالت کا خیال رکھا جاتا ہے، اور احادیث اس سلسلہ میں دونوں فریق کی رہنمائی کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، اور نظم ونسق کو قائم رکھنے کے لیے یہی طریق کار موزوں اور مناسب ہے؛ اس لیے ایسے مواقع پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں طرف کی احادیث کو پیش نظر رکھا جائے اور دونوں کے مجموعہ کو سامنے رکھ کر صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سمجھنے کی کوشش کی جائے، جو آدمی صرف ایک طرف کی احادیث کو پیش نظر رکھے گا وہ صاحبِ شریعت ﷺ کی آدھی مراد پاسکے گا۔ (فیض الباری ۴/۲۸۴)

آگے چل کر حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اس کی چند مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں: ”فاعلم ان الاحادیث فی امر النکاح ایضا وردت بالوجهین الخ“ نکاح کے معاملہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا تعلق دونوں گروہ یعنی اولیاء اور ماتحتوں سے ہے جہاں ایک طرف ماتحتوں کو اولیاء کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم دیا گیا، وہاں دوسری طرف اولیاء کو بھی ماتحتوں کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی۔

صورت مسئولہ میں دادا نے پوتے کا رشتہ طے کرتے ہوئے پوتے اور اس کی

والدہ کی مرضی معلوم نہیں کی اور اپنے طور پر اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے یہ رشتہ طے کر دیا جس پر خود لڑکا جس کا رشتہ طے کیا گیا ہے راضی نہیں اور اس کی والدہ بھی اس رشتہ کے لیے تیار نہیں، اب اگر ان دونوں کی یہ ناراضگی اس لیے ہے کہ جہاں رشتہ طے کیا گیا ہے اس میں ان کے خیال سے شرعی طور پر نقص ہے یا لڑکے کو لڑکی پسند نہیں تو اس صورت میں دادا کو چاہیے کہ ان کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ بخاری شریف میں واقعہ ہے کہ ایک خاتون خنساء بنت حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح ان کے والد نے ان کی اجازت لیے بغیر کر دیا انہیں وہ نا گوار ہوا اور رسول اللہ ﷺ سے آکر شکایت کی تو آپ نے وہ نکاح کالعدم قرار دے دیا۔ (معاشرتی مسائل ص:۵۶)

جب آپ ﷺ نے لڑکی کے جذبات کی اتنی رعایت کی جس کے اختیار میں نکاح کے بعد طلاق کا حق بھی نہیں رہتا تو لڑکے کے جذبات کی رعایت بطریقِ اولیٰ کرنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی ناگوار صورت پیش آئے، اور اگر جہاں رشتہ طے کیا گیا ہے ان میں شرعی طور پر کوئی قابل اعتراض چیز نہیں اور ناپسند بھی نہیں، صرف اس لیے مخالفت کی جارہی ہو کہ ہم کو کیوں نہیں پوچھا گیا؟ تو لڑکے اور ان کی والدہ کا یہ رویہ شرعاً قابل مذمت ہے ان کو چاہیے کہ اپنے بڑوں کے فیصلہ کو سر چڑھا کر مان لیں، اسی میں اللہ کی طرف سے خیر ڈالی جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۲/۲/۱۴۲۵ھ، مفتی: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک نوساری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی: مدرسہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک نوساری

موبائل (MOBILE) سے متعلق چند اہم مسائل

سوال: بندہ موبائل کے مسائل کو کتابی شکل میں جمع کر رہا ہے اور آپ سے بھی

عرض کیا تھا کہ آپ بھی اپنے فتاوی موبائل سے متعلق عطا فرمائیں تو آپ نے دو مسئلے عطا فرمائے تھے، اب گزارش یہ ہے کہ مندررجہ ذیل سوالوں کی کتاب میں کمی محسوس ہو رہی ہے؛ اس لیے آپ کرم فرما کر مندرجہ سوالوں کے جوابات جلد عطا فرمائیں تاکہ کتاب بقر عید کی تعطیل تک تیار ہو کر منظر عام پر آسکے۔

سوالات: (۱) مدرس اور ٹیچر کا مدرسہ یا اسکول کے اوقات میں موبائل سے بات چیت کرنا کیسا ہے؟

(۲) مدرسہ کے طلباء کا موبائل استعمال کرنا۔

(۳) کنواری لڑکی کا موبائل استعمال کرنا جب کہ وہ عشق میں غیر محرم سے بات کرتی رہتی ہے۔

(۴) موبائل کے ذریعہ قبرستان میں بات چیت کرنا۔

(۵) موبائل کی جوابی رِنگ میں عورت کی آواز رکھنا۔

(۶) موبائل کی اسکرین پر جاندار کی تصویر یا کسی عورت کی تصویر رکھنا کیسا ہے؟

(۷) اسکرین پر لفظ اللہ یا آیات یا حدیث یا کلمہ لکھے ہوئے موبائل کو لے کر بیت الخلاء میں جانا شرعاً کیسا ہے؟

(۸) موبائل کی ٹون یا جوابی رنگ ٹون میں "السلام علیکم" رکھنا کیا حکم رکھتا ہے؟

(۹) موبائل پر نکاح جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو کیا ایسی کوئی شکل ہے جس میں موبائل پر نکاح جائز ہو؟

(۱۰) موبائل پر چاند کی گواہی لی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۱۱) موبائل پر چاند کی خبر قبول کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۱۲) موبائل میں رنگ ٹون کس طرح کی رکھنی چاہیے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) مدرس اور ٹیچر کے حق میں مدرسہ یا اسکول کے اوقات امانت ہیں؛ اس لیے کہ عقدِ اجارہ کے ذریعہ انھوں نے اپنے ان اوقات کو مدرسہ یا اسکول کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے، گویا وہ خود اس کے مالک نہیں ہیں، اس کے بعد مدرسہ یا اسکول نے اوقات میں جو تدریسی یا غیر تدریسی خدمت ان کے حوالہ کی ہے اس کی ان اوقات میں انجام دہی کے لیے خود انھی پر اعتماد کیا، اب اگر وہ ان اوقات میں موبائل سے بات چیت کریں گے تو گویا انھوں نے ان اوقات کے مدرسہ یا اسکول کی ہدایت کے مطابق استعمال کرنے میں ان پر کیے گئے اعتماد کی خلاف ورزی کر کے خیانت کا ارتکاب کیا جو درست نہیں؛ اس لیے ان حضرات کو ان اوقات میں اپنا موبائل بند ہی رکھنا چاہیے تاکہ گفتگو کی نوبت نہ آئے۔

(۲) طلباء کے لیے موبائل کا استعمال ان کی یکسوئی (جو حصول علم کے لیے ضروری ہے اس) میں مخل ہونے کے ساتھ اسراف بھی ہے یہ تو اس وقت جب وہ احتیاط کے ساتھ اس کو استعمال کرتے ہوں، ورنہ جیسا کہ دستور ہے بہت ساری خرابیوں کا باعث ہونے کی وجہ سے درست نہیں۔

(۳) کنواری لڑکی کا بذریعہ موبائل غیر محرم سے عشقیہ گفتگو کرنا حرام اور ناجائز ہے، نیز بہ نصِ حدیث زبان کا زنا ہے۔

(۴) موبائل کے ذریعہ قبرستان میں ضروری بات چیت کی جا سکتی ہے۔

(۵) عورت کی آواز اگرچہ مفتی بہ قول کے مطابق ستر نہیں؛ لیکن اجنبیہ کی آواز عموماً سننے والے کے دل میں وساوس اور خواہشات پیدا کرتی ہے؛ اس لیے جوابی رنگ

میں عورت کی آواز رکھنا درست نہیں۔

(۶) اس کا حرام ہونا بالکل ظاہر ہے۔

(۷) جب اسکرین پر لفظ اللہ یا آیات قرآنی یا حدیث یا کلمہ لکھا ہوا ہو تو ایسے موبائل کو جیب میں اس طرح لے کر بیت الخلاء میں جانا کہ وہ تحریر اندر چھپی ہوئی ہو اس کی اجازت ہے، اور اندر جانے کے بعد بھی اس کو جیب سے نکالا نہ جائے، ورنہ درست نہیں۔

(۸) اس کی گنجائش ہے؛ لیکن احتیاطی طور پر نہ رکھنا زیادہ مناسب ہے۔

(۹) نکاح میں چونکہ ایجاب وقبول ہوتا ہے اور دونوں کا ایک مجلس میں ہونا ضروری ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اس ایجاب وقبول کو بیک وقت دونوں گواہ بھی سن رہے ہوں اور یہ سب باتیں موبائل پر دشوار ہیں؛ اس لیے درست نہیں؛ البتہ اگر لڑکا یا لڑکی بذریعہ موبائل کسی کو اپنا وکیل بالنکاح بناوے اور پھر وہ وکیل مجلس نکاح میں ان کی طرف سے ایجاب وقبول کرے تو درست ہوسکتا ہے۔

(۱۰/۱۱) موبائل بھی فون ہی کی ایک قسم ہے؛ اس لیے جو حکم ٹیلی فون کا ہے وہی حکم اس مسئلہ میں موبائل کا بھی ہے۔

(۱۲) سادہ رنگ ٹون ہو، یعنی اس میں کسی قسم کی موسیقی یا گانا وغیرہ کا انداز نہ ہو، جیسے عام طور پر ٹیلی فون کی گھنٹی ہوا کرتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　۱۶/ ذی القعدہ ۱۴۲۷ھ

مہتمم کے اوصافِ مطلوبہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

ایک شخص ذاتی داؤد ٹرسٹ کے نام سے مدرسہ چلانا چاہے اور پھر اعلان بہ بانگِ دہل کہ مدرسہ کا بار مع طعام وقیام داؤد ٹرسٹ برداشت کرے گا؛ البتہ اگر فی سبیل اللہ کوئی دینا چاہے تو قبول کیا جائے گا ورنہ ہم کسی سے چندہ طلب نہیں کریں گے؛ مگر تاسیس ۱۹۸۱ء سال سے ۱۹۸۷ء تک حصر ہو کر عوام الناس سے چندہ لیتے رہے اب تو ۸۶/۸۷ء سال سے خود بانیٔ مدرسہ ابراہیم اور ان کے خدامین؛ نیز خصوصیت سے امیرِ تبلیغ تلوجہ چندہ وصول کرنے کے لیے بیرون پہنچتے رہے حالانکہ مدرسہ کے لیے بظاہر نہ املاک اور نہ جائداد وقف میں ہے؛ بلکہ داؤد ٹرسٹ کتنے لاکھ اور کتنی جائداد کا مالک بنایا گیا ہے، وہ بھی خدائے برتر کو اور انہیں کو علم ہو؛ البتہ ٹرسٹ عدم رجسٹری کی تحقیق مصدقہ شخص معتبر سے موصول ہوئی پھر مزید برآنکہ تختۂ سیاہ پر افتتاح سے آج تک زیرِ اہتمام داؤد ٹرسٹ کا نام آویزاں ہے، درسگاہ کرایہ کی عمارت میں ہے، تاسیس جدیدہ کی جگہ دیگر شخص نے زبانی وقف کی ہے، پھر حال اینکہ بانیٔ مدرسہ اور ان کے اپنے ہی دو یا تین چنیدہ ممبران علوم دینیہ سے بالکل ہی نابلد ہیں، یہ کیفیات ہوتے ہوئے بھی بانیٔ مدرسہ ابراہیم نہ علماءِ دین اور نہ بزرگانِ دین کی سرپرستی کی ضرورت محسوس کرے اور نہ مجلسِ شوریٰ اور نہ منتظمہ کمیٹی کو قبول کرے؛ بلکہ اپنے ہی تسلط کا خواہاں ہے تو ایسی ناقابل اعتبار کیفیات کو دیکھتے ہوئے ایک فرد واضح سخن محترم محمد حسین (عرفِ عام محمد سیٹھ) بول بیٹھے ابراہیم یہ کیا ماجرا ہے؟ تم سے میں نے وقتِ اجرا ہی جب سوال کیا کہ ''تم اتنا بڑا کام جو آج کا چھوٹا کل کا بڑا'' اکیلے کیسے تحمل کر پاؤ گے تو تمہاری طرف سے یہ جواب رہا کہ (ہمارے مل سے) یعنی رائس میل کا سالانہ منافع خرچ میں لگا دیں گے اور ہم کسی سے مدد طلب نہیں کریں گے اب منافع کی کیا گیارنٹی؟ پھر آپ منافع کے اکیلے مالک تو نہیں بہت چند ہیں، پھر وقت منافع پر ہی برقرار رہے یہ کس

عمل پر؟ اس لیے کہ زمانہ کے ساتھ جوار بھاٹا ضرور ہے حال اینکہ آپ کا داؤد ٹرسٹ اس مختصر سی تعداد پندرہ یا پچیس افراد کے طعام و قیام اور مدرسہ کی دیگر ضروریات کا بار اگر برداشت نہ کر سکے تو یہ ٹرسٹ کتنا اونچا ہوگا؟ اور پھر اونچا مکان پھیکا پکوان کے مترادف قول و فعل میں یہ امتیاز کیا معنی؟ گویا مدرسہ ہر اعتبار سے سادہ لوح عوام الناس کا محتاج احسان ہے تو کیا مذکورہ بالا متضاد بیان اور ناقص ٹرسٹ کے باوجود ایسا شخص از روئے شریعت مدرسہ چلانے اور چندہ وصولی کا مجاز ہے یا نہیں؟

برائے کرم مدارسِ دینیہ کے ناگفتہ بہ حالات اور نااہل چند ٹکوں کے مولوی صاحبان کو پیش نظر رکھتے ہوئے مفصل جواب مع مہر ثبت کر کے ارسال فرمائیں تاکہ ایسے متضاد بیان دے کر مدرسہ چلانے والوں پر روک لگ جائے؛ اس لیے کہ ٹرسٹ رجسٹری کے لیے گورنمنٹ بزرگی کا تو سرٹیفکٹ نہیں طلب کرتی؛ البتہ شرط ہے کہ قوانین کا پابند ہو۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے۔ آمین۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ٹرسٹ کا معنی ہے وقف، وقف کا لغوی ترجمہ ہے روکے رکھنا، اور شریعت کی اصطلاح میں هو حبسها (ای العین) علی حکم ملك الله تعالیٰ وصرف منفعتها علی من احب (درمختار) ''کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں دیتے ہوئے اس کے منافع کو صرف کرنا (موقوف علیہم پر)'' اس کے شرائط وارکان ہیں جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ سوال میں مذکور تفصیلات سے مترشح ہوتا ہے کہ داؤد ٹرسٹ قائم کرنے والے نے اپنی کسی ملکیت کو وقف نہیں کیا ہے پھر یہ ٹرسٹ کیسا؟ ہاں اگر اس شخص نے اپنی کسی ملکیت کو وقف کر کے اس کے منافع ''آمدنی'' سے مدرسہ چلانے کا ارادہ کیا

ہوتا تو اس ٹرسٹ کی گنجائش تھی، پھر جب انھوں نے یہ اعلان اور دعویٰ کیا تھا کہ ہم کسی سے چندہ طلب نہیں کریں گے تو انہیں اپنے اس دعویٰ پر قائم رہنا چاہیے تھا، ارشاد ربانی:

﴿یأیھاالذین آمنوا لم تقولون مالاتفعلون کبر مقتاعنداللّٰہ ان تقولواما لاتفعلون﴾

کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں: مالا تفعلون کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ جو کام تمھیں کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو، جس سے ایسے کام کے دعویٰ کی ممانعت تو واضح ہو ہی گئی جس کو کرنے کا عزم وارادہ ہی انسان کے دل میں نہ ہو کیونکہ یہ تو محض ایک جھوٹا دعویٰ ہے نام ونمود وغیرہ کے لیے ہوسکتا ہے؛ مگر ظاہر ہے کہ شانِ نزول کے واقعہ میں جن صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مذاکرہ کیا وہ ایسے نہ تھے کہ دل میں کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور دعویٰ کریں؛ اس لیے اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اگرچہ دل میں عزم اور ارادہ کام کرنے کا ہو پھر بھی اپنے نفس پر بھروسہ کرکے دعویٰ کرنا کہ ہم فلاں کام کریں گے شانِ عبدیت کے خلاف ہے، اول تو اس کے کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے؟ جب موقع ملے کر گزرنا چاہیے اور کسی مصلحت سے کہنا بھی پڑے تو اس کو ان شاء اللہ کے ساتھ مقید کردے تو پھر وہ دعویٰ نہیں رہے گا۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کام کا دعویٰ کرنا جس کے کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور اس کو کرنا ہی نہ ہو تو گناہِ کبیرہ اور اللہ کی سخت ناراضگی کا سبب ہے، ﴿کبر مقتا عند اللہ﴾ کا مصداق یہی ہے، اور جہاں یہ صورت نہ ہو بلکہ ارادہ کرنے کا ہو وہاں بھی اپنی قوت وقدرت پر بھروسہ کرکے دعویٰ کرنا ممنوع ومکروہ ہے۔ (معارف القرآن ۸/۴۲۴)

رہا ایک دینی مدرسہ کا انتظام واہتمام تو ظاہر ہے اس کے حقدار حاملینِ قرآن اور پابند شریعت لوگ ہیں۔ امام مالکؒ کا ارشاد کہ مسلمانوں کی رہنمائی وہی کرسکتا ہے جس

کی زندگی پیغمبرِ اسلام ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا نمونہ ہو، اور حضرت حافظ ابن تیمیہؒ کا فرمان ہے کہ امت کا اتفاق ہے کہ عالم باعمل مسلمان سیادت وقیادت کا اہل ہے اگر ایسا شخص میسر نہ ہو تو یہ منصب مجبوراً دو شخصوں میں سے ایک کے سپرد کیا جائے گا، عالم فاسق یعنی عالم بے عمل کو، جاہل متقی یعنی بے علم باعمل کو۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲/۱۶۴)

صرف مالدار ہونے یا امداد کرنے کی بناء پر انسان اہل نہیں ہوسکتا، حضرت مولانا عبدالحی کفلیتوی سورتیؒ فرماتے ہیں کہ گو مہتمم مدارس دولت مند ہیں دنیا کے نشیب وفراز کو بخوبی جانتے ہیں؛ لیکن جب انہوں نے نہ مدارس اسلامیہ دیکھے ہوں، نہ ان کے قوانین انتظام سے کسی طرح واقف ہوں، بھلا بتلایئے بدون مشورہ مدرسین بالاستقلال مدارس کا کیسے انتظام کرسکتے ہیں؟ ایسے انتظام کا آخرکار یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مدرسہ میں کچھ ایسی بدنظمی ہوجاتی ہے کہ ترقی علوم کے جتنے باب ہیں سب مسدود ہوجاتے ہیں۔ (سوانح علوم اسلامیہ ۳۸)

خلاصۂ کلام یہ کہ متولی اور مہتمم عالم باعمل ہونا چاہیے، اگر ایسا میسر نہ ہو سکے تو صوم وصلوٰۃ کا پابند، امانت دار، مسائلِ وقف کا جاننے والا، خوش اخلاق اور رحم دل، منصف مزاج، علم دوست، اہل علم کی تعظیم وتکریم کرنے والا ہو جس میں یہ صفات زیادہ ہوں اس کو متولی ومہتمم بنانا چاہیے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲/۱۶۵،۱۶۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ ذی الحجۃ الحرام ۱۴۰۷ھ

مظالم کے خلاف احتجاج میں مسجد کو مقفل کرنا

سوال: کیا کسی مسجد کے امام ومتولی کے لیے شرعاً یہ جائز ہے کہ حکومت کے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کی غرض سے شہر کی جامع مسجد کو مقفل کردے اور عام مسلمانوں کو اس میں جمعہ اور جماعات کے قیام سے روک دے؟ کیا یہ فعل قرآن پاک کی آیت

﴿ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھااسمہ وسعی فی خرابھا﴾ کے تحت نہیں آتا؟ نیز اپنی مرضی کے مطابق قرآن پاک کی اس صریح نص کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کے لیے مفتیان کرام پر جبر و زیادتی کرنا، اور انھیں مرعوب کر کے فتویٰ حاصل کرنا رواہے؟ ایسے امام ومتولی اوران کے حامیوں کا از روئے شرع کیا حکم ہے؟ مدلل جواب تحریر فرما کر مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی جائے اوراجر وثواب حاصل کیا جائے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کی غرض سے مسجد کو مقفل کرنا اور عوام مسلمین کو اس میں جمعہ وجماعات کے قیام سے روکنا جائز نہیں، یہ فعل آیت کریمہ ﴿ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعی فی خرابھا﴾ میں داخل ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں ’’دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں ذکر ونماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز وحرام ہیں، ان میں سے ایک صورت تو یہ کھلی ہوئی ہے ہی کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز وتلاوت سے صراحۃ روکا جائے‘‘ (معارف القرآن ۱/۲۹۹)

تفسیر قرطبی میں ہے: وعلی الجملة فتعطيل المساجد عن الصلاة واظهار شعائر الاسلام فيها خراب لها. (۷۷/۲) ’’مساجد کو نماز اوراس میں شعائر اسلام کے اظہار سے معطل کر دینا اس کو ویران کرنا ہے‘‘۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں صراحت فرمائی ہے کہ نماز باجماعت نماز جمعہ بھی شعائر میں داخل ہے وہ فرماتے ہیں: ’’وشعائر در

اصل جمع شعیرہ ست یا جمع شعارہ است بہ معنی علامت وشعائر اللہ، درعرف دین مکانات وازمنہ وعلامات واوقات عبادت را گویند، اما مکانات عبادت پس مثل کعبہ وعرفہ مزدلفہ و جمار ثلاثہ وصفاومروہ ومنی وجمیع مساجد اند۔ واماازمنہ پس مثل رمضان واشہرِ حرم وعیدالفطر و عیدالاضحیٰ وجمعہ وایام تشریق اند۔ واماعلامات پس مثل اذان واقامت وختنہ ونماز بجماعت ونمازِ جمعہ ونماز عیدین اند''۔ (تفسیر فتح العزیز:۳۴۷)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ آیت بالا کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''ازیں آیت معلوم می شود کہ ہر کہ مسجد را از ذکر ونماز معطل سازد وسعی درخرابی صوری یا معنوی آں کند ظالم ترین مردم است'' (۵۵۹) (یعنی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی مسجد کو ذکر اور نماز سے معطل کردے اور اس کی ظاہری یا باطنی ویرانی کے درپے ہو وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ ظالم ہے)

آگے مزید تحریر فرماتے ہیں: ''دوم آنکہ ہر کہ از ذکر خدا مانع شود ومردم را از اقامت دین وشعائر شرع بوجہے از وجوہ باز دارد دریں وعید شدید داخل است، ہر مسلمان را ازیں امر احتراز تام باید نمود واز مقدمات ودواعی واسباب قریبہ وبعیدہ ایں کار احتیاط تمام باید کرد'' (۵۵۹) (یعنی جو شخص بھی ذکر خدا سے مانع بنے اور لوگوں کو دین اور شعائر شریعت کے قائم کرنے سے کسی نوع سے بھی باز رکھے اس شدید وعید میں داخل ہے، ہر مسلمان کو اس حرکت سے مکمل احتراز کرنا چاہیے اس کے قریبی اور دور کے اسباب اور دواعی اور مقدمات سے کامل احتیاط کرنا چاہیے)۔

جب اس فعل کا ناجائز وحرام ہونا ثابت ہو چکا تو اس کے لیے مفتیان کرام پر جبر وزیادتی کرکے جواز کا فتویٰ حاصل کرنے کی سعی بھی نہایت درجہ مذموم ہے، ایسے آدمی کو

چاہیے کہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے اور سچے دل سے توبہ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/شوال ۱۴۰۷ھ

نسبندی حرام ہے

سوال: نسبندی کے بارے میں تفصیلاً حکم قرآن وحدیث کی روشنی میں فرمائیں، اس طرح اس میں جو مسلمان ڈاکٹر آپریشن کرتے ہیں کیا ان کا یہ کام آخرت میں قابل مواخذہ ہوگا یا نہیں؟ تسلی بخش جواب عطا فرمائیں، عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

خصی ہونا اولاد سے محرومی اور بے زاری اور کفران نعمت ہے یہ فعل نصاً حرام بھی ہے، حدیث میں ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے معصیت سے بچنے اور دنیاداری سے بےفکر ہوکر خدا کی عبادت میں مشغول رہنے کے مقصد سے خصی ہونے کی خواہش ظاہر کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی، اور قرآن شریف کی آیت تلاوت فرمائی: ﴿یاایها الذین اٰمنوا لاتحرموا طیبات ما احل اللّٰہ لکم ولاتعتدوا ان اللّٰہ لایحب المعتدین﴾ (بخاری شریف ۲/۷۵۹) اس سے معلوم ہوا کہ خصی ہونا یعنی قطع نسل کا عمل بہ نص قرآنی حرام ہے اور حدود اللہ سے تجاوز ہے؛ لہٰذا یہ عمل بالاتفاق حرام ہے۔ (عینی شرح بخاری)

اور فقہاء نے بھی لکھا ہے: اما خصاء الآدمی فحرام (یعنی انسان کا خصی ہونا حرام ہے)۔ (درمختار علی الشامی ۵/۲۷۵)

آیت قرآنی ﴿لاتقتلوا اولادکم خشیة املاق﴾ الخ کے ذیل میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے اس ارشاد سے اس معاملہ پر بھی روشنی پڑتی ہے جس میں آج کی دنیا گرفتار ہے کہ کثرت آبادی کے خوف سے

ضبط تولید اور منصوبہ بندی کو رواج دے رہی ہے، اس کی بنیاد بھی اسی جاہلانہ فلسفہ پر ہے کہ رزق کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھ لیا گیا ہے، یہ معاملہ قتل اولاد کے برابر گناہ نہ سہی مگر اس کے مذموم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (معارف القرآن ۵/۴۹۳)

جب اس فعل کا ناجائز وحرام ہونا معلوم ہو گیا تو کسی مسلمان ڈاکٹر کے لیے اس کا ارتکاب جائز نہیں۔ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/شوال ۱۴۰۷ھ

ایک بلڈنگ تین جگہوں میں وقف

سوال: موضع کھیتیہ میں ایک شخص نے اپنی بلڈنگ تین جگہوں میں وقف کی یا ایک بلڈنگ تین کے درمیان وقف کی ہے، کھیتیہ بیت المال کھیتیہ قبرستان اور کھیتیہ سے قریب آٹھ دس میل کے فاصلہ پر ''میلن'' ایک جگہ ہے جہاں مسجد نہیں، عبادت خانہ جماعت خانہ ہے اس میں ایک حصہ............ اب اس بلڈنگ کی قیمت سب نے مل کر ساٹھ ہزار طے کی ہے، اب کھیتیہ والے میلن والوں کو یہ کہتے ہیں کہ یا تو آپ چالیس ہزار دے دو اور پوری بلڈنگ لے لو یا ہم بیس ہزار دے دیتے ہیں ہمیں بلڈنگ کے مالک بنادو، مالک یعنی ہمارے یہ دو حصوں میں ملا دو............ یا میلن والوں کا کہنا ہے کہ کھیتیہ والوں کا ایک کھیت ہے اس کا مطالبہ کرتے ہیں اس حصہ کے عوض تو اس قسم کا تبادلہ اگر کریں تو از روئے شرع جائز ہے کہ نہیں؟ بیت المال کی تفصیل ابھی نہیں پوچھی ہے، اگر بیت المال سے مراد مسجد کی رقم ہے تو کیا حکم ہے؟ وہ بھی تحریر فرمادیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وقف میں تبدیلی جائز نہیں ہے۔

واذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه. (هدایه ۶۲۰/۲) فاذا تم ولزم لا یملك ولا یملك ولا یعار ولا یرهن …… ولا یقسم. (درمختار علی هامش الشامی ۳۶۷/۳)

بیت المال سے وہی مراد ہوگا جو وہاں کے عرف میں اس لفظ سے مراد لیا جاتا ہے؛ بہرحال جو بھی ہو تبدیلی بالکل جائز نہیں ہے بلکہ اس بلڈنگ کو تین الگ حصوں میں تقسیم کرنا بھی جائز نہیں ہے، صرف اس کی آمدنی تین حصوں میں تقسیم کی جائے۔ کما هو ظاهر من عبارة الدر وصرح ایضاً بعد ذلك. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/صفر المظفر ۱۴۰۷ھ

جھینگہ کھانا

سوال: جھینگہ کا کھانا کیسا ہے اس پر بھی روشنی ڈالیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

حنفیہ کے نزدیک دریائی جانوروں میں سے صرف مچھلی جائز ہے اور کوئی جانور جائز نہیں، جھینگہ مچھلی اگر مچھلی ہی کی کوئی قسم ہے تو وہ جائز ہے جیسا کہ علامہ دمیری شافعیؒ نے حیٰوۃ الحیوان ۱/۳۷۱ میں لکھا ہے اور اسی سے تتمہ ثالثہ امداد الفتاویٰ ۵۰ میں نقل کیا ہے اگر یہ مچھلی کی قسم نہیں بلکہ کوئی اور جانور ہے اور محض نام جھینگہ مچھلی مشہور ہوگیا ہے تو یہ جائز نہیں جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ ۱۲۲/۲ میں ہے، مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی ۱۱۰/۲ میں دونوں قول نقل کیے ہیں، حمادیہ کی عبارت نقل کی ہے: الدود الذی یقال له جهینگا حرام عند بعض العلماء لانه لا یشبه السمك، فانها یباح عندنا من صید البحر انواع السمك وهذا لا یکون کذلك وقال بعضهم حلال لانه یسمی باسم السمك. اه.

۱۰۴/۳ اور ۱۰۷ میں بھی دونوں قول نقل کیے ہیں۔ تذکرۃ الخلیل ۲۰۰ میں عدم جواز کا فتویٰ

ہے یہی راجح ہے؛ نیز جب کہ اس میں حرمت کا قول بھی ہے تو اس سے اجتناب ہی بہتر ہے:لقوله عليه السلام دع مايريبك الى مالا يريبك الحديث. (فتاویٰ محمودیہ ۵/۱۲۴)

مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم فرماتے ہیں ''احقر نے علم الحیوان کے ماہرین سے اس کی تحقیق کی تو وہ سب اس بات پر متفق نظر آئے کہ جھینگا مچھلی نہیں ہے اور دونوں کے درمیان وہ نسبت ہے جو شیر اور بلی کے درمیان پائی جاتی ہے، مچھلی کی جو تعریف علم الحیوانات کی کتابوں میں مرقوم ہے اس کی رو سے بھی جھینگا مچھلی کے مصداق میں داخل نہیں ہوتا۔ (درس ترمذی ۱/۲۸۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حررہ: العبد احمد عفی عنہ

یکم محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

پھٹے ہوئے روپئے کم قیمت سے بیچنا

سوال: آج کل یہ جو رواج ہے کہ پھٹے ہوئے روپئے دیے جاتے ہیں اور ان کو نئے روپئے سے بدلنے کے لیے مثلاً فی روپیہ دس پیسہ لیتے ہیں یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

روپیہ کا نوٹ (چاہے نیا ہو یا پرانا) نوے پیسے کے عوض بیچنا جائز ہے۔ (کفایت المفتی ۸/۱۰۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

فتویٰ کو نہ ماننا

سوال: اگر کوئی آدمی فتویٰ کو نہیں مانتا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

گنہگار ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایامِ حمل میں عوارض پیش آتے ہی ہیں

سوال: اگر کسی عورت کو حمل قرار پاتے ہی طبیعت بگڑ جاتی ہو کبھی پیٹ میں درد ہوتا ہو اور کبھی سر میں درد ہوتا ہو؛ الغرض ایامِ حمل کے پورے دن تکلیف ہی میں گزرتے ہوں اور معاً ضعف اور کمزوری بھی بہت بڑھ جاتی ہو تو ایسی عورت کے لیے شرعاً آپریشن کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زمانۂ حمل میں عورت کو اس قسم کے عوارض پیش آتے ہی ہیں۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کھانے کی ابتداء اور انتہاء نمکین سے

سوال: قبل الطعام اور بعد الطعام میٹھی چیز کھانا عندالشرع کیسا ہے؟ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد نمک چاٹنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نبی کریم ﷺ کو میٹھا مرغوب تھا اس کی تصریح روایاتِ حدیث میں موجود ہے؛ لیکن قبل الطعام یا بعد الطعام میٹھا استعمال کرنے کے متعلق کوئی تصریح نظر سے نہیں گزری۔ عالمگیری میں نمکین چیز سے ابتداء کرنے اور نمکین پر ختم کرنے کو سنت لکھا ہے (۵/۳۳۷)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

”مجھے ہندو سمجھو مسلمان نہ سمجھنا“ کہنا

سوال: ساتھ ہی ساتھ دوسری بات ایک اور ہے جو آدمی دنیوی جائداد کے لیے بولا ہے کہ مجھے مسلمان نہ سمجھنا ہندو سمجھو کیوں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو مجبور کرتا ہے اس کو دوسرے مسلمان بھائی سمجھاتے ہیں تو وہ آدمی لوگوں کے سامنے قبول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

اب لفڑا نہیں کروں گا، اس کے بعد غیر مسلم لوگوں کو ساتھ میں لے کر پھر لفڑا کرتا ہے تو مسلمان بھائی بولے کہ تم ہندو لوگوں کا ساتھ پکڑتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ ''تم مجھے ہندو سمجھو مجھے مسلمان نہ سمجھنا'' ایسا بولا اس کے بھی بارے میں معلومات دینا کہ وہ آدمی دین میں شامل ہے یا دین سے خارج ہو جاتا ہے، معلوم کرانا اس کے بھی بارے میں معلومات کیا تو ایک مولانا بولے کہ وہ آدمی دین سے خارج ہوا ہے ایسا ہم کو جواب ملا؛ اس لیے آپ جواب دینا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ کلمہ کفر ہے، اس آدمی پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے۔ ''مالا بد منہ'' میں ہے ''اگر کسے دیگرے را گفت تو کافر شدی او جواب داد کہ کافر شدہ گیر کافر شد'' (ص ۱۳۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔ حررہ: احمد عفی عنہ خانپوری

۱۳ر محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

قومی فساد کا علم ہوتے ہوئے نہ بتانا بہت برا ہے ایسے کو مسلمان کے قبرستان میں دفن کرنا

سوال: (۱) مکرمی مفتی صاحب دارالافتاء جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

گذارش خدمت یہ ہے کہ حسب ذیل استفتاء کا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں:

چند سال قبل ہمارے گاؤں میں ہندو مسلم فساد ہوا فساد ہونے سے چند روز قبل ایک شخص کو اس بات کا علم تھا باوجود اس نے اپنی قوم کو بتایا نہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس کی یہ حرکت یقیناً بڑی شنیع ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہو جاتا۔

قال الشيخ الامام ابو محمد بن عبد الله فى كتاب القواعد اذا اردت

معرفة الفرق بين الصغيرة والكبيرة فاعرض مفسدة الذنوب على مفاسد الكبائر المنصوص عليها، فان نقصت عن اقل مفاسد الكبائر فهى من الصغائر، وان ساوت ادنى مفاسد الكبائر او ربت عليه فهى من الكبائر ...... الى ان قال ...... وكذالك لو دل الكفار على عورات المسلمين مع علمه انهم سيستأصلون بدلالته ويسبون حرمهم واطفالهم ويغنمون اموالهم فان نسبته الى هذه ا المفاسد اعظم من توليه يوم الزحف بغير عذر مع كونه من الكبائر.

(فتح الملهم ۱/ص ۲۵۱)

اس آدمی کو چاہیے کہ توبہ کرے، استغفار کرے۔

سوال: (۲) اسی شخص نے مسلم محلے میں مندر تعمیر کرنے کی اجازت دی، مندر کے پچھواڑے ایک جگہ ہندو قوم بیچنا چاہتی تھی اور اس روپیوں سے مندر تعمیر کیا جانے والا تھا جماعت کی میٹنگ میں تجویز اتفاق رائے سے منظور کی گئی مگر چند مہینوں کے بعد اسی شخص یعنی یونس میاں ساٹھ لیکر نے کچھ روپیوں کی خاطر وہ جگہ مسلم بھائی کو بیچنے لینے کہا جو گاؤں میں ''ہندو مسلم'' فساد کا باعث بن سکتا ہے۔

ہم اس شخص پر فتوی چاہتے ہیں کہ ایسے شخص کو مرنے کے بعد مسلمانوں کے قبرستان میں دفنانا جائز ہے یا نہیں؟ جواب جلد دیجئے امید ہے کہ ان مسئلوں کا تفصیل سے جلد از جلد جواب دیکر شکریہ کا موقع دو گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس کا بھی یہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا، محض اتنی بات پر اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے سے منع نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ویصلی علی کل بروفاجر اذا مات علی الایمان للاجماع ولقوله علیه الصلوٰة والسلام: لاتدعواالصلوٰة علی من مات من اهل القبلة. (شرح عقائد نسفی ۱۱۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

حررہ: العبد احمد خانپوری

۱۰/ربیع الآخر ۱۴۰۷ھ

دوکان کا مال جانچنے والے کو رشوت دینا

محترم ومکرم حضرت مفتی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام آپ سے قوی امید ہے کہ حسب ذیل سوال کا جواب جلد از جلد عطا فرمائیں گے۔

سوال: کرانہ دوکان داروں کے پاس ہر مہینے حکومت کی طرف سے مقرر شدہ جن کو بھیڑ سیٹر والے کہا جاتا ہے (مال جانچنے والے) آتے ہیں، اور مال کو دیکھتے ہیں مال دیکھنے کے بعد انھیں کچھ روپے مل گئے تو ٹھیک ہے ورنہ مال کو پکڑا دیتے ہیں، چاہے دوکان دار نے مال میں ملاوٹ کی ہو یا نہ کی ہو، جھوٹ سچ کر کے وہ مال پکڑا کر دوکان بند کرا دیتے ہیں کیوں کہ اوپر تک سب انہی کے آدمی ہوتے ہیں؛ اس لیے ہماری طرف ہر گاؤں میں سب دوکان دار مل کر ان کی تنخواہ کے علاوہ کچھ روپیہ مقرر کر دیتے ہیں ان کو اس طرح پیسہ دینا کیسا ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کوئی جواز کی شکل نکل سکتی ہے یا نہیں کیوں کہ ان کو پیسہ نہ دینے کی صورت میں تجارت بند کرنی پڑتی ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

رشوت کا دینا لینا حرام ہے؛ البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لیے

بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے، اس صورت میں فقط رشوت لینے والا گنہ گار ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۰/شوال ۱۴۰۷ھ

سات چیز حلال جانور کی کھانا منع ہے

سوال: مرغا، مرغی کی کون کون سی چیزیں شرعاً کھانا جائز نہیں ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سات چیز حلال جانور کی کھانا منع ہیں: ذکر، فرجِ مادہ، مثانہ، غدود، حرام مغز جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے، خصیہ، پتہ، مرارہ جو کلیجی میں تلخ پانی کا ظرف ہے، اور خون سائل قطعی حرام ہے۔ باقی سب اشیاء کو حلال لکھا ہے مگر بعض روایات میں کڑوے کی کراہت لکھتے ہیں اور کراہت تنزیہیہ پر حمل کرتے ہیں۔ (فتاوی رشیدیہ ۲/۹۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶ صفر المظفر ۱۴۰۷ھ

دستاویز نکالنے میں رشوت دینا

سوال: کسی آدمی کے پاس ایک زمین ہے اور اس کا دستاویز نکالنا ہے، اور اس دستاویز نکالنے کے اندر رشوت دیے بغیر کام نہیں چلتا اور وہ زمین خود ہماری ہی ہے، اور خالص اس کے دستاویز کے ہی اندر وہ رشوت طلب کرتا ہے تو کیا اس رشوت کو دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اپنا جائز حق اس کے بغیر حاصل نہ ہوتا ہو تو رشوت دینے کی اجازت ہے، لینے والا تو اس صورت میں بھی گنہ گار رہوگا۔ (شامی ۵/۳۰۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۷ھ

قبرستان کی زمین میں تعمیر، کھیتی وغیرہ جائز نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیان عظام مندرجۂ ذیل مسئلہ کے بارے میں:

زمین کے مالک تین ہیں، یعنی تھوڑی سی زمین ہے اس میں زید، عمر، بکر تینوں کی ملکیت ہے، اوران تینوں نے اس زمین کو وقف کردی مسجد کو، وہ زمین ایسی ہے کہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ زمین پہلے قبرستان تھی، آج بھی ایک سوتیرہ سالہ عورت موجود ہے وہ بھی یہی کہتی ہے کہ میں بھی یہی سنتی ہوں کہ یہ قبرستان تھی؛ لیکن اس عورت نے اور آج تک کسی فرد انسان نے اس زمین پر دفن ہوتے کسی کو دیکھا نہیں اور نہ قبر کے نشانات ہیں، ظاہری طور پر، اور یہ تھوڑی زمین ہے اور دائیں بائیں دوسروں کی زمین ہے کیا ایسی صورت میں جبکہ سنا جاتا ہے کہ قبرستان تھی تو اس زمین کو وقف کرنا جائز ہے؟

اور کیا مسجد کی آمدنی کے لیے اس زمین پر کمرہ بنا کر کرایہ پر دے سکتے ہیں یا ایسے ہی مسجد کا کمرہ بنوا سکتے ہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کیا قلت جگہ کی وجہ سے دینی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے (ضرورۃً) اس سلسلہ میں صحیح اور بالتفصیل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قبرستان کی زمین اگر مملوکہ ہو اور اس کی قبریں اتنی پرانی ہوگئیں ہیں کہ ان کا نام ونشان مٹ چکا ہے، اوران میں کے مردے بھی مٹی ہو چکے ہیں تو اس میں تعمیر اور کھیتی وغیرہ سب مالک کے لیے اور مالک کی اجازت ورضامندی سے دوسروں کے لیے جائز ہے۔

ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره فى قبره وزرعه والبناء عليه، كذا فى التبيين. (عالمگیری ۱/۱٦۷، تبیین الحقائق شرح کنزالدقائق ۱/۲٤٦)

اور اگر وہ مملوک نہیں ہے وقف ہے (قبرستان کے لیے وقف ہے) تو چاہیے

تقادمِ زمان کی وجہ سے وہاں قبروں کا نام ونشان باقی نہ رہا ہو اور لوگوں نے دفن کرنا چھوڑ دیا ہو پھر بھی اس کی وقفیت باطل نہیں ہوگی اور اس کو دفن کے علاوہ دیگر کام مثلاً تعمیر، کھیتی وغیرہ میں استعمال کرنا درست نہیں۔

عالمگیری میں ہے: وسئل هو ایضا عن المقبرة فی القریٰ اذا اندرست ولم یبق فیها اثر الموتیٰ لاالعظم ولا غیره هل یجوز زرعها واستغلالها؟ قال: لا، ولها حکم المقبرة. کذا فی المحیط. وفی هامشه قوله لا هذا لاینافی ماقاله الزیلعی فی باب الجنائز من ان المیت اذا بلی وصار ترابا جاز زرعه والبناء علیه. اه. لان المانع هنا کون المحل موقوفا علی الدفن فلا یجوز استعماله فی غیره. فلیتأمل ولیحرر. (۲/۴۷۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/صفر المظفر ۱۴۰۷ھ

کیا علماء کی ٹوپی انگریز کی ٹوپی کے مشابہ ہے؟ حضور ﷺ کا عمامہ کیسا تھا؟

سوال: بعض لوگ اصرار کے طور پر کہتے ہیں کہ آج کل جو علماء لمبی ٹوپی پہنے ہوئے ہوتے ہیں یہ انگریز کی ٹوپی ہے مسلمان کو یہ ٹوپی نہیں پہننا چاہیے، اس کا تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

نیز آپ ﷺ کا معمول زیادہ تر عمامہ پر رہا یا ٹوپی پر، اور ٹوپی لمبی یا گول اور عمامہ کا رنگ اور مقدار مسنونہ سے مطلع فرماویں تو عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

انگریز عموماً ہیٹ کا استعمال کرتے ہیں، کسی انگریز کو علماء پہنتے ہیں ایسی ٹوپی پہنتے نہیں دیکھا گیا، یہ امر مشاہد اور بدیہی ہے اس کا انکار مکابرہ ہے؛ بلکہ بعض روایتوں سے

معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ٹوپی کو بطور سترہ استعمال فرمایا ہے۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ لمبی ہوگی ورنہ سترہ کا کام کیسے دے سکتی ہے؟

وكان ربما نزع قلنسوته فجعلها سترة بين يديه وهو يصلى. (الدعامة ٣٦)

آپ ﷺ عمامہ ٹوپی کے ساتھ (یعنی نیچے ٹوپی اور اوپر عمامہ) استعمال فرماتے تھے، بغیر ٹوپی کے صرف عمامہ اور بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی کا استعمال بھی ثابت ہے۔

علامہ ابن القیمؒ "زاد المعاد فی هدی خير العباد" میں رقم طراز ہیں:

كانت له عمامة تسمى السحاب كساها عليا فكان يلبسها و يلبس تحتها القلنسوة و كان يلبس القلنسوة بغير عمامة ويلبس العمامة بغير قلنسوة. (١/٧٠ مطبوعه محمديه)

البتہ آپ ﷺ نے عمامہ ٹوپی کے ساتھ استعمال فرمانے کی تاکید فرمائی ہے۔

اخرج ابوداؤد والترمذی والطبرانی فی الكبير عن ركانة بن عبديزيد مرفوعاً "فرق مابيننا وبين المشركين العمائم على القلانس" ولفظ رواية الترمذی "ان فرق" الخ بزيادة ان فی اوله. (الدعامة ٣٥)

البتہ اس کے بعض راوی متکلم فیہ ہیں؛ اس لیے یہ روایت ضعیف ہے۔ (كما فصله فی "الدعامة" نقلا عن الترمذی والسخاوی)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ولا بأس بلبس القلانس وقد صح انه ﷺ كان يلبسها. (٥/٣٣)

ٹوپی کی گولائی یا لمبائی کے سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں دیکھی؛ البتہ بعض ضعیف روایتوں سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی

ٹوپیاں اس طرح کی بنی ہوئی تھیں کہ سر کے ساتھ لگی چپکی رہتی تھیں۔

اخرج ابن عساکر عن عائشة قالت: کان رسول اللّٰه ﷺ یلبس قلنسوة بیضاء لاطئة. واخرج الدمیاطی عنها ایضاً قالت: کانت له کمة بیضاء بطحاء. (الدعامة ٤٠) واخرج الترمذی عن ابی کبشة الانماری قال: کانت کمام اصحاب رسول اللّٰه بطحاً ...... بطحا معناه منبطحة و غیر منتصبة ای لاصقة بالرأس غیر مرتفعة. (ایضاً ٤١)

آپ ﷺ سے سیاہ عمامہ پہننا بسند صحیح ثابت ہے، اور ابوداؤد کی ایک روایت میں زرد رنگ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ (ایضاً ۸۶، ۹۳) آپ ﷺ کا سفید عمامہ پہننا صحیح روایتوں سے ثابت نہیں ہے؛ لیکن سفید لباس کے سلسلہ میں جو قولی روایات ہیں ان کے پیشِ نظر علماء نے سفید عمامہ کو افضل بتلایا ہے۔ (ایضاً ۸۳)

عمامہ کے طول وعرض کے سلسلہ میں روایتیں درجۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہیں۔

وقال فی شرح المواهب: مانصه قال الحافظ فی فتاواه: لا یحضرنی فی طول عمامة النبی ﷺ قدر محدود. وقد سئل عنه الحافظ عبدالغنی فلم یذکر شیئا وقال السیوطی لم یثبت فی مقدارها حدیث. (ایضاً ۸۱)

وفی الفتاوی الحدیثیة لابن حجر المکی لم یثبت فی طولها وعرضها شیء الخ. (حاشیة بذل المجهود ١٦/ ٤٠٠ طبع بیروت) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۵/ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۶ھ

بگڑے ہوئے معاشرہ میں حلال وحرام میں تمیز کے بغیر ترقی ہو ہی نہیں سکتی

سوال: ہم لوگ گورنمنٹ سے روڈ بنانے کا کونٹراکٹ لیتے ہیں، جب گورنمنٹ

کو روڈ بنانے کا ہوتا ہے تو اس کی طرف سے اخبار وغیرہ میں اعلان ہوتا ہے؛ چنانچہ کونٹراکٹر حضرات اپنے اپنے حساب سے ٹینڈر بھیجتے ہیں، اس میں جس کا کم ہوتا ہے اس کے ٹنڈر کو پاس کرتے ہیں، اب اس میں جو ٹنڈر پاس کرنے والے افسران ہیں وہ ہی کام کی نوعیت طے کرتے ہیں، اور مقدارِ مالیت بھی وہی طے کرتے ہیں، اب ہوتا یہ ہے کہ افسران ہی کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ مالیت کی مقدار میں کچھ کمی ہوگی تو بھی کوئی حرج نہیں، اور کونٹراکٹر لوگوں کا کہنا ہے کہ اس قدر کمی کی وجہ سے روڈ کے کام میں بگاڑ ہوتا نہیں ہے اور افسران کی طرف سے یہ کمی کے جواز کی خاص وجہ یہ ہے کہ بچی ہوئی مقدار ان افسران اور کونٹراکٹر سب ہی میں تقسیم ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ کونٹراکٹر کا اس کمی سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے کیوں کہ اگر کام سو فی صد ہووے تو نفع زیادہ ہوتا ہے، اور کمی کی وجہ سے نفع کی مقدار کم ہوجاتی ہے، اور کام کی کمی کی وجہ سے جو حصہ کونٹراکٹر کو ملتا ہے وہ مکمل کام کی صورت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ افسران آج ہندوستان کے اندر وزیر اعظم سے گاؤں کے سرپنچ تک سب ہی اس قسم کے جمع ہوگئے ہیں کہ اگر صحیح نوعیت سے کام کیا جائے تو اس کو ٹکنے نہیں دیتے الا ماشاء اللہ سب کی اس روش کی وجہ سے مسلمان لوگ بڑے بڑے سرکاری کام میں جانے سے محروم ہیں، جو مسلمانوں کے لیے کچھ زمانے کے بعد خطرناک ثابت ہوسکتا ہے تو علماء سے گزارش ہے کہ ایسی سرکار کی وجہ سے کیا مسلمانوں کو ہندوستان کے اندر یہ حکم دیا جائے گا کہ ایسے سرکاری کام میں نہ پڑے بلکہ دال روٹی پر اکتفاء کرے یا اس کو دارالحرب یا تو کم از کم دارالاسلام نہ مان کر یہ کام کی اجازت ہوگی؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کتنے ہی مسلمان ہیں جن کے کاروبار گذشتہ وحال میں ایسے ہی چل رہے ہیں تو کیا

ان کی روزی و مال کے بارے میں حرام ہونے کا اور حلال نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

استفتاء کا مقصود حکم شرعی معلوم کر کے اس پر عمل کرنا ہوتا ہے، سوال کے اندر مذکور تفصیل سے صاف صاف مترشح ہوتا ہے کہ خود مستفتی بھی اس معاملہ کو خلاف شرع اور ناجائز سمجھ رہا ہے؛ البتہ اس کا اشکال یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی ترقی اس ملک میں نہیں ہوگی، اور مسلمان اقتصادی اعتبار سے بچھڑ جائیں گے اس کا جواب حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحبؒ کے الفاظ میں ادنیٰ تغیر کے ساتھ عرض ہے:

''مسلمانوں کو کچھ زمانہ کے بعد جن خطرناک حالات کے پیش آنے کا آپ اندیشہ ظاہر فرما رہے ہیں ان کے مقابلہ میں ان مسلمانوں کے حالات زیادہ دردانگیز تھے جن کو خطاب کر کے سود (اور خیانت اور غدر) کو حرام قرار دیا گیا، اور سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں، وہ حضرات کفار کے قرضے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کفار ان کا خون چوس رہے تھے حتی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دوبارہ غلام بنانے کی دھمکی دی گئی تھی جس سے پریشان ہو کر انھوں نے مدینہ پاک سے مخفی طور پر قرض کی ادائیگی کا انتظام ہونے تک کے لیے باہر چلے جانے کا ارادہ کر لیا تھا، وہ حضرات پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، کئی کئی روز تک فاقہ کرتے تھے، بھوک کی وجہ سے غش کھا کھا کر گر جاتے تھے، دو دو تین تین مہینہ تک گھر میں آگ نہیں سلگتی تھی، کپڑا ابھی پوری تن پوشی کے لیے موجود نہیں تھا، چادر ہے تو تہہ بند نہیں، تہہ بند ہے تو کرتہ نہیں، نکاح کے خاطر مہر میں دینے کو لوہے کی انگوٹھی تک میسر نہیں آتی ہے صرف ایک لنگی بدن پر تھی اسی میں سے آدھی لنگی مہر میں دینے پر آمادہ ہوئے، بچوں کو بھوکا روتا ہوا دیکھ کر تین چار دانے کھجور حاصل کرنے کے لیے یہود کی مزدوری کرنا پڑی، خود آں حضرت

ﷺ کو ازواج مطہرات کے نفقہ کے لیے اپنی جہاد میں کام آنے والی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھنے کی نوبت آئی، اسی حال میں آپ ﷺ کا وصال ہوا، ان حالات کے باوجود ان حضرات کو کفار کے مال ودولت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کو بھی منع فرمادیا گیا: ﴿ولا تمدن عينيك الى مامتعنا به ازواجامنهم زهرة الحيوة الدنيا لنفتنهم فيه ورزق ربك خير وابقى ﴾ (طه) اور ہرگز آنکھ اٹھا کر بھی آپ ان چیزوں کی طرف نہ دیکھیں جن سے ہم نے ان (دنیاداروں) کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے متمتع رکھا ہے کہ وہ سب کچھ محض دنیوی زندگی کی رونق ہے، اور آپ کے رب کا عطیہ اس سے بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے۔ نیز ارشاد ہوا: ﴿ولو لاان يكون النا س امة واحدة لجعلنا لمن يكفر بالرحمن لبيوتهم سقفامن فضة ومعارج عليها يظهرون ولبيوتهم ابوابا وسررا عليها يتكئون وزخرفا وان كل ذلك لمامتاع الحيوة الدنيا والآخرة عند ربك للمتقين﴾ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام آدمی ایک ہی طریقے کے ہوجائیں تو جو خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کے لیے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کردیتے اور زینے بھی جن پر چڑھا کرتے، اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں، اور سونے کے بھی اور یہ سب کچھ بھی نہیں، صرف دنیوی زندگی کی چندروزہ کامرانی ہے اور آخرت آپ کے پروردگار کے ان خداترسوں کے لیے ہے۔ (زخرف)

مال میں کفار کی حرص کو قرآن پاک نے منع فرمایا ہے مگر اسی کو آج مسلمان بار بار للچائی نظریں اٹھا کر دیکھتا ہے اور انھی کی روش پر چلتا ہے یا چلنے کے لیے راستے تلاش کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بھی اسی منزل پر پہنچے گا جس منزل پر وہ پہنچے ...... مسلمان کی کامیابی اور ترقی حلال اور حرام کی تمیز کے بغیر مال جمع کرنے اور تجارت کو فروغ دینے میں

ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کی ترقی اور کامیابی احکام شریعت کی پابندی میں ہے، حرام اور لعنت کے کاموں سے پوری طرح پرہیز کرنے میں ہے۔ جب عام معاشرہ بگڑ چکا ہو غیر قومیں حرام مال سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں تو علماء کا یہ کام نہیں کہ مسلمانوں کے لیے یہ بھی جواز کی راہ نکال کر ان غیر قوموں کے اتباع کا فتوی دیں بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ رضائے خداوندی اور ابدی انعامات کا پورا نقشہ قوم کے سامنے اخلاص وقوت کے ساتھ پیش کریں متعین طور پر بلا کسی تذبذب کے حکم خداوندی سنائیں: ”هذا صراطی مستقیما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل“ یہ میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو۔ ”ولا تتبعوا خطوات الشیطان“ شیطان کے نقش قدم پر مت چلو۔

اگر بگڑے ہوئے معاشرہ اور دیگر اقوام کی ترقیات سے متاثر ہو کر مسلمان کے لیے حرام کی راہیں کھول دیں تو اس کا انجام بہت خطرناک ہے۔ علماء بنی سرائل نے اول قوم کو معاصی سے روکا، وہ نہیں رکی تو روکنا چھوڑ دیا، اور معاشرہ میں قوم کے ساتھ شریک ہوگئے تو سب پر لعنت کی گئی۔

عن عبداللّٰه بن مسعود قال قال رسول اللّٰه ﷺ لما وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نهتهم علمائهم فلم ینتهوا، فجالسو هم فی مجالسهم وآکلو هم وشاربوهم، فضرب اللّٰه قلوب بعضهم ببعض فلعنهم علی لسان داود وعیسی ابن مریم، ذلك بما عصوا وكانو یعتدون، قال فجلس رسول اللّٰه ﷺ وکان متكئاً فقال لا والذی نفسی بیده حتی تاطروهم اطرا. رواه الترمذی وابو داود وفی روایة قال كلا واللّٰه لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر ولتاخذن علی یَدَي الظالم ولتاطرنه علی الحق اطرا ولتقصرنه علی الحق قصراً او لیضربن اللّٰه

بقلوب بعضکم علی بعض ثم لَيَلْعَنَنَّكم كما لعنهم. اھ. (مشکوٰۃ ص ۴۳۸)

حرام کا دروازہ کھول دینے پر کیا کیا لعنت نازل ہوگی، اگر طبقہ وارانہ کشاکش اور تباغض وتحاسد پیدا ہو تو اس سے بچانے کی یہ صورت نہیں کہ حرام کا دروازہ کھول دیا جائے بلکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ نصوص قرآنی واحادیث نبوی کی زیادہ سے زیادہ تلقین کی جائے۔ اگر موسم خراب ہے اور امرود سے ہیضہ پھیلنے کا اندیشہ ہو تو حفظانِ صحت کے ماہرین حدود میونسپلٹی میں بھی امرود کا داخل ہونا بند کرادیتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ بندر اور گدھے امرود کھا رہے ہیں اور ان کو کس وجہ سے ہیضہ نہیں ہوتا کہ ان کی حرص میں انسانوں کو بھی اجازت دی جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۲۰۹ تا ۲۱۸ ملخصاً)

جو مسلمان ناجائز کاروبار کرتے ہیں ان کے مال اور کمائی کے حرام ہونے میں کیا شبہ ہے؟ حرام ذرائع آمدنی اختیار کرنے والوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے ان کی کمائی حلال نہیں ہوجاتی، شریعت نے جس چیز کو حرام بتلایا ہے وہ حرام ہی رہے گی چاہے اس میں لگنے والوں کی تعداد بڑی کیوں نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ. العبد احمد خانپوری

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ ۸/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۸ھ

بن بلائے دعوت میں شرکت

سوال: ہمارے ایک عزیز بن بلائے شادی کی دعوتوں میں شرکت کرتے ہیں ایسے بڑے گھرانے کی شادیوں میں جہاں کھانا کم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میزبان کی رسوائی ہو، ان کا کہنا ہے کہ یہ اسلامی گناہ نہیں بلکہ سماجی واخلاقی بدتمیزی ہے اور خداتعالیٰ اس طرح کی بدتمیزی پر پرسش نہیں کریں گے کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حدیث شریف میں ایک واقعہ ہے کہ ایک انصاری صحابی جن کی کنیت ابوشعیب تھی، انھوں نے اپنے ایک گوشت کا کاروبار کرنے والے غلام سے کہا کہ تم میرے لیے پانچ آدمیوں کے لیے کھانا تیار کرو میں نبی کریم ﷺ کو دعوت دینا چاہتا ہوں؛ چنانچہ وہ کھانا تیار کیا گیا پھر وہ صحابی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو دعوت پیش کی اس موقع پر ایک آدمی (جس کو دعوت نہیں دی گئی تھی) ان حضرات کے ساتھ ہولیا اس پر نبی کریم ﷺ نے دعوت دینے والے صحابی سے فرمایا کہ اے ابوشعیب ایک آدمی (مزید بغیر دعوت) ہمارے ساتھ آ گیا ہے تم چاہو تو اس کو اجازت دو، اور اگر چاہو تو چھوڑ دو (یعنی اجازت نہ دو) اس پر حضرت ابوشعیب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں ان کو اجازت دیتا ہوں۔ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ:۲۷۸)

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مشکوٰۃ کے مشہور شارح ملا علی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں: "هذا تصريح منه ﷺ انه لا يجوز لاحد ان يدخل دار غيره الا باذنه، ولا للضيف ان يدعو أحدا بغير اذن المضيف، قال النووی: ويستحب للضيف ان يستأذن له ...... الخ (مرقاة ٦ / ٢٥٤)

یعنی آپ ﷺ کا ان صحابی سے اس آدمی کے لیے اجازت طلب کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر دعوت میں شریک ہو، اور خود مہمان کے لیے بھی درست نہیں کہ میزبان کی اجازت کے بغیر کسی کو اپنے ساتھ لے......الخ۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے وہ عزیز جو شادی کی دعوتوں میں بن بلائے شریک ہوجاتے ہیں ان کا یہ عمل درست نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں سنن ابو داود کے حوالہ سے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت منقول ہے کہ جو آدمی کسی کے یہاں دعوت میں بغیر بلائے گیا تو چور بن کر داخل ہوا اور لٹیرا بن کر نکلا۔ (مشکوٰۃ ۲۷۸)

اس لیے آپ کے اس عزیز کا اپنے اس عمل کو گناہ نہ سمجھنا درست نہیں، ان کو چاہیے کہ آئندہ ایسی حرکت سے باز رہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　　　املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

منی گروٹرس اسکیم یعنی سوال کا مہذب طریقہ

محترم جناب مفتی احمد صاحب زاداللہ علمکم و فضلکم و عمرکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہ خداوند قدوس سے امید ہے کہ مزاج بعافیت ہوں گے خدمت عالیہ میں ''منی گروٹرس'' نام کا رسالہ کتابچہ ارسال کیا ہے جو منی گوارس نام کی اسکیم کی ترجمانی کر رہا ہے، منی گوارس کا ترجمہ پیسوں کی بڑھوتری۔ اسکیم کی پوری تفصیلی معلومات وترتیب کتابچہ میں موجود ہے، اس سکیم سے فائدہ حاصل کرنے نہ کرنے کے بارے میں علماء دین ومفتیان کرام کیا فرماتے ہیں امید ہے کہ اسلام کے عمومی مزاج یسر وسہولت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جواب عنایت فرمائیں گے۔ اگر جواب مع دلائل عنایت فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو مال کے حصول کے ذرائع اور اسباب کے معاملہ میں آزاد نہیں چھوڑا، بلکہ اس سلسلہ میں بھی واضح ہدایات عطا فرما کر حصول مال کے بعض ذرائع کو ممنوع اور بعض کو مباح قرار دیا۔ شریعت کے منع فرمودہ طریقوں سے حاصل

شدہ مال کو حرام، اور شریعت کے مباح فرمودہ طریقوں سے حاصل شدہ مال کو حلال بتلایا ہے۔ ایک مومن و مسلم کو بحیثیت مومن اس کا پابند بنایا کہ وہ اپنی کمائی کے لیے حلال ہی کو طلب فرمائے ارشادِ نبوی (ﷺ) ہے:

(۱) طلب کسب الحلال فریضۃ بعدالفریضۃ. (مشکوٰۃ ص۲۴۲) یعنی حلال کمائی کی طلب بھی ایک فریضہ ہے۔

(۲) ان اللّٰہ طیب لا یقبل الا طیبا وان اللّٰہ امر المؤمنین بما امر بہ المرسلین فقال: ﴿یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا﴾ وقال تعالیٰ: ﴿یاایھا الذین اٰمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم﴾ ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ الی السماء یا رب یا رب ومطعمہ حرام ومشربہ حرام وملبسہ حرام وغذی بالحرام فانی یستجاب لذلک. (مشکوٰۃ ۲۴۱)

(یعنی اللہ تعالیٰ تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہے اور ایسے مال کو قبول فرماتا ہے جو (تمام عیوب شرعیہ اور اغراض فاسدہ سے) پاک ہو اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اسی بات کا حکم دیا جو رسولوں کو دیا چناں چہ فرمایا اے رسولو! حلال و پاکیزہ کھاؤ اور نیک عمل کرو اور فرمایا اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو حلال و پاکیزہ روزی عطا فرمائی ہے وہ کھاؤ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی طویل سفر (حج یا عمرہ یا جہاد یا طلب علم میں) کرتا ہے پراگندہ حال، غبار آلود، اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلاتا ہے (اور کہتا ہے) اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار! حالاں کہ اس کا کھانا حرام اور پینا حرام اور لباس حرام اور حرام غذا سے وہ پلا ہے بھلا اس کی دعاء کیسے قبول ہوگی؟)

اس روایت میں جہاں حلال کی ترغیب و تاکید فرمائی گئی ہے وہیں یہ بھی بتلا دیا

گیا کہ حرام مال سے کیا ہوا صدقہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہے۔

لا یکسب عبد مال حرام فیتصدق منه فیقبل منه و لا ینفق منه فیبارك له فیه و لا یترکه خلف ظهره الا کان زاده الی النار. (مشکوٰۃ ۲۴۲) یعنی کوئی بندہ مال حرام کما کر صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا اور اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی اور اپنے پیچھے (وراثت) چھوڑ کر جاتا ہے تو اس کے لیے جہنم کا توشہ بنتا ہے)۔

حرام مال سے پلا ہوا جسم جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ وہ جہنم کا حق دار ہے۔ لا یدخل الجنة جسد غذی بالحرام. (مشکوٰۃ ۲۴۳) لا یدخل الجنة لحم نبت من السحت و کل لحم نبت من السحت کانت النار اولی به. (مشکوٰۃ ۲۴۲)

حرام پیسوں سے خرید کر تیار کیا ہوا لباس جب تک جسم پر ہے اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔ من اشتریٰ ثوبا بالعشرة دراهم و فیه درهم حرام لم یقبل اللّٰه تعالیٰ له صلوٰة مادام علیه. (۲۴۳)

تحصیل مال کے جن طریقوں کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ان میں سے ایک سوال بھی ہے۔

قال دعانی رسول اللّٰه ﷺ وهو یشترط علیّ ان لا تسأل الناس شیئا، قلت: نعم. (مشکوٰۃ ۱۶۴) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے (بیعت کے لیے) بلایا اور آپ نے مجھ پر یہ شرط عائد فرمائی کہ لوگوں سے کچھ بھی نہ مانگ، میں نے اس کو قبول کیا۔

(۲) من اصابته فاقة فانزلها بالناس لم تسد فاقته و من انزلها باللّٰه او شك اللّٰه له بالغنی الخ (۱۶۳) یعنی جس کو فاقہ پہنچا اور اس نے اپنا فاقہ لوگوں کے

سامنے پیش کیا تو اس کا فاقہ بند نہ ہوگا اور جو اپنے فاقہ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جلدی سے غنا سے نوازتا ہے۔

(۳) مایزال الرجل یسأل الناس حتی یأتی یوم القیامة لیس فی وجهه مزعة لحم. (۱٦٢) یعنی آدمی لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے روز ایسے حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی یعنی چہرہ کی رونق ختم ہو چکی ہوگی۔

(۴) عن قبیصة بن مخارق قال: تحملت حمالة فاتیت رسول اللّٰه ﷺ اسئله فیها فقال: اقم حتی تاتینا الصدقة فنامر لك بها ثم قال: یا قبیصة ان المسئلة لاتحل الا لاحد ثلاثة .... فما سواهن من المسئلة یا قبیصة سحت یاکلها صاحبها سحتا. (۱٦٢) یعنی حضرت قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بوجھ (تاوان وغیرہ) کا اپنے ذمہ رکھ لیا، اس سلسلہ میں میں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں مدد چاہنے کے لیے حاضر ہوا حضور ﷺ نے فرمایا ٹھہر جاؤ کہیں سے صدقہ کا مال آجائے گا تو میں مدد کروں گا، پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ قبیصہ سوال صرف تین آدمیوں کے لیے جائز ہے، ایک وہ شخص ہے جس نے کوئی بوجھ ضمان وغیرہ کا اپنے ذمہ رکھ لیا ہو اس کو جائز ہے کہ اتنی مقدار کا سوال کر لے اور پھر رک جائے اس سے زیادہ کے سوال کا حق نہیں۔ دوسرا وہ شخص جس کو کوئی حادثہ پہنچ جائے جس سے سارا مال ہلاک ہو جائے (مثلاً آگ لگ جائے وغیرہ) تو اس کو جائز ہے کہ اتنی مقدار کا سوال کر لے جس سے زندگی کا سہارا ہو سکے۔ تیسرا وہ شخص ہے جس کو فاقہ گزرنے لگے حتی کہ تین آدمی اس کی قوم کے کہنے لگیں کہ اس کو فاقہ ہونے لگا تو اس کو بھی اتنی مقدار سوال کر لینا

جائز ہے جس سے زندگی کا سہارا ہو جائے۔ ان تین کے علاوہ جو شخص سوال کرتا ہے وہ حرام مال کھاتا ہے۔

(۵) من سأل الناس اموالهم تكثرا فانما يسئل جمرا فليستقل او ليستكثر (۱٦٢) جو شخص لوگوں سے اس لیے سوال کرتا ہے کہ اپنے مال میں زیادتی کرے وہ جہنم کے انگارے مانگ رہا ہے جس کا دل چاہے تھوڑے مانگ لے یا زیادہ مانگ لے۔

(٦) لان یاخذ احدکم حبله فیاتی بحُزْمة حطب علی ظهره فیبیعها فیکف بها وجهه خیر له من ان یسال الناس اعطوه او منعوه. (۱٦٢) یعنی کوئی آدمی رسالے کر لکڑیوں کا گٹھڑ اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لائے اور اس کو بیچ کر اپنی عزت کی حفاظت کرے (یعنی لوگوں سے سوال کرنے سے اپنے کو بچائے) یہ اس کے لیے اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ لوگوں سے سوال کرے (پھر ان کی مرضی کی بات ہے چاہیں) اس کو دیں یا نہ دیں۔

(۷) فما جاءك من هذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذهٗ وما لا فلاتتبعه نفسك. (۱٦٢) یعنی جب کوئی مال اس طرح آئے کہ نہ اس کا سوال کیا جائے نہ اس میں اشراف نفس ہو تو اس کو لے لو اور جو ایسا نہ ہو اس کے حصول میں اپنی جان کو مت تھکاؤ۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے صاحب زادے عبداللہؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ اشرافِ نفس کیا چیز ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تو اپنے دل میں یہ خیال کرے کہ یہ شخص مجھے کچھ دے گا، فلاں شخص مجھے کچھ بھیجے گا، اشراف کے اصل معنی جھانکنے کے ہیں، اشرافِ نفس یہ ہے کہ نفس اس کو جھانک رہا ہو اس کی تاک میں لگا ہوا ہو، جیسا کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ دل میں یہ خیال ہو کہ یہ مجھے کچھ عطا کرے گا۔

تفصیل بالا ذہن نشین ہونے کے بعد آپ نے ''منی گروٹرس'' کی جس اسکیم

کے متعلق دریافت فرمایا ہے اس کی حقیقت بھی صاف ہوجاتی ہے اس پوری اسکیم کی بنیاد سوال پر ہے، یوں سمجھیے کہ سوال کے لیے ایک مہذب طریقہ گھڑ لیا گیا ہے، اگرچہ تعارفی کتابچہ میں اس کو ہدیہ کے لین دین سے تعبیر کیا گیا ہے؛ لیکن یہ محض ایک فریب ہے، بالفرض اس کو ہدیہ تسلیم بھی کرلیں تو شریعت نے اس ہدیہ کی بھی اجازت نہیں دی جس میں سوال اور اشراف ہو۔ (دیکھیے حدیث نمبر۷) نیز ہدیہ میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہدیہ دینے والا حرام مال میں سے تو ہدیہ نہیں دے رہا ہے؟ مسئولہ اسکیم میں یہ کون دیکھتا ہے؟ شریعت نے حرام مال سے دیے جانے والے ہدیہ کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، کتب فقہ وفتاویٰ میں اس کی صراحت موجود ہے، مسلمانوں کو چاہیے (خصوصاً اہل علم کو) کہ ایسے فریب کا شکار نہ ہوں آدمی مال کی لالچ میں ایسی اسکیموں کا شکار ہوجاتا ہے۔

حضور اقدس ﷺ نے اپنی امت کو اس سے ڈرایا ہے: يأتي على الناس زمان لايبالي المرأ ماأخذ منه أمن الحلال ام من الحرام. (۲٤۱) لوگوں پر ایسا وقت آنے والا ہے کہ آدمی جو لے رہا ہے اس میں اس کی پرواہ نہیں کرے گا کہ حلال سے ہے یا حرام سے ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری
۳/ربیع الاول ۱۴۱٦ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ
الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

سنت وبدعت کے مابین فرق کا جامع ضابطہ

سوال: نکاح کے بعد عام طور پر علماء ومشائخ اردو میں دعا کرواتے ہیں، ایک آدمی یہ کہہ رہا ہے کہ نکاح کے بعد "بارك اللّٰه لك وبارك الله عليك وجمع بينكما في خير" یہی دعا مانگ سکتے ہیں اس کے علاوہ بعد میں جو اردو میں دعا کرواتے ہیں وہ سنت

سے ثابت نہیں ہے، اور جو چیز سنت سے ثابت نہ ہو وہ بدعت ہے اور یہ دعا کروانا گویا بدعت، گمراہی اور منکر ہے اور یہ علی الاعلان منکر ہو رہا ہے؛ لہٰذا اس منکر کو علی الاعلان روکنا چاہیے۔ رہا علما و مشائخ کا دعا کروانا یہ جواز کے لیے حجت نہیں ہے جبکہ ان کا عمل قرآن وسنت کے خلاف ہو تو ان کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے اور یہ دعا کروانا بدعت، گمراہی اور منکر ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بوقتِ نکاح دعا اور مبارک بادی کا سلسلہ ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں چلا آ رہا ہے؛ البتہ اس کے لیے مختلف کلمات استعمال کیے جاتے تھے، زمانۂ جاہلیت میں عام طور پر نکاح کے وقت دی جانے والی دعاء میں یہ الفاظ "بالرفاء والبنين" استعمال ہوتے تھے جس کا ترجمہ ہوتا ہے کہ اس نکاح میں دونوں میں جوڑ اور محبت ہو اور لڑکے پیدا ہوں، نبیٔ کریم ﷺ نے زمانۂ جاہلیت میں دعاء کے لیے عام طور پر جو الفاظ استعمال ہوتے تھے ان سے ممانعت فرما کر ان کے بجائے "بارك الله لك (كما فى البخارى) يا بارك الله لك وبارك عليك وجمع بينكما فى خير" (كما فى السنن) کے الفاظ استعمال فرمائے۔

دعا کے الفاظ میں آنحضرت ﷺ نے جو تبدیلی فرمائی اس کی حکمت اور علت پر کلام کرتے ہوئے شراحِ بخاری نے لکھا ہے کہ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں استعمال کیے جانے والے الفاظ میں نہ تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء تھی، اور نہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ تھا؛ اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس سے ممانعت فرمائی۔ اور ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی دعا میں صرف لڑکوں کا تذکرہ ہے، جس سے لڑکیوں سے نفرت اور ان کی ناپسندیدگی ظاہر ہوتی ہے، اور اس طرح زمانۂ جاہلیت کے ایک غلط نظریہ کی تائید ہو رہی تھی؛ اس لیے نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ سے ممانعت فرما کر دعاء کے طور پر یہ کلمات مشروع فرمائے۔

بخاری شریف میں کتاب النکاح میں امام بخاریؒ نے باب قائم فرمایا ہے "باب کیف یدعی للمتزوج" اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری شرح بخاری میں شارح بخاری علامہ ابن بطالؒ کا قول نقل فرمایا ہے: انما أراد بهذا الباب والله أعلم رد قول العامة عند العرس با لرفاء والبنين فكأنه اشار الى تضعيفه.

آگے تحریر فرماتے ہیں: وأقوى من ذلك ما أخرجه اصحاب السنن وصححه الترمذى وابن حبان والحاكم من طريق سهيل ابن ابى صالح عن ابيه عن ابي هريرة قال كان رسول الله ﷺ اذا رفأ انساناً قال: بارك الله لك وبارك عليك وجمع بينكما فى خير وقوله (رفأ) بفتح الراء وتشديد الفاء مهموز معناه دعا له فى موضع قولهم بالرفاء والبنين وكانت كلمة تقولها أهل الجاهلية، فورد النهى عنها، كما روى بقى بن مخلد من طريق غالب عن الحسن عن رجل من بني تميم، قال كنا نقول فى الجاهلية بالرفاء والبنين، فلما جاء الاسلام علمنا نبينا قال: قولوا بارك الله لكم وبارك فيكم وبارك عليكم. واخرج النسائى والطبرانى من طريق اخر ى عن الحسن عن عقيل بن ابى طالب انه قدم البصرة فتزوج امرأة فقالوا له: بالرفاء والبنين فقال: لاتقولوا هكذا وقولوا كما قال رسول الله ﷺ: اللهم بارك لهم وبارك عليهم. ورجاله ثقات الا ان الحسن لم يسمع من عقيل فيمايقال ودل حديث ابى هريرة على أن اللفظ كان مشهوراً عندهم غالباً حتى سمى كل دعاء للمتزوج ترفئة، واختلف فى علة النهى عن ذلك فقيل لأنه لا حمد فيه ولا ثناء ولا ذكر لله، وقيل لما فيه من الإشارة الى بغض البنات لتخصيص البنين با لذكر. (فتح الباری ۲۲۱/۹، ۲۲۲)

علامہ عینیؒ شرح بخاری میں فرماتے ہیں: وهذه اللفظة ترد القول بالرفاء والبنين لانه من أقوال الجاهلية والنبى ﷺ كان يكره ذلك لموافقتهم فيه وهذا هو الحكمة فى النهى، وقيل لأنه لا حمد فيه ولا ثناء ولا ذكر لله عز وجل، وقيل لمافيه من الإشارة الى بغض البنات لتخصيص البنين بالذكر (عمدة القارى شرح بخارى ٢٠/١٤٦)

مجمع بحار الانوار میں ہے (رفأ)نه: نهى أن يقال "بالرفاء"والبنين، كراهية لعادتهم ولذا سن غيره،الرفاء الإلتيام والاتفاق والبركة والنماء، من رفأت الثوب رفاءً ورفوته رفواومنه: كان اذا "رفّأ" قال: بارك الله لك وعليك وجمع بينكما على خيرٍ، ويهمز الفعل ولايهمز. ط:الترفية قوله بالرفاء والبنين وبدله الشارع بما ذكره لأنه لا يفيد ولما فيه من التنفير عن البنات. (مجمع بحار الانوار ٢/٣٤٨)

منقولہ بالا تمام عبارتوں سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے زمانۂ جاہلیت میں بوقتِ نکاح دی جانے والی دعاء کے مخصوص کلمات سے ممانعت فرما کر اس کی جگہ پر دوسرے کلمات بطورِ دعا استعمال فرما کر ان کلمات سے دعاء دینے کی ترغیب ارشاد فرمائی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بوقتِ نکاح دی جانے والی دعاء میں جو کلمات تلقین فرمائے، کیا انہی کلمات سے دعاء کرنا ضروری ہے؟ یا ان کے علاوہ دیگر کلمات بھی دعاء کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں؟ تو حضرات شراح حدیث نے زمانۂ جاہلیت میں استعمال ہونے والے کلماتِ دعاء کی ممانعت کی جو وجہ تحریر فرمائی ہے اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حدیث پاک میں وارد کلمات دعا پر ہی اکتفاء کرنا ضروری نہیں بلکہ ان کے ساتھ دیگر ایسے کلمات دعاء کا اضافہ جو موقع اور محل کے مناسب

ہوں جائز اور درست ہے۔ چنانچہ علامہ عینیؒ بالرفاء والبنین والے کلمات کی وجہ ممانعت پر کلام (جو آگے نقل کیا جا چکا) کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں. قلت فعلى هذا اذا قيل بالرفاء والأولاد ينبغي أن لا يكره. (عینی شرح بخاری: ۲۰/ ۱۴۶) یعنی اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی دعاء دینے والا بالرفاء والاولاد کے الفاظ سے دعا دے تو ممنوع نہیں ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ ان الفاظ سے دعاء دینے میں زمانۂ جاہلیت کے نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ابن المنیرؒ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں. یہ بات صاف ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ (بالرفاء والبنین) کو ناپسند فرمایا؛ اس لیے کہ اس میں زمانۂ جاہلیت کی موافقت ہے؛ اس لیے کہ وہ لوگ ان کلمات کو بطور تفاؤل کہتے تھے بطور دعاء نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ کلمات بطور دعاء کہے جائیں تو ممنوع نہیں بایں طور کہ مثلاً یوں کہے: "اللّٰهم الف بينهما وارزقهما بنين صالحين يا الف اللّٰه بينكما ورزقكما ولداً ذكراً" یا اس جیسے الفاظ۔

فتح الباری کی اصل عبارت ملاحظہ ہو وقال ابن المنيرؒ الذي يظهر أنه ﷺ كره اللفظ لما فيه من موافقة الجاهلية لأنهم كانوا يقولونه تفاؤلًا لا دعاءً، فيظهر أنه لو قيل للمتزوج بصورة الدعاء لم يكره، كأن يقول: اللّٰهم الف بينهما وارزقهما بنين صالحين مثلاً، او الّف اللّٰه بينكما ورزقكما ولداً ذكراً ونحو ذلك. (فتح الباری: ۲۲۲/۹)

لیجئے علامہ ابن المنیرؒ تو صرف لڑکوں کی دعاء کو بھی جائز بتلا رہے ہیں، بلکہ بعض ضعیف روایتوں میں خود نبی کریم ﷺ سے بھی بارك اللّٰه الخ والے کلمات کے علاوہ دیگر

کلمات سے دعاء دینا منقول ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ شرح بخاری میں تحریر فرماتے ہیں: کحديث معاذ بن جبل أنه شهد املاك رجل من الأنصار فخطب رسول الله ﷺ وأنكح الأنصاری وقال علی الألفة والخير والبركة والطير الميمون والسعة فی الرزق الحديث أخرجه الطبرانی فی الكبير بسند ضعيف (فتح الباری: ۲۲۲/۹) **یعنی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک انصاری صحابی کے نکاح میں شریک ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے خطبہ پڑھا اور انصاری کا نکاح پڑھایا اور یہ دعاء پڑھی** علی الألفة والخير والبركة والطير الميمون والسعة فی الرزق **یعنی اللہ تعالیٰ دونوں کے درمیان محبت پیدا فرمائے خیر و برکت عطا فرمائے اور عمدہ نصیبہ سے نوازے اور روزی میں برکت دے۔ اور جمہور علماء (محدثین وفقہاء) کا فضائلِ اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے پر اتفاق ہے۔**

علامہ نوویؒ اپنی کتاب الأربعین میں فرماتے ہیں: قد اتفق العلماء علی جواز العمل بالحديث الضعيف فی فضائل الاعمال. (الأربعين: ۳۲ منقول از التحفة المطلوبه: ۶۱)

اور علامہ نوویؒ ہی اپنی مشہور کتاب الاذکار میں جواز ہی نہیں بلکہ استحباب کی تصریح فرماتے ہیں: قال العلماء من المحدثين والفقهاء وغيرهم يجوز ويستحب العمل فی الفضائل والترغيب والترهيب بالحديث الضعيف ما لم يكن موضوعاً. (كتاب الأذكار: ۷)

علامہ سخاویؒ حدیث ضعیف پر عمل کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے قول مختار ان الفاظ کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں۔ ثالثها هو الذی عليه الجمهور يعمل به فی

الفضائل دون الأحكام الخ (القول البديع فى الصلاة على الحبيب الشفيع: ٢٤٦)

ان ساری تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بوقت نکاح حدیث پاک میں وارد دعاء کے علاوہ دوسری ایسی دعائیں جو موقع اور محل کے مناسب ہوں بڑھانے میں کوئی حرج نہیں؛ چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو نبی کریم ﷺ کی لاڈلی صاحبزادی ہیں ان کے نکاح کے موقع پر خود نبی کریم ﷺ نے جو کلمات دعاء کے استعمال فرمائے وہ ان مشہور کلمات کے علاوہ ہیں جو نبی کریم ﷺ سے عام طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ملا علی قاریؒ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کا واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے تفصیل سے نقل فرمایا ہے اور اخیر میں نکاح ہو چکنے کے بعد نبی کریم ﷺ کے حسبِ ذیل دعائیہ کلمات نقل فرمائے ہیں: جمع الله شملكما وأسعد جدكما وبارك عليكما وأخرج منكما كثيراً طيباً. (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ: ۱۱/ ۳۵۰) حضرت نواب قطب الدین صاحب دہلویؒ نے بھی مظاہرِ حق شرح مشکوٰۃ میں یہ روایت نقل فرمائی ہے ملاحظہ ہو: تتمۂ مظاہر حق: ۴/ ۱۲۸۔

چنانچہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ جن کی ساری زندگیاں سنتِ مطہرہ کی ترویج واشاعت اور بدعات اور رسم ورواج کے قلع قمع میں گزریں، ان کا عمل بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے، میں نے خود حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ، فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ اور سابق مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ وغیرہ حضرات اکابر کو حدیث پاک میں وارد الفاظِ دعاء کے ساتھ دیگر دعائیہ کلمات کا اضافہ کرتے ہوئے سنا اور دیکھا ہے؛ حالانکہ

ان میں سے بعض حضرات وہ ہیں جو بدعات اور رسم ورواج کے معاملہ میں بڑے متشدد رہے ہیں ان کا عمل بطورِ نمونہ اس لیے نہیں پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کو حجتِ شرعیہ قرار دیا جا رہا ہے؛ اس لیے کہ اہلِ اصول کی تصریح کے مطابق حجج شرعیہ تو چار ہی ہیں البتہ ان حضرات اکابر کا عمل سنت کی تشریح اور توضیح بن سکتا ہے۔

تنبیہ: (۱) کسی موقع پر کوئی حکمِ شرعی عام انداز میں موجود ہو اور کوئی شخص اصولی طور پر اس کو بنیاد بنا کر اس پر عمل کرے بلکہ اس کی سنیت کا قائل ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے، نماز عید یا خطبہ کے بعد دعاء کے سلسلہ میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں حضرت حکیم الامتؒ تحریر فرماتے ہیں ''واقعی بعد نماز عید یا خطبہ دعاء مانگنا بالخصوص منقول تو نہیں دیکھا گیا اور دعوٰی تعمم سے استدلال نا تمام ہے......... لیکن بالخصوص منقول نہ ہونے سے حکم ابتداع کا بھی مشکل ہے کیونکہ عموماتِ نصوص سے فضیلتِ دعاء بعد الصلاۃ کی ثابت ہے پس اس عموم میں اس کے داخل ہونے کی گنجائش ہے اور اگر کوئی شخص بالخصوص منقول نہ ہونے کے سبب اس کو ترک کرے اس پر بھی ملامت نہیں۔ (امداد الفتاوی:۱/۶۰۳،۶۰۴)

اس کے بعد ایک اور سوال جواب امداد الفتاوی میں حسبِ ذیل ہے اس کو بھی ملاحظہ فرمالیں:

سوال: بعد نمازِ عیدین کے یا بعد خطبہ کے دعاء مانگنا نبی ﷺ اور ان کے صحابہ اور تابعین اور تبعِ تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول نہیں، اور اگر ان حضرات نے کبھی دعاء مانگی ہوتی تو ضرور نقل کی جاتی لہذا بغرض اتباع دعا نہ مانگنا دعاء مانگنے سے بہتر ہے۔ انتہی .ھکذا فی بہشتی گوہر۔ اور الرشید جمادی الأولی: ۳۱۔۱۳۳۴ھ تحت فتاوی دار العلوم دیوبند میں لکھا ہے۔ اور دعا مانگنا بعد نماز عیدین کے مثل تمام نمازوں کے مستحب ہے لعموم الأدلة. انتهى ما

التوفیق فیما بینھما.

الجواب: اول میں نفی نقل جزئی کی ہے، ثانی میں اثبات کلی سے ہے، فلا تعارض۔ لیکن راجح میرے خیال میں ثانی معلوم ہوتا ہے: وھو المعمول لی وإن کنت نقلت الاول من علم الفقه والامر واسع و لعل موافقة الجمھور اولی. (ترجیح رابع: ۸۱)

(امداد الفتاوی: ۱/۶۰۴)

دیکھئے نماز عید کے بعد کی دعاء کے سلسلہ میں کوئی صریح نقل نبی کریم ﷺ اور صحابہ وتابعین سے نہ ہونے کے باوجود ہمارے اکابر اس دعاء کو سنت تحریر فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی ۳/ ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۳، ۳۰۴۔ امداد الاحکام ۱/ ۶۵۱، ۶۵۴۔ فتاوی دار العلوم ۵/ ۲۰۲، ۲۱۳، ۲۲۵، ۲۳۱۔ فتاوی محمودیہ قدیم ۷/ ۲۱۸، ۲/ ۲۶۱، ۲۹۵، ۳۰۷، ۳۱۱، ۱۶/ ۵۴۰۔ خیر الفتاوی ۳/ ۱۲۷، ۱۲۸۔ آپ کے مسائل اور ان کا حل ۲/ ۴۱۷۔ امداد الفتاوی ۱/ ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۷۔ احسن الفتاوی ۴/ ۱۱۵۔ فتاوی سنگرہ (گجراتی) ۳/ ۱۰۳، ۱۰۴۔ امداد المفتیین ۴۰۸۔ عزیز الفتاوی ۳۰۱، ۳۰۷۔ فتاوی رحیمیہ ۳/ ۷۵۔ ۸/ ۱۰۵)

نیز فرض نمازوں کے بعد مطلقاً دعاء ثابت ہے؛ اس لیے اس کو تمام ہی حضرات سنت یا مستحب قرار دیتے ہیں، اور اس وقت جن کلمات سے دعاء مانگی جاتی ہے ان میں صرف انہی کلمات کو جو بالخصوص نبی کریم ﷺ سے اس موقع پر منقول ہیں ضروری قرار نہیں دیا جاتا بلکہ ان کے علاوہ دیگر مأثور دعاؤں کے مانگنے کو بھی سنت ہی سمجھا جاتا ہے، جو صاحب نکاح کے بعد دوسری دعا مانگنے کو بدعت اور گمراہی قرار دے رہے ہیں ان کو چاہیے کہ سنت اور بدعت کے موضوع پر جو کلام ہمارے اکابر نے کیا ہے اس کو بغور پڑھ لیں۔

تنبیہ: (۲) سنت و بدعت کی حقیقت اور اس کی تعریف وغیرہ کے سلسلہ میں جو تفصیلی کلام علمائے کرام نے کیا ہے اس کو بھی اس موقع پر پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے

اس سلسلہ میں فتاوی محمودیہ کی ایک عبارت اور اس کے بعد براہینِ قاطعہ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

فتاوی محمودیہ میں ہے ''اس باب (بدعت) میں طریقۂ محمدیہ اور اس کی شروح ''الحدیقة الندیة'' و''الدرر البریقة'' اور ''المدخل'' اور ''الإعتصام'' مبسوط کتابیں ہیں جن میں بدعات پر تفصیلی بحث کی ہے اور بدعات پر کافی رد کیا ہے، اور محققانہ دلائل پیش کیے ہیں؛ نیز اردو میں براہینِ قاطعہ لاجواب ہے جس میں بدعات کا قلع قمع کیا ہے اور ایسے زریں اصول وضوابط بیان کیے ہیں کہ جن پر امورِ محدثہ کو بسہولت منطبق کیا جا سکتا ہے کہ یہ بدعات محرمہ ضالہ کی حدود میں داخل ہیں یا نہیں؟ اور اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے کو بدعتِ حسنہ وسیئہ کے امتیاز میں بڑی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ (فتاوی محمودیہ کراچی ۳/۳۱)

براہینِ قاطعہ میں ہے ''اقول مؤلف اپنی خوبیٔ فہم سے بلکہ اپنے اسلام ہم مشرب کی تقلید سے معنی موجود ہونے کے قرونِ ثلاثہ میں اور نہ موجود ہونے کے یہ سمجھ رہا ہے کہ اگر قرونِ ثلاثہ میں یہ جزئی خاص حادث ہو کر وجودِ خارجی میں آجاوے، خواہ دلیل اس کے جواز کی ان قرون میں موجود ہو یا نہ ہو، اور خواہ اس پر کسی نے ان قرون میں انکار کیا ہو یا نہ کیا ہو، اور خواہ وہ امر ان قرون میں شائع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو تو وہ سنت ہے، اور اگر اس جزئی خاص نے ان قرون میں وجودِ خارجی نہیں پایا اگر چہ جنس اس کی ان قرون میں موجود غیر منکر ہو یا دلیل جواز کی موجود ہو وہ بدعتِ سیئہ ہے فقط، مگر یہ فہم بالکل غلط فاحش اور محض کورِ علمی ہے، اور مؤلف کی فقط اس ہی کج فہمی پر تمام اس رسالہ کی بناء ہے اور اس ہی کوتاہ فہمی سے تمام مغالطات وقبائح کا مرتکب ہوا ہے مگر ہر گز ہر گز یہ معنی نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شئی بوجودِ شرعی قرونِ ثلاثہ میں موجود ہو وہ سنت ہے، اور جو بوجودِ شرعی نہ موجود ہو

وہ بدعت ہے۔ اب سنو کہ وجودِ شرعی اصطلاحِ اصولِ فقہ میں اس کو کہتے ہیں کہ بدونِ شارع کے بتلانے کے اور فرمانے کے معلوم نہ ہو سکے اور حس اور عقل کو اس میں دخل نہ ہو، پس اس شئی کا وجود شارع کے ارشاد پر موقوف ہوا خواہ صراحۃً ارشاد ہو یا اشارۃً و دلالۃً، پس جب کسی نوعِ ارشاد سے حکم جواز کا ہو گیا تو وہ شئی وجودِ شرعی میں آگئی اگرچہ اس کی جنس بھی خارج میں نہ آئی ہو۔

اور معلوم رہے کہ سب احکامِ شرعیہ موجود بوجودِ شرعیہ ہی ہیں کیونکہ حکم حلت اور حرمت کا بدونِ شارع کے ارشاد کے معلوم نہیں ہوسکتا پس جس کے جواز کا حکم کلیۃً ہو گیا وہ بجمیع جزئیات شرع میں موجود ہو گیا اور جس کے عدمِ جواز کا حکم ہو گیا تو شرع میں اس کا عدم ثابت ہو گیا اور وجود اس کا مرتفع ہو گیا، پس یہ حاصل ہوا کہ جس کے جواز کی دلیل قرونِ ثلاثہ میں ہو خواہ وہ جزئیہ بوجودِ خارجی ان قرون میں ہوا یا نہ ہوا اور خواہ اس کی جنس کا وجود خارج میں ہوا یا نہ ہوا ہو وہ سب سنت ہے، اور وہ بوجودِ شرعی ان قرون میں موجود ہے۔ اور جس کے جواز کی دلیل نہیں تو خواہ ان قرون میں بوجودِ خارجی ہوا یا نہ ہوا وہ سب بدعتِ ضلالہ ہے۔

اور یہ بھی سنو کہ اس زمانہ کا شیوع بلا نکیر دلیل جواز کی ہے، اور نکیر ہونا اس پر دلیل عدمِ جواز کی ہے، علی ھذا اس کی جنس پر نکیر ہونا دلیل اس کے عدمِ جواز کی، اور قبول کرنا جنس کا دلیل اس کے جواز کی ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ حکم کا اثبات قرآن و حدیث سے ہی ہوتا ہے اور قیاس مظہر حکم کا ہے مثبت حکم کا نہیں ہوتا، پس جو قیاس سے ثابت ہوتا ہے وہ بھی کتاب و سنت ہی سے ثابت ہوتا ہے اس قاعدہ کو خوب غور کرنا اور سمجھ لینا ضرور ہے۔ (براہینِ قاطعہ ۲۸، ۲۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ ربیع الآخر ۱۴۲۹ھ

كتاب السياسة

ہندوستان میں نظامِ قضاء کے اجراء کا شرعی حکم

سلطنتِ اسلامیہ کے زوال سے ملتِ اسلامیہ ہند گوناں گوں شرعی مسائل سے دوچار ہوئی، سامراجی دورِ سیاہ نے اہلِ اسلام کو صرف مادی وسائل سے ہی محروم نہیں کیا بلکہ بتدریج ہر اس نظام کو ختم کیا جس سے وابستہ رہ کر مسلمان اپنی اجتماعیت برقرار رکھ سکتے تھے، اور وہ آپسی نزاع وجدال سے بلند ہو کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو سکتے تھے، الحاصل مسلمانانِ ہند کو اپنے مذہب سے بے گانہ بنانے، اور سامراجی نظام کا غلام بنانے کی ہر تدبیر روبہ عمل لائی گئی، اسلامی نظامِ تعلیم کو ختم کیا گیا، اسلامی قانون عدالتوں سے مٹایا گیا، اس مذموم افرنگی سازش میں جن اسلامی اقدار کی پامالی ہوئی ان میں اسلامی نظامِ قضا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اربابِ فقہ وبصیرت پر یہ بات مخفی نہیں کہ اسلامی معاشرہ میں نظامِ قضا کا وجود انتہائی اہم اور ضروری ہے، کیوں کہ مسلمانوں کی زندگی میں روزمرہ ایسے مسائل کا پیش آنا ناگزیر ہے جن کے تصفیہ کے لیے قضاءِ قاضی کی ضرورت پیش آتی ہے، جن کا حل قاضی شرع کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے بغیر قضائے قاضی وہ مسائل معرض تعویق میں پڑے رہتے ہیں فقہاءِ اسلام نے بسط وتفصیل کے ساتھ ان مسائل کو منضبط کردیا ہے جن میں قضاءِ قاضی کی احتیاج ہوتی ہے۔

نظام قضاء کی اس ضرورت واہمیت سے اکابر علماءِ ہند کبھی غافل نہ رہے بلکہ اس مشکل کے حل کے لیے برابر کوشاں رہے ”شریعت ایکٹ“ ”قانون انفساخ نکاح مسلمین بل“ وغیرہ اسی سلسلۂ جدوجہد کی کڑی ہے، حضرات اکابر نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد حکومتوں سے مسلم قاضیوں کی تقرری کے لیے برابر کوشش جاری رکھی؛ چنانچہ جمعیتِ

علماءِ ہند کے اکابر؛ نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا عبدالکریم گمتھلویؒ نے ''مسلم قاضی بل'' کے نام سے ایک مسودہ قانون ترتیب دے کر ۱۹۴۱ء میں اسمبلی میں پیش کرایا پھر ۱۹۵۲ء میں آزاد ہند کے پارلیمنٹ میں جمعیتِ علماءِ ہند نے محمد احمد کاظمی صاحب کے توسط سے دوبارہ قاضی بل پیش کرایا، اب ایک بار پھر جمعیت علماء ہند کے صدر نائب امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ ایم، پی نے جنوری ۸۹ء میں پارلیمنٹ میں قاضی بل پیش کرنے کا جرات منداقدام کیا ہے۔(خدا ان اکابر کی ان کوشش کو بارآور کرے۔ آمین) حکومتوں کی سرد مہری، بے توجہی بلکہ اسلام دشمنی سے اب تک یہ مساعی بارآور نہ ہوسکیں؛ لیکن حضرات علماء نے ان پر انحصار بھی نہیں کیا بلکہ اسلامی معاشرے کی اس ضرورت کو کسی نہ کسی حد تک پورا کیا، علماءِ امت کے ایک طبقہ نے فقہ مالکیہ کے مطابق جماعت مسلمین (شرعی پنچایت) کو قاضی کے قائم مقام بنا کر اس ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیا جب کہ ایک دوسرے طبقہ نے تراضی مسلمین سے قضاۃ کے تقرر کو مسئلہ کا فقہی حل سمجھ کر نظامِ امارت وقضاء قائم فرمایا، آج بھی یہ دونوں طریقے ہندوستان میں جاری ہیں؛ لیکن ایک مقصد کے لیے دو جدا جدا عنوانوں سے کام کرنے کے بجائے اگر ایک طریقِ کار پر اتفاق کر کے کام کیا جائے تو امت اسلامیہ ہند کی اجتماعی شیرازہ بندی مؤثر طور پر ہوسکتی ہے، اور نظام کو وسیع، ہمہ گیر اور مؤثر بنایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ادارہ مباحثِ فقہیہ جمعیتِ علماء ہند کے ذمہ داران نے مناسب سمجھا کہ مسئلہ کی تنقیح کر کے کسی اتفاقی فیصلہ تک پہنچنے کی سعی کی جائے؛ اس لیے چند سوالات جواب وتحقیق کے لیے پیشِ خدمت ہیں، سوالات کا مقصد تحدید وپابندی نہیں بلکہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانا ہے، اگر کوئی اہم سوال مزید آپ کے ذہن میں ہو تو اس کو بھی شاملِ سوال فرما کر مدلل ومفصل مقالہ تحریر فرمائیں،

ادارہ مباحثِ فقہیہ جمیعت علماء ہند کا دوسرا فقہی اجتماع ان شاء اللہ عن قریب اس عنوان پر ہوگا، جواب میں یہ بات ملحوظ رہے کہ سوال ہندوستان اور اس جیسے غیر اسلامی سلطنتوں کے متعلق ہے جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کو حاصل ہے اور مسلم حکام وقضاۃ موجود نہیں۔

سوالات

(۱) ہندوستان اور اس جیسے غیر اسلامی مما لک میں جہاں اقتدارِ اعلیٰ غیر مسلموں کو حاصل ہے، کیا مسلموں پر اپنے نزاعی مسائل کے تصفیہ کے لیے اسلامی نظامِ قضاء قائم کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) قضاء کی حقیقت، قاضی شرع کی تعریف اور قضاء کے ارکان وشرائط کیا ہیں؟

الف: قضاء کی تعریف میں ''الزام'' سے الزام حسی مراد ہے یا الزام معنوی؟

ب: اگر الزام حسی مراد ہے تو کیا اس کے بغیر قضاء شرعی کا تصور ممکن نہیں؟ اور کیا اس قید کا اعتبار حالتِ اختیار اور حالتِ احتیاج میں یکساں ہوگا خواہ دارالاسلام ہو یا غیر دارالاسلام، خواہ قاضی کو من جانب والی کلی اختیارات مفوض ہو یا جزوی؟

ج: اگر الزام سے الزام معنوی مراد ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا قوتِ نافذہ کے بغیر قضاء کے معنی متحقق ہو سکتے ہیں، پھر مفتی کے فتویٰ اور قاضی کے فیصلہ میں حدِ فاصل کیا ہوگی؟

(۳) قاضی کے حلقۂ عمل اور دائرہ اختیار میں کس طرح کے مسائل داخل ہوں گے؟ کیا کسی سبب دائرۂ اختیار میں تحدید ہو سکتی ہے؟ اگر قاضی کا حلقۂ عمل ان مسائل تک محدود ہو جن میں بظاہر قوتِ عسکری کی ضرورت نہیں تو کیا پھر بھی قوتِ قاہرہ شرط ہوگی؟

(۴) ہندوستان اور اس جیسے غیر اسلامی مما لک میں قاضی کا تقرر کن طریقوں پر

شرعاً درست قرار دیا جاسکتا ہے؟ جب کہ ظاہر ہے کہ دارالاسلام میں خلیفۃ المسلمین یا اس کے ولاۃ وحکام قضاۃ کا تقرر کرتے ہیں۔

الف: غیر مسلم حکومت اگر مسلم قاضی مقرر کرے تو کیا شرعاً وہ قاضی ہوجائے گا؟ اگر نہیں تو ”یجوز تقلد القضاۃ من السلطان العادل او الجائر ولو کان کافرا“. (درمختار) اور ”الاسلام لیس بشرط ای فی السلطان الذی یقلد“. (فتاویٰ عالمگیری) وغیرہ جزئیات فقہیہ کا کیا مطلب ہے؟

اگر وہ شرعاً قاضی ہوجاتا ہے تو کیا ولایت کافر علی المسلم کا الزام نہ آئے گا؟ نیز کیا والی کافر کی تقلید کافی ہے یا تراضی مسلمین بھی ضروری ہے؟

ب: اگر غیر مسلم حکومت کی طرف سے مسلم قضاۃ کا تقرر نہ ہو اور اس ملک کے مسلمان اپنے نظم شرعی اور اجتماعی امور کے قیام وبقاء کے لیے کوئی امیر منتخب کرلیں (جیسا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنا امیر الہند منتخب کر کے نظامِ امارت قائم کرلیا ہے) تو کیا یہ امیر اور اس کے متعین کردہ صوبائی امراء شرعاً قاضی مقرر کرسکتے ہیں؟ اگر نہیں تو فقہاءِ کرام کی ”واذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کماهو فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبة فی بلاد المغرب الآن، وبلنسة، وبلاد الحبشة واقرّوا المسلمین عندهم علی مال یوخذ منهم یجب علیهم ان یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیا، فیولی قاضیا او یکون هو الذی یقضی بینهم“. (فتح القدیر) جیسی تصریحات کا کیا مطلب ہے؟

اور اگر ان امراء کے تقرر سے شرعاً قاضی ہوجاتا ہے تو کیوں کر؟ جب کہ ظاہر ہے قوتِ قاہرہ حاصل نہ ہوگی۔

ج: غیر اسلامی ممالک میں اگر مسلمان باہمی تراضی سے قاضی کا تقرر کریں تو کیا شرعاً وہ قاضی ہوگا یا نہیں؟ بصورتِ نفی "یصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین" (شامی) کا کیا مطلب ہے؟ قاضی جمعہ مراد ہے یا مطلق قاضی، اگر قاضی جمعہ مراد ہے تو کیا اقامتِ جمعہ کے لیے قاضی کا ہونا شرط ہے؟ اور اگر مطلق قاضی مراد ہے تو کیا یہاں قوت شرط نہ ہوگی؟

اگر تراضی مسلمین سے قاضی ہوجاتا ہے تو "واذا اجتمع اھل بلدۃ علی رجل وجعلوہ قاضیا یقضی فیما بینھم لا یصیر قاضیا" (فتاویٰ عالمگیری) جیسی فقہی جزئیات کا محمل کیا ہوگا؟

(۵) فقہ حنفی میں قوتِ قاہرہ ومنفذہ کے بغیر اگر قاضی شرع ہونے کی گنجائش نکلتی ہے تو کیا پھر بھی فقہ مالکی کے مطابق جماعت مسلمین کا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت رہتی ہے؟

(۶): ایک مقام پر متعدد قاضی ہوسکتے ہیں یا صرف ایک؟ متعدد قاضی ہونے کی صورت میں اگر اختلاف کی صورت پیش آئے تو فیصلہ کی کیا صورت ہوگی؟ بینوا توجروا ان شاء اللہ اجراعظیما.

المستفتی: معزالدین احمد غفرلہ

خادم ادارۃ المباحث الفقہیہ جمیعۃ علماء ہند

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور اولی الامر کی اطاعت کریں، اور اپنے آپسی نزاعات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ کی طرف لوٹائیں۔ ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوْا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ

إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً﴾(سورۂ نساء ۵۹)

نیز یہ بھی ضروری اور لازم قرار دیا گیا کہ اپنے نزاعی معاملات میں رسول اللہ ﷺ کو فیصل جان کر آپ ﷺ کے فیصلوں کو دل وجان سے تسلیم کرلیں ﴿فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيماً﴾(سورۂ نساء ۶۵)

حضرات مفسرین نے تصریح فرمائی ہے کہ اس ارشادِ ربانی پر عمل آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی شریعتِ مطہرہ کا فیصلہ خود آپ کا فیصلہ ہے۔

جو لوگ اپنے نزاعی معاملات میں شریعتِ مطہرہ کو چھوڑ کر دیگر قوانین کی طرف رجوع کرتے ہیں اس کو شیطان کا اتباع قرار دیا گیا، اور اس کے مرتکبین کو صاف لفظوں میں منافق، فاسق، ظالم بلکہ کافر تک بتلایا گیا۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُواْ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُواْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيداً، وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْاْ إِلَى مَا أَنزَلَ اللّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُوداً﴾(سورۂ نساء ۶۰، ۶۱)

﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (سورۂ مائدہ ۴۷)

﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (مائدہ ۴۵)

﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (مائدہ ۴۴)

چنانچہ صاف صاف یہ حکم دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کا اتباع کیا

جائے، اس کے علاوہ کسی کا بھی اتباع نہ کیا جائے۔ ﴿اتَّبِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُواْ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ﴾ (اعراف ۳)

ایسا نظام جس کے ذریعہ لوگوں کے آپسی نزاعات کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق دیا جائے اسی کا نام نظام قضاء ہے۔ والقضاء هو الحكم بين الناس بالحق والحكم بما انزل الله عز وجل. (بدائع الصنائع ۲/۷)

اور اسلامی نظامِ قضاء کا اجراء اور قیام اہم اور ضروری واجبات میں سے ہے۔ ''بدائع'' میں ہے: كان نصب القاضى لاقامة الفرض فكان فرضا ضرورة. (۲/۷) ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے: نصب القاضى فرض كذا فى البدائع وهو من اهم امور المسلمين واقوىٰ واوجب عليهم. (۳۰۸/۳)

نظامِ قضاء بھی اسلام کے اجتماعی نظام کی ایک شاخ ہے؛ اس لیے نظام قضاء کے اجراء کے لیے نظام امارت وخلافت کا قیام ضروری ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ تمام مسلمان اجتماعی زندگی گزارنے کے مکلّف ہیں، انتشار اور تشتت کی زندگی اسلامی نقطۂ نظر سے ناجائز ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعاً وَلَا تَفَرَّقُواْ﴾ (بقرہ ۱۰۳)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم، يأخذ الشاذة والقاصية والناحية، واياكم والشعاب، وعليكم بالجماعة والعامة. رواه احمد. (عن معاذ بن جبل، مشکوٰۃ ۳۱)

عن ابى ذر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه. رواه احمد وابو داؤد. (ایضاً)

قال النبی ﷺ: اٰمرکم بخمس: بالجماعة، والسمع، والطاعة، والهجرة، والجهاد فی سبیل اللّٰہ؛ وانه من خرج من الجماعة قید شبر فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه الا ان یراجع، ومن دعا بدعوی الجاهلیة فهو من جثی جهنم وإن صام وصلی وزعم انه مسلم. رواه احمد والترمذی. (مشکوٰة ۳۲۱)

عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات مات میتة جاهلیة. الخ رواه مسلم. (مشکوٰة ص ۳۱۹)

اور یہ ظاہر اور بدیہی ہے کہ اجتماعی زندگی کا تصور بغیر امیر کے ممکن نہیں ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام تمام مسلمانوں کو اس بات کا مکلّف بناتا ہے کہ وہ اپنے لیے ایک امیر یا امام منتخب فرمائیں، اور اسی کی امارت میں اپنے تمام امور انجام دیں۔

خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد: لااسلام الا بجماعة، ولا جماعة الا بامارة، ولاامارة الا بطاعة. یعنی اسلام جماعتی زندگی کے بغیر نہیں، اور جماعتی زندگی کا تحقق بغیر امیر کے نہیں، اور اطاعت وفرمان برداری کے بغیر امیر مفید نہیں ہے۔ (جامع بیان العلم وفضله لابن عبدالبرؒ ۶۲)

اسی نوع کے ایک سوال کے جواب میں مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: مسلمانوں پر پہلا اہم اور مقدم فرض یہ ہے کہ وہ مسلمان والی مقرر کریں، کیوں کہ بغیر والی مسلم کے بہت سی اسلامی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ ثم الاجماع علی ان نصب الامام واجب، والمذهب انه یجب علی الخلق. (شرح عقائد ۱۱۰) اس بات پر اجماع ہے کہ امام مقرر کرنا فرض ہے، اور مذہب اہل سنت کا یہ ہے کہ امام مقرر کرنا مخلوق (مسلمانوں) پر فرض ہے الخ (کفایت المفتی ۲/۲۱۶)

جن ممالک میں مسلمان بااختیار ہیں اور اقتدار اعلیٰ ان کے ہاتھوں میں ہے، ان کے لیے اس بات کے ضروری ہونے میں کہ وہ اپنے میں سے کسی کو امیر و امام مقرر کریں اور اسلامی نظام حکومت کے تحت زندگی گزاریں کوئی اختلاف بھی نہیں؛ لیکن ہندوستان اور اس جیسے وہ غیر اسلامی ممالک جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کو حاصل ہے، ایسے مقامات میں بھی اسلامی ضابطہ کے مطابق ایک امیر منتخب کر کے اس کے ماتحت جماعتی زندگی گزارنا اور اپنے نزاعی مسائل کے تصفیہ کے لیے اسلامی نظامِ قضاء قائم کرنا ضروری ہونے پر بھی حضرات فقہاءؒ کی تصریحات موجود ہیں۔

علامہ ابن ھمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: اذا لم یکن سلطان و لامَن یجوز التقلد منه کما فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبة فی بلاد المغرب الآن، و بلنسیة، و بلاد الحبشة، اقرّوا المسلمین عندهم علی مال یوخذ منهم یجب علیهم ان یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیا، فیولی قاضیا او یکون هو الذی یقضی بینهم. (فتح القدیر ۷/۲۶٤)

ترجمہ: جب بادشاہ نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسی شخصیت جس کی طرف سے عہدۂ قضاء کا قبول کرنا درست ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض ان مسلم علاقوں میں جن پر کفار کا تسلط ہو چکا ہے مثلاً قرطبہ اور بلنسہ اور بلاد حبشہ کہ کفار نے مسلمانوں سے کچھ رقم لے کر یہاں رہنے کی ان کو اجازت دے رکھی ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے اندر سے کسی ایک شخص پر متفق ہو کر اس کو اپنا امیر و والی مقرر فرمائیں، پھر وہ امیر ہی قاضی مقرر کرے گا یا خود ہی مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرے گا۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بھی ''فتح القدیر'' کی مندرجۂ بالا عبارت ''النھر

الفائق" کے حوالہ سے نقل فرما کر صاحب نہر کا تبصرہ بھی نقل فرمایا ہے: وھذا ھو الذی تطمئن النفس الیه فلیعتمد. نہر (شامی ٤/ ٣٤٢) البتہ علامہ شامیؒ نے صاحب نہر کے کلام میں "ھذا" کا مصداق دوسرا مسئلہ قرار دیا ہے۔ والاشارة بقوله ھذا الی ما افاده کلام الفتح من عدم صحة تقلد القضاء من کافر علی خلاف مامر عن التتارخانیه (شامی ٣٤٢/٤) لیکن علامہ شامیؒ کی اس تعیینِ مصداق کو علامہ عبدالقادر رافعیؒ نے تسلیم نہیں فرمایا ہے۔ دیکھئے: (تقریرات الرافعی ۲/۱۹۱)

بہر حال مندرجۂ بالا فقہی تصریح سے یہ ثابت ہوا کہ ہندوستان جیسے ممالک میں جب تمام مسلمان متفقہ طور پر، یا وہاں کے علماء اور اہل حل وعقد مل کر کسی ایک شخص کو والی اور امیر منتخب کرلیں، تو اب وہ امیر کسی کو قاضی مقرر فرما کر نظامِ قضاء کا اجراء کرے گویا اس امیر کی طرف سے تفویضِ قضاء درست ہوگی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں: اور اگر مسلمان حاکم نہ ہووے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ جو شخص امانت دار اور دیانت دار ہو اس کو رئیس مقرر کر دیویں؛ تاکہ اس رئیس کی اجازت سے اس کے سامنے نماز جمعہ وعیدین قائم کی جائے، اور جس نابالغ کا ولی نہ ہو اس کا نکاح کیا جاوے، اور لاوارث مال اور یتیموں کی حفاظت کی جاوے، اور جب کسی میت کے ترکہ کی تقسیم میں نزاع ہو تو ترکہ اس میت کے وارثوں میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے"۔ (فتاویٰ عزیزی اردو ۱/۷۰)

حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ کے مجموعۃ الفتاویٰ میں ایک تفصیلی جواب شیخ یوسف کا تحریر فرمودہ ہے، جس پر حضرت مولانا عبدالحیؒ کی تصدیق وتصحیح ہے اس میں ہے:

اما الوالی والقاضی المتفق علیه فی بلاد الغلبة فهل یملك تزویج الصغار الأیتام؟

فلم اره صريحا؛ لكن ظاهر مامر من انه يجب على المسلمين ان يتفقوا على واحد منهم يجعلونه واليا فيولى قاضيا او يكون هو الذى يقضى بينهم انه يملكه .(مجموعة الفتاوىٰ مولانا عبدالحیؒ على هامش خلاصة الفتاوىٰ ٤ / ٨)

رہا وہ والی اور قاضی جس پر اہل بلدہ کا اتفاق ہوجائے ان علاقوں میں جن پر کفار کا غلبہ ہے، کیا اس کو چھوٹے یتیم بچوں کا نکاح کرانے کا اختیار ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق میں نے صراحت نہیں دیکھی؛ لیکن پہلے جو عبارت يجب على المسلمين الخ گزر چکی اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس والی کو یہ حق حاصل ہے۔

لیکن اگر کسی علاقہ یا شہر کے مسلمان کسی شخص کو اپنا والی یا امیر منتخب کرنے پر متفق نہیں ہو سکے مگر وہاں کے ارباب حل وعقد کسی شخص کو قاضی مقرر کرنے پر اتفاق کر لیتے ہیں، تو یہ بھی درست ہوگا، اور اس طرح یہ شخص قاضی قرار پا جائے گا۔

علامہ شامیؒ نے معراج الدرایہ کے حوالہ سے ایک طویل عبارت نقل فرمائی ہے، جس کا آخری ٹکڑا صراحت کرتا ہے کہ عوام مسلمین کی طرف سے کی گئی قاضی کی یہ تقرری درست ہے۔فلو الولاة كفارا يجوز للمسلمين اقامة الجمعة ويصير القاضى قاضيا بتراضى المسلمين ويجب عليهم ان يلتمسوا واليا مسلما. (شامی ۱/۵۹۵)

اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، وہ یہ کہ اگرچہ قاضی کی تقرری کا اصل طریقہ (جیسا کہ اوپر ہم بتلا چکے ہیں) یہی تھا کہ اولاً تمام مسلمان متفق ہوکر یا اہل حل وعقد مل کر کسی ایک شخص کو اپنا والی اور امیر مقرر کرتے، اور اس کے بعد اس والی یا امیر کی طرف سے قضاۃ کا تقرر عمل میں آتا؛ لیکن جب ایسا نہ ہو سکا، تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے نظام قضاء بھی معطل ہوکر رہ جائے، اگر امیر پر تو اتفاق نہ ہو سکا؛ لیکن قاضی پر اتفاق

ہوسکتا ہے تو کم ازکم اسی فریضہ کو قائم کرلیا جائے،اور امیر مقرر کرنے والے فریضہ کو بھی قائم کرنے کی سعی جاری رہے جیسا کہ شامی کی مندرجۂ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے،اس تفصیل سے عالمگیری کی اس عبارت سے پیدا ہونے والا اشکال بھی رفع ہوجاتا ہے۔
عالمگیری میں ہے: اذا اجتمع اهل بلدة على رجل و جعلوه قاضيا يقضى فيما بينهم لايصير قاضيا، ولوا اجتمعوا على رجل وعقدوا معه عقد السلطنة أو عقد الخلافة يصير خليفةً و سلطانا كذا فى المحيط. (۳۱۵/۳)اس لیے کہ یہ صورت اس وقت ہے جب کہ مسلمانوں کا امیر اور حاکم موجود ہو، اور مسلمان اس کی موجودگی میں کسی شخص کو قاضی مقرر کریں، ظاہر ہے کہ جب امیر اور حاکم موجود ہے تو تقرر قضاۃ یہ اس کا منصب اور اس کے اختیارات میں سے ہے اس کی موجودگی میں عوام مسلمین کا یہ اقدام (یعنی تقرر قضاۃ) انتشار اور افتراق کا باعث ہوگا جس سے بچنے کے لیے ہی امیر کا انتخاب عمل میں آیا تھا، نیز جب اس ذمہ داری کو انجام دینے والی شخصیت موجود ہے تو عوام مسلمین کو کیا ضرورت پیش آئی جو اس میں دخل دیں گویا اس صورت میں ان کا یہ اقدام موجبِ انتشار ہونے کے ساتھ ساتھ بے ضرورت بھی ہے؛ چناں چہ عالمگیری کی اسی عبارت میں دوسرا جزء:ولو اجتمعوا على رجل وعقد وا معه عقد السلطنة أو عقد الخلافة يصير خليفة و سلطانا. اس کا قرینہ ہے؛اس لیے کہ عوام مسلمین کا کسی کی خلافت وامارت پر متفق ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ اور امیر موجود نہیں ہے، اگر ہوتا تو اس کی ضرورت بھی پیش نہ آتی ،اور چوں کہ یہ کام تو عوام مسلمین ہی کو انجام دینا ہے؛ اس لیے ان کا یہ اقدام ضرورت کی بنیاد پر ہونے کے ساتھ ساتھ برمحل بھی ہے کہ انہی کا حق ہے۔اس کا دوسرا قرینہ یہ بھی ہے کہ یہی مسئلہ فتاویٰ بزازیہ اور خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے اور

دونوں جگہ پر ضرورت کی قید کے ساتھ مقید ہے فتاویٰ بزازیہ میں ہے: اجتمع اهل البلدة وقدموا رجلا على القضاء لا يصح لعدم الضرورة، وان مات سلطانهم واجتمعوا على سلطنة رجل جاز للضرورة. (فتاوى بزازيه على هامش الهنديه ٥/ ١٣٠)

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: اجتمع اهل بلدة وقلدوا القضاء لرجل لايجوز ولا يصير قاضيا، و لو اجتمعوا وجعلوا الرجل سلطانا يصح لان فيه ضرورة ولا ضرورة فى الاول. (خلاصة الفتاوىٰ على هامش مجموعة الفتاوىٰ للكنوى ٢/٤)

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بعینہ یہی توجیہ فرمائی ہے۔ درمختار کی عبارت: ويجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو كافراً الخ کی شرح فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں (قوله ويجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر) اى الظالم، وهذا ظاهر فى اختصاص تولية القضاء بالسلطان ونحوه كالخليفة حتى لو اجتمع اهل بلدة على تولية واحد القضاء لم يصح بخلاف مالو ولوا سلطانا بعد موت سلطانهم كما فى البزازية. نهر وتمامه فيه، قلت: وهذا حيث لاضرورة والافلهم تولية القاضى ايضا كمايأتى بعده. (شامى ٤/ ٣٤٢) اور اس کے بعد فتح القدیر کی وہ عبارت نقل فرمائی ہے جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

اس پوری تفصیل سے عالمگیری والے اس جزئیہ سے پیدا ہونے والا اشکال رفع ہوکر اس کا صحیح محمل بھی متعین ہوگیا؛ اس لیے عالمگیری کی اس عبارت سے امیر وحاکم ہونے کی صورت میں عوام مسلمین کی طرف سے تقرر قضاۃ کی عدم صحت پر استدلال درست نہیں ہے۔

مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ کفایت المفتی میں

تحریر فرماتے ہیں: قاضی بنانے کا حق مسلمان حاکم کو ہے، اور مسلمان حاکم نہ ہوتو مسلمانوں کی جماعت کو، اگر غیر مسلم حاکم کسی کو بشرط رضامندیٔ جماعتِ مسلمین قاضی بنادے تو یہ بھی درست ہے۔ (کفایت المفتی ۲/۲۲۲)

عوامِ مسلمین کی طرف سے کی جانے والی قاضی کی تقرری کے سلسلہ میں جو تفصیل پیش کی گئی اس کے بعد اب مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی؛ لیکن چونکہ یہ مسئلہ بعض حضرات کے لیے غلط فہمی اور الجھن کا باعث بنا ہے؛ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فقہ کا ایک دوسرا مسئلہ بھی اس موقعہ پر پیشِ نظر رہے۔ نماز جمعہ کی صحت اور انعقاد کے شرائط میں سے حنفیہ کے نزدیک ایک شرط سلطان بھی ہے، چنانچہ تمام کتب احناف میں جہاں جمعہ کے شرائطِ صحت بیان کیے جاتے ہیں وہاں اس کا بھی بیان ہوتا ہے؛ لیکن بعد میں جا کر اس شرط کے سلسلہ میں جو انداز اختیار کیا گیا ہے اس سے بھی فقہ کا ہر ایک طالب علم بخوبی واقف ہے، اس کا صرف ایک نمونہ پیش کرتا ہوں، درمختار میں اسی شرط پر کلام کرتے کرتے بہ تدریج آخر میں یہ فرمایا ہے: ونصب العامة الخطيب غير معتبر مع وجود من ذكر، اما مع عدمهم فيجوز للضرورة. اور اس کی شرح فرماتے ہوئے علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں: (قوله فيجوز للضرورة) ومثله مالو منع السلطان اهل مصر ان يجمعوا اضرارا وتعنتا فلهم ان يجمعوا على رجل يصلى بهم الجمعة. (شامی ۱/۵۹۵)

ترجمہ: اسی طرح اگر بادشاہِ وقت محض تعنت اور ہٹ دھرمی کے طور پر کسی شہر والوں کو نماز جمعہ قائم کرنے سے منع کردے پھر بھی ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ ایک آدمی پر متفق ہوجائیں جو ان کو نماز جمعہ پڑھائے۔

دیکھا آپ نے کہ باوجود بادشاہِ وقت کے امتناعی حکم کے عوام مسلمین کو اقامتِ جمعہ کی اجازت دی گئی۔

شامی کے حاشیہ پر ہے: نقل شیخنا عن عقد اللآلی: انه لو تعذر الاستیذان من السلطان کمافی هذا الزمان من عدم التفات السلاطین لمثل تلك الامور فاجتمعت الناس علی شخص لیصلی بهم جاز. (حاشیۂ شامی ۱/۵۹۵)

ترجمہ: ہمارے شیخ نے عقد اللآلی سے نقل کیا ہے کہ اگر بادشاہِ وقت سے (اقامت جمعہ کے لیے) اجازت لینا دشوار ہوجائے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں شاہانِ وقت کی دینی بے توجہی کی وجہ سے یہ صورتِ حال پیدا ہوچکی ہے، تو اس صورت میں اگر لوگ کسی ایک شخص پر متفق ہوجائیں جو ان کو نماز جمعہ پڑھائے تو جائز اور درست ہے۔

دیکھئے صورتِ مذکورہ میں بادشاہِ وقت موجود ہونے کے باوصف محض اس لیے کہ اس کی دینی امور میں غفلت و بے التفاتی کی وجہ سے اس سے رابطہ قائم کرنا اور اجازت لینا دشوار ہوگیا ہے عوام مسلمین کو اقامت جمعہ کی اجازت دیدی گئی آخر ایسا کیوں ہوا؟ وجہ ظاہر ہے کہ جمعہ جو جامع الجماعات ہے، اور اس موقعہ پر دیگر فرائض کے مقابلہ میں بڑا اجتماع ہوتا ہے، ایسے موقعہ پر سربراہی کے لیے مختلف قسم کے طالع آزما اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور یہ چیزیں ملت کی شیرازہ بندی کے لیے ایک خطرہ ثابت ہوتی ہے، اس کی پیش بندی کے لیے شریعتِ مطہرہ نے بادشاہِ وقت یا اس کے نائب ومقرر کردہ شخصیت کی موجودگی ضروری قراردی؛ لیکن اگر مسلمانوں کی بدقسمتی سے بادشاہِ وقت اپنی دین سے دوری کی وجہ سے ان امور میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لیتا کہ نہ خود آتا ہے، نہ کسی کو اس کام کے لیے مقرر کرتا ہے، اور اس کے ساتھ اپنے اردگرد ایسا حصار بنا رکھا ہے کہ اس کی اجازت حاصل

کرنے کے لیے اس کے ساتھ رابطہ بھی دشوار ہو چکا ہے، تو کیا اس کی وجہ سے دین کے اس اہم فریضہ یعنی جمعہ کو چھوڑ دیا جائے؟ ہرگز نہیں۔ شامی کے حاشیہ پر جو مسئلہ عقد اللآلی کے حوالہ سے مذکور ہے اس کا مطلب یہی ہے۔

(۲) لغت میں لفظ قضاء مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے:

[۱] **فیصلہ کرنا، حکم جاری کرنا، حکم دینا۔** ﴿وقضی ربك الا تعبدوا الا اياه﴾ (اسراء۲۳) ﴿وانذرهم يوم الحسرة اذقضى الامر﴾ (مریم۳۹) ﴿وقضى بينهم بالحق﴾ (زمر۷۵) ﴿فاقض ماانت قاض﴾ (طٰہٰ۷۲)

[۲] **فارغ ہونا، ادا کرنا** ﴿فاذا قضيتم مناسككم﴾ (بقرہ۲۰۰) ﴿فاذا قضيتم الصلوٰة﴾ (نساء۱۰۳) ﴿فاذا قضيت الصلوٰة﴾ (جمعہ۱۰)

[۳] **ہلاک (مرجانا، مارڈالنا)۔** ﴿فوكزه موسى فقضى عليه﴾ (قصص۱۹) ﴿ونادوا يامالك ليقض علينا ربك﴾ (زخرف۷۷)

[۴] **پورا کرنا، گزرنا۔** ﴿ولاتعجل بالقرآن من قبل ان يقضى اليك وحيهٗ﴾ (طٰہٰ۱۱۴) ﴿ايما الاجلين قضيت فلا عدوان على﴾ (قصص۲۸) ﴿فلما قضى موسى الاجل وسارباهله﴾ (قصص۲۹) ﴿قضى الامر الذى فيه تستفتيان﴾ (یوسف۴۱)

[۵] **بنانا۔** ﴿فقضاهن سبع سمٰوات﴾ (فصلت۱۲)

[٦] **مقدر کرنا۔** ﴿واذا قضى امرا فانما يقول له كن فيكون﴾ (بقرہ۱۱۷)

صاحبِ بحر الرائق علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں: وحاصله ان يستعمل لغة: بمعنى الحكم، والفراغ، والهلاك، والاداء، والانهاء، والمضى، والصنع، والتقدير. (بحر الرائق ٦/٢٧٧)

اصطلاحِ فقہاء میں مختلف انداز سے اس کی تعریف کی گئی ہے اگر چہ بحیثیت مفہوم وہ تمام تعریفیں قریب قریب ہیں۔ علامہ ابن فرحونؒ نے ابن راشد کے حوالہ سے ”تبصرة الحکام“ میں یہ تعریف لکھی ہے۔ القضاء: الاخبار عن حکم شرعی علی سبیل الالزام. (۸/۱) کسی حکمِ شرعی کی بطریق الزام خبر دینا؛ چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں بہت مختصر طور پر اتنا ہی تحریر فرمایا ہے۔ وفی الشرع یراد به الالزام. (۲۵۲/۷)

علامہ ابوبکر کاسانیؒ فرماتے ہیں: القضاء هو الحکم بین الناس بالحق والحکم بما انزل الله عز وجل. (بدائع الصنائع ۲/۷) لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے حکم اور حق کے مطابق فیصلہ کرنا۔

شیخ قاضی ابن الشحنہؒ فرماتے ہیں: وفی الشرع یرادبالقضاء فصل الخصومات وقطع المنازعات. (لسان الحکام علی هامش معین الحکام ۳) خصومات کا فیصلہ کرنے اور نزاعات کو ختم کرنے کا نام قضاء ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: وفی الشرع قول ملزم یصدر عن ولایة عامة کذا فی خزانة المفتین. (۳۰۶/۳) ایسا قول ملزم جو ولایتِ عامہ کی بنیاد پر صادر ہوا ہو۔

علامہ ابن نجیمؒ نے بحر الرائق میں کئی تعریفوں کو جمع فرمادیا ہے: الثانی معناه شرعا: فعرفه فی فتح القدیربالالزام، وفی المحیط بفصل الخصومات وقطع المنازعات، وفی البدائع الحکم بین الناس بالحق وهو الثابت عندالله تعالیٰ فی حکم الحادثة .... وعرفه العلامة قاسم بانه انشاء الزام فی مسائل الاجتهاد المتقاربة فیما یقع فیه النزاع لمصالح الدنیا...... الخ (بحر الرائق ۲۷۷/۶)

قضاء کے ارکان حسبِ تصریح قاضی ابوالحسن علاء الدین علی بن خلیل طرابلسیؒ کل

چھ ہیں: الباب الخامس فی ارکان القضاء، وھی ستة: القاضی، والمقضی به، والمقضی له، والمقضی فیه، والمقضی علیه، وکیفیة القضاء. (معین الحکام ١٤)

ان تمام ارکان میں سے ہر ایک کے متعلق بڑی تفصیلات ہیں جو اس موضوع پر تصنیف شدہ کتبِ فقہ میں موجود ہیں، جن کی اس مضمون میں گنجائش نہیں، معین الحکام، لسان الحکام، تبصرۃ الحکام میں یہ تمام چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں، اردو زبان میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب مدظلہ کی کتاب ''اسلامی عدالت'' بڑی جامع اور بے نظیر ہے۔

(الف) قضاء کی تعریف میں جو الزام مذکور ہے اس سے الزام معنوی مراد ہے؛ لیکن یہ الزام معنوی اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ قاضی کو تمکن وقدرت حاصل ہو۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: فکون الرجل امیرا وقاضیا وو الیا وغیر ذلك من الامور التی مبناھا علی القدرة والسلطان متی حصل مایحصل به من القدرة والسلطان حصلت والافلا، اذ المقصود بھا عمل اعمال لاتحصل الا بقدرة فمتی حصلت القدرة التی بھا یمکن تلك الاعمال کانت حاصلة والا فلا وھذا کون الرجل راعیا للماشیة متی سلمت الیه بحیث یقدر ان یرعاھا کان راعیا لھا والا فلاعمل الا بقدرة علیه. فمن لم یحصل له القدرة علی العمل لم یکن عاملا، والقدرة علی سیاسة الناس اما بطاعتھم له واما بقھره لھم فمتی صار قادراً علی سیاستھم بطاعتھم او بقھره فھو ذو سلطان مطاع اذ أمر بطاعة الله. (منھاج السنة ١/ ١٤١، ١٤٢)

خود امیر اور والی کے متعلق اس نوع کی صراحت موجود ہے۔

فان بایع الناس الامام ولم ینفذ حکمه فیھم لعجزه عن قھرھم لایصیر

اماما. (درمختار باب البغاۃ علی ھامش الشامی ۳/ ۳٤۰)

(ب) نمبر الف میں جواب آگیا ہے۔

(ج) الزامِ معنوی کی تشریح وہی ہے جو قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے فرمائی ہے کہ ''شریعت امر محکوم بہ کو محکوم علیہ پر لازم تسلیم کرلیتی ہے، مثلاً قاضی نے ہندہ کا نکاح زید سے فسخ کردیا تو شریعت یہ تسلیم کرلے گی کہ ہندہ زید کی بیوی نہیں رہی، اسی طرح زید نے بکر پر ایک ہزار روپیہ کا دعویٰ کیا، بکر نے انکار کیا، شہادتوں سے زید کا دعویٰ صحیح ثابت ہوا، قاضی نے ایک ہزار روپیہ بکر کے ذمہ واجب الاداء قرار دیتے ہوئے اسے اس دین کی ادائیگی کا حکم دیا، ایسی صورت میں شریعت ایک ہزار روپیہ کی ادائیگی بکر کے ذمہ لازم تسلیم کرلے گی، اسی طرح قاضی کے سامنے یہ دعویٰ آیا کہ زید نے عمر کو قتل کردیا قاضی کے نزدیک زید کا قاتل ہونا ثابت ہوگیا اور اس نے قصاص کا حکم دے دیا، اب شریعت زید کو واجب القتل تسلیم کرلے گی۔ غرض یہ کہ حکم شریعت کی وجہ سے کسی شئ کا لازم قرار پاجانا الزام معنوی ہے، قاضی کے حکم کی تعریف میں جو الزام مذکور ہے اس سے مراد الزام معنوی ہے الزام حسی نہیں۔ (اسلامی عدالت ۱/ ۱٦۷)

قال القرافی: حقیقة الحکم انشاء الزام او اطلاق فالالزام کما اذا حکم بلزوم الصداق او النفقة او الشفعة ونحو ذلك فالحکم بالالزام هو الحکم، واما الزام الحس من الترسیم والحبس فلیس بحکم لان الحاکم قد یعجز عن ذلك وقدیکون الحکم ایضا بعدم الالزام وذلك اذا کان ماحکم به هو عدم الالزام ...... الخ (معین الحکام ۷)

''الزام معنوی'' کی حقیقت سمجھنے کے لیے فقہ کے ایک دوسرے مسئلہ کو پیشِ نظر

رکھنا مفید ہوگا، نکاح میں ولی کو صغیر یا صغیرہ پر ولایتِ الزام حاصل ہے جس کو ولایتِ اجبار سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ (دیکھئے: ہدایہ کتاب النکاح باب الاولیاء، اور فتح القدیر ۳/ ۲۷۶، ۲۷۷)

اس اجبار کی تشریح حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ یوں فرماتے ہیں: ومعنی الاجبار نفاذ النکاح علیہا بدون رضاہا، دون جبرھا علی النکاح. (فیض الباری ٤/ ٢٨٧)

فقہ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہاں الزام حسی مراد نہیں ہے بلکہ الزام معنوی ہی مراد ہے، احقر نے یہ نظیر صرف الزام معنوی کی حقیقت واضح کرنے کے لیے پیش کی ہے۔

(۳) جوابِ سابق میں عرض کر چکا ہوں کہ جب تمکن وقدرت حاصل ہوگی تب ہی الزام معنوی کا بھی تحقق ہوگا ورنہ نہیں؛ اس لیے کہ قضاء کی تعریف "قول ملزم یصدر عن ولایۃ عامۃ" ہے اور ولایت کا تحقق ہونے کے لیے حسبِ تصریح ابن تیمیہؒ: اما بطاعتھم لہ واما بقھرہ لھم یعنی عوام الناس کی طرف سے رضا کارانہ اطاعت یا حاکم کی طرف سے قہر وغلبہ ہونا چاہیے، اسی لیے صاحب درمختار نے باوجود لوگوں کے بیعت ہونے کے اگر اس کا حکم اس کے عجز کی وجہ سے جاری نہیں ہوتا تو صاف فرمایا: لا یصیر اماما کما مر.

مفتی کا فتویٰ ولایتِ عامہ کی بنیاد پر صادر نہیں ہوتا جب کہ قاضی کا فیصلہ ولایتِ عامہ کی بنیاد پر صادر ہوگا، اسی لیے مفتی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ حاکم یا عوام مسلمین کی طرف سے اس کو منصب افتاء پر مقرر کیا جائے اس کے بغیر بھی (اگر اس میں اہلیت ہے تو) اس کا فتویٰ دینا درست ہے جب کہ قاضی اپنے طور پر منصب قضاء پر متمکن نہیں ہوسکتا جب تک کہ حاکم یا عوام مسلمین کی طرف سے اس کو اس پر فائز نہ کیا جائے۔

(۴) اس پر تفصیلی بحث جواب نمبر ایک میں گزر چکی ہے۔

غیر مسلم حکومت اگر مسلمانوں کے مطالبہ پر کوئی مسلمان قاضی مقرر کردے اس

طرح کہ اس کو تنفیذ احکام کا اختیار ہو اور مسائل شرعیہ کے موافق فیصلہ کرنے سے روکا نہ جائے تو یہ درست ہے، اور اس پر ہمارے تمام اکابر (اصحاب دیوبند وسہارنپور وتھانہ بھون) کا اتفاق ہے، اور اگر حکومت از خود مقرر کرتی ہے اور اس پر مسلمان راضی ہیں تب بھی یہ تقرری درست ہوگی اور ولایتِ کافر علی المسلم کا الزام مسلمانوں کے مطالبہ یا تراضی کے بعد باقی نہیں رہے گا۔

(ب) و (ج) کا جواب شروع میں آچکا ہے۔

(۵) قوتِ قاہرہ کے بغیر بھی عوام مسلمین کی طرف سے رضا کارانہ اطاعت کی صورت میں قاضی کی صورت ممکن ہے۔ کما مر. اور جماعت مسلمین کی جو تفصیلات "الحیلة الناجزة" میں مذکور ہیں اس پر تو آج کل شرعی پنچایتوں میں بھی عمل نہیں ہوتا۔

(۶) جواب/۵ میں مذکورہ صورت میں وہ تعدد جو موجب خلفشار ہو، نہیں ہوگا؛ ورنہ ضرور خلفشار ہوگا انتشار ہوگا اور ایسا کہ نوبت آپسی قتال کی آوے گی۔ اعاذنا اللّٰہ تعالیٰ من الشقاق والقتال واللّٰہ الھادی الی سواء السبیل، فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم، ان کان صوابا فمن اللّٰہ تعالیٰ وان کان غیر ذلك فمني ومن الشیطان.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ربیع الآخر ۱۴۱۲ھ

ہندوستان کے حالاتِ حاضرہ میں مساجد کی حفاظت، فرقہ وارانہ فسادات میں تحمل یا مقابلہ، ووٹ اور بیمہ کے شرعی احکام

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ کرام مندرجۂ ذیل مسائل وسوالات کے بارے میں:

فرقہ پرست: ہمارے ملک ہندوستان میں آج کل فرقہ وارانہ فسادات نہایت

منظّم سازشوں کے تحت ملک کے ہر حصہ میں عام طور؛ پر نیز اقتصادیات سے مضبوط مسلمانوں کے علاقہ میں خاص طور پر کرائے جارہے ہیں، غیر مسلم فرقہ پرست تنظیمیں محض مسلم دشمنی کی بناء پر دن رات سرگرداں مسلمانوں کے درپئے آزار ہیں، خواہ کسی کا آپس کے لین دین کا جھگڑا ہو یا جواری شرابی کا ہو، غیر مسلم عوام کا پولس کے ساتھ ٹکراؤ ہو، ہر صورت میں جھگڑے کا رخ آناً فاناً عام مسلمانوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور بلا امتیاز ہر اس شخص کو جو مسلمان کہلاتا ہو ہر طرح کا جانی، مالی نقصان پہونچانا دھرم کا کام سمجھا جارہا ہے، دکانیں لوٹ کر آگ لگادی جاتی ہے اور جو مسلمان نرغے میں آجائے بلا تأمل قتل کردیا جاتا ہے، مساجد اور مقابر کا انہدام اور بے حرمتی کرنے کو ''کرتوے کا پالن'' (فرض کی ادائیگی) تصور کیا جارہا ہے، جگہ جگہ دیواروں اور سڑکوں پر جلی حروف میں اشتعال انگیز اور ذلت آمیز نعرے لکھ کر فخر محسوس کیا جارہا ہے، جلسہ جلوسوں میں مسلمانوں کی غیرت کو للکارا جاتا ہے بسوں اور ٹرینوں میں دل خراش فقرے کسے جاتے ہیں، جیسے ہندی و ہندو و ہندوستان، مسلمان جائیں پاکستان یا قبرستان۔ ہندوستان میں رہنا ہوگا تو وندے ماترم کہنا ہوگا۔

ہفت روزہ نئی دنیا اخبار ۱۹ تا ۲۶/ اکتوبر میں وشو ہندو پریشد کے صدر کا انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے زہر افشانی کرتے ہوئے لبوں کو حرکت دی ''ہندوستان کی کسی بھی مسجد کو کھودو تو ایک مندر ملے گا'' نیز ''ہندوستان میں اگر عزت دینا ہوگا تو سب سے پہلے ہندو دھرم کو عزت دینا ہوگا، بعد میں ہم کسی کی عزت کریں گے''۔

نئی دنیا کے اگلے شمارہ میں (۲۷ تا ۲/ نومبر) رام جنم بھومی مکتی سمیتی کے صدر نے کہا کہ ''رام مندر کا مرکزی مقام اس جگہ پر ہوگا جہاں رام مورتی رکھی ہے''۔

واضح ہو کہ یہ مورتی بابری مسجد کے منبر پر رکھی ہوئی ہے، ملک کی ایک زیریں

عدالت کے ایماء پر ۱۹۸۲ء میں بابری مسجد کو مندر کے روپ میں تبدیل کر دیا تھا اور کھلم کھلا پوجا پاٹھ جاری ہے، مزید یہ کہ بابری مسجد کو منہدم کر کے رام مندر تعمیر کرنے کا منصوبہ علانیہ طور پر بنایا گیا ہے، ریڈیو بی بی سی نے بھی اپنے ایک نشریہ میں اس کی تصدیق کی ہے، اخبارات میں اعلانات شائع ہو رہے ہیں کہ ۹/ نومبر کو رام مندر کا سنگِ بنیاد رکھنے کے نام پر اس غیر قانونی کارروائی کو عملی جامہ پہنایا جائے گا جس کی رو سے بابری مسجد اور اس کے بعد نہ جانے کتنی مساجد کو منہدم کرنے کا منصوبہ ہے۔

۵/ اکتوبر گجراتی روزنامہ سندیش میں بھی اس قسم کی دھمکی دی گئی ہے کہ ۹/ نومبر سے پہلے پہلے ہم کو بنیاد رکھنے کے لیے جگہ خالی نہ دی گئی تو ہم اپنی جدوجہد شروع کر دیں گے ہندوستان کو ہندوراشٹر کے نام سے پکارا جانے لگا ہے، اور دلی ریلوے اسٹیشن پر ایک بورڈ آویزاں کیا گیا ہے جس کے اوپر تحریر ہے ''ہندوراشٹر کی راجدھانی دلی میں آپ کا ہاردک سواگت''۔

پولیس: پولیس کی موجودگی میں فسادات کے دوران لوٹ مار، قتل وغارت گری کا بازار پوری طرح گرم رہتا ہے، مسلم علاقوں میں کرفیو نافذ کر کے فسادی طبقہ کو من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ دی جاتی ہے؛ بلکہ بعض اوقات پولس خود لوٹ مار اور مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر اذیت رسانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے ۱۹۸۷ء میں ہاشم پورہ ملیانہ (میرٹھ) کا نہایت اندوہناک لرزہ خیز اور ظلم تشدد کی زندہ مثال ہے، جس میں پی اے سی کے بہادر جوانوں نے شب خون مار کر بہت سے بے گناہ مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنا کر نہر میں ڈال دیا تھا، پالن پور گجرات کے حالیہ فساد میں پولس کی موجودگی میں بلکہ پولس کی سرپرستی میں آتش زنی کرتے ہوئے راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے،

فسادی لوگ چابک دستی سے تخریب کاری میں مشغول تھے، اور شہر کے رکھوالے فسادیوں کو روکنے کی بجائے راستہ روک کر کھڑے ہوئے تھے اور نہایت ہوش یاری سے لوگوں کو پہچان کر جانے کی اجازت دے رہے تھے کہ کہیں اچانک آ کر کوئی فسادیوں پر حملہ نہ کر دے، دکانیں جل رہی تھیں؛ لیکن پولس کا دھیان دوسری جانب تھا، آگ لگنے سے پہلے ہی دو پولس والے بس اسٹینڈ کی چھت پر چڑھ کر تماشہ دیکھ رہے تھے، پولس اگر دھیان دیتی تو آگ بجھانے والے عملہ کو بلا کر کروڑوں روپیہ کے ہونے والے نقصان کو بچا سکتی تھی۔

عدلیہ: عدالت نے مطلقہ عورت کے ساتھ ہمدردی جتا کر مسلمانوں کے ساتھ جس بے دردی کا ثبوت دیا ہے محتاجِ بیان نہیں، بابری مسجد رام جنم بھومی کا تنازعہ جس کے نتیجہ میں آج پورا ملک آگ اور خون کے سمندر میں ڈوب چکا ہے ملک کی ایک عدالت ہی کی کرم فرمائیوں کا ثمرہ ہے، طویل عرصہ سے عدالت میں تصفیہ طلب کیس کو پسِ پشت ڈال کر جس کے بارے میں مسلمان چیخ چیخ کر تھک گئے ہیں کہ ”بابری مسجد تنازعہ کو دستاویز کی بنیاد پر طے کر دیا جائے، مسلمان عدالت کے فیصلہ کا احترام کریں گے“ تاہم عدالت نے ۱۹۸۲ء میں غیر مسلم فرقہ پرستوں کے لیے تالا کھولنے کی اجازت دے کر مسلمانوں کو انصاف سے محروم کر دیا، حال میں بھی جب کہ غیر قانونی طور پر رام مندر کے سیلا یانس کے خلاف اسٹے آرڈر حاصل کرنا چاہا تو ہائی کورٹ نے صاف انکار کر دیا۔

حکومت: حکومت نہ صرف یہ کہ فرقہ پرستوں کے خلاف قدم نہیں اٹھاتی بلکہ پولیس کی طرف سے کیے جانے والے مظالم وتشدد کا بھی سد باب نہیں کرتی، ہاشم پورہ ملیانہ (میرٹھ) میں پولس کے ذریعہ کیے جانے والے قتل عام کی تحقیقات کمیٹی گیان پرکاش کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں پی اے سی قصوروار ثابت ہو چکی ہے؛ لیکن کسی کے خلاف

کوئی قانونی کاروائی نہیں کی گئی اور کمیشن کی رپورٹ کو بھی شائع نہیں کیا گیا۔

البتہ مسٹر راجیو گاندھی نے اتنا احسان مسلمانوں پر ضرور کیا کہ کامن سول کوڈ بل پیش کر کے مسلم برادران وطن کو خبردار کر دیا کہ میری ذہنیت بھی ملک کے ان فرقہ پرستوں سے مختلف نہیں ہے جو ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانا چاہتے ہیں، اور اگر ہے! تو کیا دلی ریلوے اسٹیشن پر لٹکنے والا بورڈ جس میں دلی کو ہندو راشٹر کی راجدھانی لکھا گیا ہے راجیو جی کو نظر نہیں آیا؟ گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش، یوپی و بہار میں رام شیلا پوجن کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات، بابری مسجد کی طرف سے برتی جانے والی سرد مہری کیا ہندوستان کے دستور اساسی کے مطابق ہیں؟

مسلمانوں کے مسائل: (۱) موجودہ حالات میں جب کہ ہر طرف سے مسلمانوں کے اوپر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں، مسلمان انصاف اور حکومت کی حفاظت سے محروم ہو چکا ہے، اپنی جان، مال، عزت، آبرو اور مساجد وغیرہ کی حفاظت کے لیے کیا صورت اختیار کرے بالخصوص بابری مسجد کی حفاظت چونکہ صرف بابری مسجد تک ہی یہ نوعیت محدود نہیں ہے، متھرا کی عیدگاہ اور اس کے بعد بال ٹھاکرے کے الفاظ ہندوستان کی جس مسجد کو بھی کھودو تو ایک مندر ملے گا قابل غور ہیں۔

(۲) ایسے حالات میں تحمل و برداشت کرنا صبر کہلائے گا یا بزدلی؟

(۳) ہندوستان کی موجودہ سیاسی پارٹیوں میں سے کوئی بھی پارٹی مسلمانوں کی خیر خواہ ثابت نہیں ہوئی؛ لہذا کسی ایک پارٹی کو جو نسبتاً اچھی ہو ووٹ دینا ضروری ہے؟ کیا ووٹ دینے اور نہ دینے میں کچھ گناہ ہے؟

(۴) فساد بھڑک جانے کے ڈر سے یا بھڑک جانے کے بعد مسلمانوں میں سے

اگر کوئی جان بچا کر بھاگے تو گنہ گار ہوں گے یا نہیں؟

(۵) مسلمانوں کو درپیش حالات میں جب کہ تمام بیمہ کمپنیاں غیر مسلموں کی ہیں اور نقصان ہوجانے کے نتیجہ میں بیمہ کمپنیوں کو دینا پڑے گا تو ممکن ہے آتش زنی جیسی وارداتوں میں کچھ کمی واقع ہوجائے؛ لہٰذا اسکیم اختیار کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) اپنی جان و مال اور عزت و آبرو؛ نیز مساجد وغیرہ کی حفاظت وصیانت سب پر ضروری ہے، اور اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے جو مفید اور کارگر معلوم ہو، ظاہر ہے کہ اس باب میں کسی متعین طریقِ کار کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بالیقین یہ کارگر اور مفید ہے، کسی ایک طریقِ کار کے متعلق اگر کسی فرد یا جماعت کو غلبۂ ظن حاصل ہے کہ یہ مفید ہے تو اس کے اختیار کرنے کی وہ پابند ہے، اور اس پر کاربند ہونے کی صورت میں مستحق اجر بھی، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ مسلمانوں کی دوسری جماعتیں بھی اس طریقِ کار کو مفید اور کارگر ہونے کا یقین رکھیں، جو جماعت اس طریقِ کار پر یقین نہیں رکھتی وہ اگر اس میں شریک نہ ہو تو اسے نہ مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے ملامت کی جاسکتی ہے۔

آزادئ ملک سے پہلے ایک زمانہ میں لاہور کی مسجد شہید گنج کا مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا تھا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ (مفتئ اعظم ہند) کے مجموعہ فتاوی میں کئی فتاوی موجود ہیں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:

(۱) اس سوال کا تو ایک ہی جواب ہے کہ مسجد قیامت تک مسجد ہے اور مسلمانوں کو اپنی استطاعت کے موافق اس کی تحصیل کے لیے کوشش کرنا چاہیے اور استطاعت کے مدارج مختلف ہیں۔ (کفایت المفتی ۲۸۲/۹، ۲۸۳)

(۲) مسجد کی واگذار کے لیے جدوجہد کرنا اور قابل عمل متحدہ نتیجہ بخش ذرائع سے اسے واگذاری کرانا مسلمانوں کا مذہبی اور شرعی وظیفہ ہے۔ (ایضاً ۹/ ۲۸۵)

(۳) مسجد کی واپسی کے ذرائع اور جدوجہد کے متعلق میں صرف اسی قدر عرض کرسکتا ہوں کہ جو افراد اور جماعتیں خلوص کے ساتھ مسجد کی واگذاری کے لیے سعی کریں گی وہ عنداللہ ماجور ہوں گی، بظاہر اسبابِ کامیابی کی سبیل ایک ہی ہے کہ مسلمان متحد ہوکر کام کریں جب تک آپس میں نفاق وشقاق اور ایک دوسرے پر سب وشتم کا سلسلہ جاری ہے کامیابی مشکل ہے۔ (ایضاً ۹/ ۲۸۰)

(۴) مسجد شہید گنج کی واپسی کے سلسلہ میں آئینی طریق پر حصہ لینا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے یہ صورت بھی (ایک مخصوص صورت جس کا سوال میں تذکرہ ہے۔ احمد) بسا اوقات اختیار کرنی ہوتی ہے اس کے لیے رہبر ورہنما موقعہ شناسی سے حکم دیتا ہے، اور اس کا اتباع کرنا ہی اصلح وانفع ہوتا ہے۔ (ایضاً ۹/ ۲۸۰)

(۵) اگر مسلم لیگ کوئی ایسا ذریعہ تجویز کرے کہ اس میں قید وبند یا جان جاتے رہنے کا بھی خطرہ ہو اور وہ اسے حصول مسجد کے لیے بظن غالب یا بدرجۂ یقین مفید سمجھے تو مسلم لیگ کی اس رائے سے اتفاق رکھنے والوں کے لیے اس پر عمل کرنا جائز اور ان کے لیے موجبِ اجر ہوگا، اور اگر اس سلسلہ میں وہ مرجائیں گے تو شہید ہوں گے؛ لیکن انہیں یہ حق نہ ہوگا کہ جو مسلمان اس ذریعہ کو حصولِ مسجد کے لیے مفید نہیں سمجھتے تو ان کو بھی شرکت پر مجبور کریں یا عدم شرکت کی بنا پر لعن طعن کریں۔ (ایضاً ۹/ ۲۸۳)

شیخ المشائخ امام ربانی حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ سے بھی اس نوع کا ایک سوال کیا گیا تھا فتاویٰ رشیدیہ سے پورا سوال جواب پیش کرتا ہوں:

سوال: یہاں چارکوس پر ایک موضع میں ایک مسجد خام کہنہ ہے، اس کو ایک کافر شہید کرا کر بت خانہ بنوانا چاہتا ہے تو حضور مسلمانوں پر اس کا روکنا فرض ہے یا نہیں؟ مستحب ہے؟ اور اس کافر کا مقابلہ کرنا یا اس میں لڑکر شہید ہو جانا فرض ہے یا مستحب؟ غرض یہ ہے کہ کس درجہ مسلمان اس کافر خبیث ظالم کا مقابلہ کریں؟

الجواب: اس مسجد کی صیانت سب مسلمانوں پر فرض ہے مگر لڑنا، مرنا ہرگز درست نہیں ہے، حسبِ قاعدہ سرکاری طور سے سرکار کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ (فتاوی رشیدیہ قدیم ۲۰/۳)

(۲) عدمِ استطاعت کی حدتک پہنچ جانے کے بعد خاموش رہنے کی رخصت ہے اور عدم استطاعت کی حدتک مسئلہ پہنچا یا نہیں؟ اس میں اختلافِ رائے ممکن ہے اور اختلافِ رائے پر طرقِ عمل کا اختلاف بھی لازم ہے۔ (کفایت المفتی ۲۸۳/۹)

(۳) جس شخص کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ صحیح خدمت کرے گا، نفع پہونچائے گا، حقوق دلوائے گا، ظلم کو روکے گا اس کو ووٹ دیا جائے، جس پارٹی کے متعلق یہ توقع ہو اس پارٹی کو ووٹ دیا جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۶۷/۵)

اگر نفع ہو یعنی دین کی، قوم کی، ملک کی صحیح خدمت مظنون ہو تو درست ہے۔ (ایضاً ۳۴۱/۵)

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: اگر مسلمانوں کے ووٹ سے کسی سیاسی مجلس کا انتخاب کیا جائے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ امور سیاسیہ میں جو شخص ماہر اور مسلمانوں کا خیر خواہ اور ان کے حقوق کی حفاظت کا اہل ہو اس کو ووٹ دیں۔ (کفایت المفتی ۳۷۴/۹)

فقہ کا قاعدہ ہے: "لو کان احدهما اعظم ضررا من الآخر فان الاشد یزال بالاخف". (الاشباہ والنظائر ۸۸) نیز "اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهماضررا بارتکاب اخفهما" (ایضاً ۸۹)

اگر مسلمانوں کے ووٹ نہ دینے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ وہ پارٹی برسر اقتدار آجائے گی جو مسلمانوں کے لیے زیادہ مضر اور نقصان دہ ہے تو مسلمانوں کے چاہیے کہ اس کے ضرر کو دور کرنے کی نیت سے دوسری پارٹی کو ووٹ دیں۔

(۴) فرقہ وارانہ فسادات میں بلوائیوں کا حملہ اگر چہ باقاعدہ جہاد نہیں ہے؛ لیکن مسلمانوں کی غیرت اجازت نہیں دیتی کہ وہ مقابلہ سے کنارہ کشی اختیار کریں بلکہ اگر بلوائی دوچند یا اس سے کم ہیں اور مسلمانوں کے پاس ہتھیار بھی ہیں تو ہرگز نہ بھاگیں مقابلہ کریں اور اگر بلوائی دوچند سے بھی زیادہ ہیں یا مسلمانوں کے پاس ہتھیار نہیں ہیں تو جان بچانے کی تدبیر اختیار کریں خواہ مقابلہ کرکے ہو یا دوسری صورت سے ہو۔ ان کان عدد المسلمین نصف عدد المشرکین…… الخ فتاویٰ عالمگیری ۲/ ۱۹۳ (فتاویٰ محمودیہ ۵/۱۶۱)

(۵) بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی، یہ دونوں چیزیں شرعاً ممنوع ہیں؛ اس لیے بیمہ بھی ممنوع ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بغیر بیمہ کرائے جان و مال کی حفاظت ہی نہ ہوسکتی ہو یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرانا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۲۴۰)

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے فتاویٰ رحیمیہ ۶/۱۳۲ تا ۱۳۵ کا مطالعہ بھی فرمالیں۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔ کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۶/ ربیع الآخر ۱۴۱۰ھ

مسلمانوں پر ظلم کے وقت متحد ہو کر آئینی کارروائی کرنا ہی حل ہے

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین مسائل ذیل کے بارے میں کہ:

(۱) ایسا جمہوری ملک جس میں غیر مسلموں کی حکومت ہو اور اس میں مسلمان

ایک بڑی اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہوں، اور بنیادی وقانونی طور پر مسلمانوں کی دیگر اہل مذاہب کی طرح کھلے طور پر اپنے مذہب پر چلنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کرنے کا بھی حق حاصل ہو؛ لیکن عملی اعتبار سے اس ملک کے غیر مسلموں کی اکثریت نے اس کے خلاف عمل شروع کر دیا ہو، اور یقینی طور پر حکومت (یا اکثر عہدہ داران اور حاکمانِ وقت نے بھی) ان کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہو؛ بلکہ در پردہ ان کا تعاون بھی کیا ہو، اور ان کو واضح اور پختہ ثبوتِ جرائم مل جانے کے باوجود بھی کوئی بھاری سبق آموز سزا نہ دی ہو، اور اس طرح کی ناپاک سازشوں کا سیکڑوں بار سیکڑوں شہروں اور قصبات ودیہات میں مشاہدہ کیا جا چکا ہے، تو کیا ایسی نازک صورت میں بھی مسلمان خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہیں اور کیا صرف حکومت سے احتجاج اور مطالبات کر کے (جن کی حیثیت پاگل کی بڑ سے زیادہ نہیں) یا چند کاغذی تجاویز اور میمورنڈم پیش کر کے رہنمایانِ اسلام وقائدینِ ملت وملک اپنے فریضہ سے عند اللہ سبک دوش ہو سکتے ہیں؟ مذہبِ اسلام ان حالات میں مسلمانوں کی مکمل رہنمائی کرتا ہے یا نہیں؟ اور وہ رہنمائی کیا ہے؟

یکجا ہو کر رہنمائی کرنے کا مطلب

(۲) اگر کسی جمہوری ملک میں مسلم وغیر مسلم اقوام کے درمیان کسی بھی امر میں فساد کا امکان ہو بلکہ فسادات شروع ہو چکے ہوں، اور ہزاروں مسلمان شہید (یا قتل) کر دیے گئے ہوں، بہت سی مسجدیں جلا دی گئی ہوں، اور بعض مقامات پر مسجد کے مؤذن (بانگی) اور امام کو بھی شہید (یا قتل) کر دیا گیا ہو، اور تبلیغی جماعت کے خالص دینی مسافروں کو مسجد میں زندہ جلایا گیا ہو، اور نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا ہو؛ بلکہ ایک ایک لڑکی سے اس کے تمام چھوٹے بڑوں کے سامنے حکومت کے پانچ

پانچ اور چھ چھ نوجوانوں نے زنا بالجبر کیا ہو، اور صرف مسلمانوں کی سیکڑوں دکانیں جلا کر راکھ کردی گئی ہوں، تو کیا ایسے اختلافی امر میں علمائے حق کا فوری طور پر یکجا ہوکر مسلمانوں کی امداد اور رہنمائی کرنا عندالشرع فرض ہے یا نہیں؟

بابری مسجد کے متنازعہ مسئلہ میں مسلمانوں کا ردعمل

(۳) ملکِ ہندوستان میں جو بابری مسجد کا متنازعہ مسئلہ تقریباً دوسال سے تشدد اختیار کر چکا ہے، کیا اس کے بارے میں تاہنوز (۲۸/نومبر ۱۹۹۰ء) علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین نے کوئی متفقہ دوٹوک فیصلہ اور شرعی فتویٰ علی الاعلان مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کیا ہے کہ آیا بابری مسجد توڑ کر مندر بنانے دیا جائے، اور مسلمان اس معاملے میں اپنی جان ومال اور عزت وآبرو تباہ وبرباد نہ کریں؟ یا یہ کہ بابری مسجد توڑ کر ہرگز مندر نہ بننے دیں چاہے مسلمانوں کو ہر قسم کی قربانی دینی پڑے، اگر یہ شرعی فتویٰ شائع ہوچکا ہو تو براہِ کرم اس کو فوری طور پر ہمارے مذکورہ بالا پتہ پر ارسال فرمادیں، اور اگر ابھی تک یہ فتویٰ شائع ہی نہیں ہوا ہو تو شائع فرمادیں یا ہمیں لکھیں، ان شاء اللہ ہم اسے شائع کردیں گے، اور اگر اس کا جواب کسی مصلحت شرعی یا مجبوریٔ دین کی وجہ سے نہیں دیا جاسکتا تو اس شرعی مصلحت یا دینی مجبوری کو واضح طور پر مدلل تحریر فرمائیں۔

حکومت کے ہمنوا عہدے داروں سے بائیکاٹ کا حکم

(۴) جو مسلمان بالخصوص علماءِ اسلام کسی اسلام ومسلمان دشمن حکومت کے ایم ایل اے ہوں، یا ایم پی ہوں، یا حکومت میں ان کو کوئی مقام حاصل ہو، انھیں ہر ایسی حکومت سے بائیکاٹ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کوئی عالمِ دین یا مسلمان ایسی ظالم وبے انصاف حکومت سے اپنا تعلق ختم نہیں کرتا بلکہ کرسی اور عہدہ کی لالچ میں حکومت سے چمٹا

ہوا رہتا ہے، اور مسلمانوں کی قتل وغارت گری اور تباہی و بربادی و بے عزتی کا آئے دن مشاہدہ کرتا رہتا ہے، تو کیا ایسے عالمِ دین یا مسلمان کا اہل اسلام بائیکاٹ کر سکتے ہیں؟ اور کیا ان عہدہ داروں کو حکومت سے بائیکاٹ کرنے پر مجبور کرنا از روئے شرع درست ہوگا؟

نصرتِ خداوندی کب حاصل ہوتی ہے

(۵) کیا قرآن وحدیث میں کہیں یہ لکھا ہوا ہے کہ جب مسلمان اکثریت میں ہوں گے تب تو اللہ ان کی مدد کرے گا، اور اگر کم ہوں گے تو اقلیت کی وجہ سے ان کی مدد نہیں کرے گا؟ یا اس کے برخلاف لکھا ہے کہ تمھاری کثرت تمھیں دھوکہ میں نہ ڈال دے، کیا اس سلسلہ میں جنگِ بدر اور جنگِ احد سے کچھ مفہوم ہوتا ہے؟ اگر قلت وکثرت پر اللہ کی مدد کا انحصار نہیں تو پھر وہ کون سی چیز ہے جس پر اللہ نے مسلمانوں کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے؟

(۶) اگر ایمان پر اللہ کی مدد کا وعدہ ہے تو الحمد للہ لاکھوں ایمان والے موجود ہیں کیوں کہ حدیث پاک میں وضاحت موجود ہے کہ جس میں ننانوے علامتیں کفر کی ہوں اور ایک علامت ایمان کی ہو اس کو مومن ہی کہو (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) تو پھر ہمت کر کے مومنوں کو ظالم، کفار و بے انصاف حکومت کا مقابلہ کرنا چاہیے، بھلے ہی اس مقابلہ کا نام جہاد نہ ہو مدافعت اور حفاظت ہی ہو۔

اور اگر صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال بھی ہوں تو اللہ کی مدد کا وعدہ ہے، تو الحمد للہ ایمان اور نیک اعمال کرنے والے بھی اس زمانے میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں، انھیں کو ظالم، کفار کا مقابلہ کرنا چاہیے، اگر یہ باتیں سچ اور حق ہیں تو پھر ڈر اور خوف کس بات کا ہے؟ بزدلی کیسی ہے؟ غالبًا یہ بھی سچ ہوگا بلکہ بلاشک سچ اور حق ہے کہ ایک دل میں دو خوف جمع نہیں ہو سکتے تو پھر مسلم رہنما یہ کہہ کر مزید مسلمانوں کو بزدل

بنادیں کہ بھائی ہم لوگ ہندوستان میں بہت تھوڑے ہیں، ہم کر بھی کیا سکتے ہیں، تو کیا مسلم رہنماؤں کا یہ جواب صحیح ہوگا؟ کیا مسلمان زیادہ ہوتے تو بغیر اللہ کی مدد کے کامیاب ہوجاتے اور کم ہیں تو کیا ہلاک ہوکر ہی رہیں گے کچھ بھی ہو نہیں سکتا؟ کیا ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کی ۳۵/ سالہ مصلحتِ غیر شرعی اور نازیبا خاموشی سے مسلمان قتل و غارت گری سے ذبح کیے گئے اور کیا کوئی اس کی ضمانت لے سکتا ہے کہ آئندہ بھی یہ غیر شرعی مصلحت اور مطلبی خاموشی مسلمانوں کے جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا سبب بنے گی؟ مفصل اور مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

کفار سے جنگ کرنے کے لیے ولی کامل ہونا شرط نہیں

(۷) کیا قرآن وحدیث میں کہیں یہ پابندی عائد کی گئی ہے کہ جب تک تم پورے ولی کامل نہ بن جاؤ اس وقت تک ظالم، کفار سے جنگ مت لڑنا، چاہے تمھارا جو بھی حشر ہوجائے؟

اسباب اختیار کرنا ضروری ہے، ''قدم جمانے'' کا مطلب

(۸) کیا قرآن میں یا احادیث میں یہ کہیں لکھا ہے کہ تمھارے تمام مسائل صرف فضائل سے حل ہو سکتے ہیں، تمھارے کام صرف عبادت، نماز، تسبیح، ذکر، تہجد، تبلیغ دین سے بن جائیں گے، ان فضائل وعبادات، نماز، تسبیح، تبلیغ کے علاوہ کوئی بھی مادی سبب اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، نماز سے رزق میں وسعت ہوتی ہے، کمانے، محنت مزدوری، کام کاج کرنے کی ضرورت نہیں، اشراق کی دو رکعت نماز سے مقبول حج اور عمرہ کا ثواب مل جاتا ہے اب تمھیں حج فرض ہونے کے باوجود بھی حج والی محنت کی ضرورت نہیں، باقی دو رکعت اشراق سے اللہ دن بھر کے تمام کاموں کی کفایت کرے گا؛ لہٰذا اب تم آرام سے گھر

میں، مسجد میں، خانقاہ میں، مدرسہ میں بیٹھے رہنا کہیں آنا جانا مت، بھاگ دوڑ مت کرنا، کام تمھارا فرشتوں سے کرادیں گے ﴿ ان تنصروا اللّٰہ ینصرکم و یثبت اقدامکم ﴾ کے تحت تم کو کسی بھی موقع پر کسی بھی حالت میں ہتھیار اٹھانے کی، مدافعت کی دشمن کو روکنے کی ضرورت نہیں، تم تو بس دین کے کام میں لگے رہنا، اللہ فرشتوں کو بھیج کر سب ظالم، کفار کا ستیاناس کردے گا۔کیا قرآن کی آیت کا مطلب یہی ہے یا اور کچھ ہے؟ اور ہاں یہ بھی بیان فرمائیں کہ ﴿ ویثبت اقدامکم ﴾ سے کس بات کی طرف اشارہ ہے؟ قدم کب اور کہاں جمانے پڑتے ہیں؟

(۹) بڑے بڑے مصلحت پسند دانش ورصوفی صلحِ حدیبیہ کی صحیح حقیقت سمجھ سکے ہیں، آپ کچھ جانتے ہوں تو قرآن وحدیث کی روشنی میں صلحِ حدیبیہ کا صحیح موقف بیان فرمائیں؟

(۱۰) صلحِ حدیبیہ کی تو زمانی حدبندی تھی، کیا اس زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی صلحِ مطلبی کی کوئی حد زمانی ہے؟

کیا ان حالات میں بھی جہاد فرض نہیں ہوا؟

(۱۱) کیا یہ ضروری ہے کہ ہر گھر کا ایک دو فرد قتل کردیا جائے، ہر مسلمان کا گھر یا دوکان جلائی جائے، ہر گھر میں ایک دو عورتوں سے زنا بالجبر کیا جائے، ہر مسجد ہی کا مندر بنایا جائے تب ہی جہاد فرض ہوگا اس سے پہلے نہیں، سیکڑوں شہروں، قصبات، دیہات میں ہزاروں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا اور وہ سب کچھ کردیا گیا کہ جس کے بیان سے بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جیسا کہ سب کو معلوم ہو چکا ہے، تو کیا اتنا سب بھی جہاد کے لیے کافی نہیں، یا یہ ہی ضروری ہے کہ جب عالموں کو مفتیوں کو مسجد کے ائمہ کو ہی قتل کیا جانے لگے، اور خدانخواستہ ان کے ساتھ بھی وہی سب کچھ ہونے لگے

جو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے تب ہی جہاد کی فرضیت ثابت ہوگی؟

جان و مال کی حفاظت کی تدابیر

(۱۲) بالفرض اگر جہاد فی زماننا اسلام سے خارج ہو چکا ہے تو کیا لفظ جہاد کو مٹا کر اس کے متبادل کسی دوسرے نام سے اس ظلم و استبداد کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا؟ کیا کسی بھی تنظیم اور تحریک سے مظلوم مسلمانوں کی غمزدہ و ہوش ربا فریاد پر ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی کوئی شکل نہیں نکل سکتی؟

اہل و عیال و مسجد کی حفاظت میں مارا گیا شہید ہے

(۱۳) مسلمان اگر اپنے گھر اور اپنے بیوی، بچوں، ماں، باپ، بھائی، بہنوں کی حفاظت اور مدافعت میں مارا گیا تو وہ حرام موت مرا یا شہید ہے؟

(۱۴) مسلمان اگر مسجد کی حفاظت اور مسجد کو مندر نہ بنانے کے لیے مرا تو وہ حرام موت مرا یا شہید ہے؟

(۱۵) "اعمالکم عمالکم" تمھارے اعمال تمھارے حاکم ہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں مقرر، مبلغ کہتے ہیں کہ بھائیو! یہ جو پریشانیاں آ رہی ہیں یہ ہمارے برے اعمال کی سزا ہے لفظ "ہمارے" اگرچہ بولا گیا؛ لیکن اللہ جانتا ہے کہنے والوں میں اکثر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سب "تمہارے" برے اعمال کی سزا ہے، رہے ہم، تو ہم تو اولیاء اللہ میں سے ہیں، تم ہو بددین اگر یہ مان بھی لیں کہ بے شک ہر مقرر، مبلغ، صالح ہے، بزرگ ہے اور سامعین بددین ہیں تو کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ صرف اتنا کہہ کر یہ "ہمارے اعمالِ بد کی سزا ہے" چھوڑ دیا جائے، اور مسلمانوں کی مدد اور رہنمائی سے دامن بچا لیا جائے، کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کیا جا رہا ہو اس کی

ماں بہنوں اور بیٹیوں کی عزت لوٹی جارہی ہو، اس کے گھر یا دوکان کو نذرِ آتش کیا جارہا ہو، اور دین دار مسلمان یہ کہہ کر ٹال دیں کہ جانے دو مرنے دو یہ تو اس مردود بد دین کے برے اعمال کی سزا ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ ایک مسلمان کی قیمت ساتوں زمین و آسمان مل کر بھی نہیں ہو سکتے کیوں کہ زمین و آسمان اسی وقت تک باقی ہیں جب تک اللہ کا نام لینے والا روئے زمین پر باقی ہے، اگر یہ سچ ہے تو کیا ہزاروں مسلمانوں کی جان کی قیمت ایک پالتو کتے کے برابر بھی نہیں، گھر کی بھیڑ، بکری بلکہ ایک مرغی کے برابر بھی نہیں، اگر کوئی شخص ہمارے جانور کو مار ڈالے تو ہم کیا کچھ نہ کریں گے اور اگر خدانخواستہ ہمارے بیٹے کو قتل کر دے تو اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا ہے ہم کیا کر گزریں گے؛ کیوں کہ یہ جانور اور اولاد ہمارے ہیں، مرنے والے مسلمان ہمارے نہیں؛ اس لیے ہمیں کوئی احساس نہیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ مشرق میں رہنے والے مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو معلوم ہونے پر مغرب میں رہنے والے مسلمان یہ سمجھے کہ اس کے نہیں بلکہ میرے دل میں چھرا لگا ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ جس نے بلاقصور کسی کو قتل کیا گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا، اور جس نے کسی انسان کی جان بچائی گویا اس نے تمام دنیا کے انسانوں کو زندگی بخش دی؟ یہ ہمارے برے اعمال کی سزا ہے کیا اس کے ذریعہ تصویر کا ایک رخ پیش نہیں کیا جارہا ہے؟ کیا یہ ایک فراڈ اور دھوکہ نہیں ہے کیا مقرر کا یہ جملہ ساتھ ہی ساتھ قربانی سے پہلوتہی اور بزدلی کا زندہ ثبوت نہیں ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اعمال کی ترغیب گناہوں کی وعید کے ساتھ ساتھ مقررین و مبلغین کا کچھ سمجھانے بتانے کا کچھ فریضہ بھی ہے یا نہیں؟

دفاعی تنظیم کا قیام اور اس کی مخالفت کرنے والے کی سزا

(۱۶) (الف) اگر کوئی مسلمان خالص دینی جذبہ کے تحت اور مسلمانوں کی فلاح

وبہبود کے تحت تبلیغ دین کے ساتھ مسلمانوں میں ظلم وکفر کے مقابلہ میں قربانی کا جذبہ (مگر ہوش کے ساتھ) پیدا کرے اور ایک امن کمیٹی برائے مدافعت وحفاظت قائم کرے، اور اس کی قولی، فعلی، عملی محنت شروع کردے تو یہ عندالشرع محبوب ہے یا مغضوب؟

(ب) اگر عندالشرع یہ عمل محبوب ہو، اور اب اس کے خلاف کوئی مسلمان یا عالم کوئی اقدام کرے یا تو مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دے یا یہ کہ حکومت کی چمچہ گیری کی غرض سے جاسوسی کرے یا محض اپنے حسد اور کینہ کی بنیاد پر راز فاش کردے تو ایسے مسلمان کی مذہبِ اسلام میں کیا سزا تجویز کی گئی ہے؟

(ج) نیز خدانخواستہ یہ دفاعی اور حفاظتی تنظیم بنانے والا مسلمان اور اس میں کام کرنے والا کوئی مسلمان حکومت یا کسی ظالم، باغی کے ہاتھوں مارا گیا تو وہ حرام موت مرے گا یا شہید ہوگا؟

شہید کے اقسام

(۱۷) شہید کی کتنی قسمیں ہیں؟

جہاد کے اقسام

(۱۸) جہاد کی کتنی قسمیں ہیں؟ اور کن حالات میں کون سا جہاد مطلوب ہے؟ بینوا وتوجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حکومت سے آئینی کارروائی کا مطالبہ کرتے رہیں، اور حکومت کو اس خلافِ قانون اور خلافِ انسانیت ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر زور دیتے رہیں۔

یہ یاد رہے کہ کوئی بھی کارروائی اس وقت تک مؤثر ثابت نہ ہوگی جب تک کہ

تمام مسلمان آپس میں متحد ہوکر اس کو انجام نہ دیں، احتجاجات اور مطالبات بھی اگر متحد ہوکر پیش کیے جائیں تو وہ اپنا اثر ضرور دکھلا سکتے ہیں۔

(۲) یکجا ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اگر حکم شرعی ایک شخص بتلا دے تو کیا اس پر عمل نہیں کیا جاسکتا؟ نیز کیا تمام مسلمانانِ ہند بھی اس رہنمائی کو قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے یکجا ہیں؟

(۳) ملک میں شائع ہونے والی مختلف باتوں کے سلسلہ میں احقر کی معلومات محدود ہیں؛ اس لیے ایسے کسی فتویٰ کی اشاعت کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے؛ نیز جیسا کہ جواب سابق میں بتلایا جاچکا کیا شرعی فتویٰ تمام مفتیان کی طرف سے پیش ہو تب ہی وہ قابل عمل ہے ورنہ نہیں؟

بابری مسجد کا جو قضیہ درپیش ہے اسی نوع کے قضایا کے سلسلہ میں اکابر علماء کے فتاویٰ موجود ہیں اس کے دو نمونے پیش کرتا ہوں:

پہلا فتویٰ سید الطائفہ حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا ملاحظہ فرمائیے:

سوال: یہاں چار کوس پر ایک موضع میں ایک مسجد خام کہنہ ہے، اس کو ایک کافر شہید کرا کر بت خانہ بنوانا چاہتا ہے تو حضور مسلمانوں پر اس کا روکنا فرض ہے مستحب ہے؟ اور اس کافر کا مقابلہ کرنا اور یا اس میں لڑ کر شہید ہوجانا فرض ہے یا مستحب؟ غرض یہ ہے کہ کس درجہ مسلمان اس کافر خبیث ظالم کا مقابلہ کریں؟ یا خاموش رہیں، اگر مارنا اور مرنا ضروری ہے تو خاص اس موضعِ مسجد کے مسلمانوں پر ضروری ہے یا جو مسلمان کہ س قصہ کو سنیں؟

الجواب: اس مسجد کی صیانت سب مسلمانوں پر فرض ہے مگر لڑنا، مرنا ہرگز درست نہیں ہے، حسبِ قاعدہ سرکاری طور سے سرکار کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ فقط رشید احمد

عفی عنہ (فتاوی رشیدیہ قدیم ۳/۲۰)

دوسرا فتویٰ مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ کا ہے جو لاہور کی ایک مسجد شہید گنج نامی کے سلسلہ میں دیا گیا تھا، اس مسجد پر سکھوں نے قبضہ کر لیا تھا، اور اس کو گرودوارہ بنانا چاہتے تھے، انگریز حکومت میں مقدمہ چلا اور سکھوں کے حق میں فیصلہ ہو کر حکومت کی بندوقوں اور سنگینوں کی حمایت میں سکھوں کو مسجد منہدم کرنے کا موقعہ فراہم کیا گیا، اور اس کی جگہ گرودوارہ بنایا گیا، اس مسجد کی واپسی کے لیے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد شہید اور زخمی ہوئی اور مالی نقصان بھی بے اندازہ برداشت کیا، اس زمانہ میں یہ مسئلہ آج کی بابری مسجد کی طرح موضوع بحث ونزاع بنا رہا، حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے فتاوی مسمیٰ "کفایت المفتی" کی جلد نہم میں مستقل ایک فصل اس مسئلہ پر از ۹/۲۷۸ تا ۹/۲۸۷ دیکھی جا سکتی ہے، اس کا مطالعہ ایک طالبِ حق کے لیے سرمۂ بصیرت ثابت ہو سکتا ہے، اس میں سے کچھ باتیں نقل کرتا ہوں:

(یہاں پر یہ بات بھی یاد رہے کہ اس کے بعد ملک آزاد ہوا، تقسیم ملک کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا، اور شہر لاہور اپنی اس مسجدِ شہید گنج کے ساتھ پاکستان کا ایک حصہ بنا؛ لیکن اب بھی اس جگہ گرودوارہ ہی ہے مسجد نہیں)۔

"مسجد شہید گنج کی واپسی کے سلسلہ میں آئینی طریق پر حصہ لینا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے" (۹/۲۸۰)

"جو افراد اور جماعتیں خلوص کے ساتھ مسجد کی واگزاری کے لیے سعی کریں گی وہ عنداللہ ماجور ہوں گی" (۹/۲۸۰)

ایک صاحب نے اسی سلسلہ میں ایک تفصیلی استفتاء حضرت مفتیٔ اعظم سے

دریافت فرمایا جس میں کئی سوالات ہیں۔ میں صرف جوابات کے نقل پر اکتفاء کرتا ہوں، جی تو چاہتا تھا کہ سوالات بھی نقل کرتا؛ لیکن طوالت کے خوف سے اس کو چھوڑ رہا ہوں:

(۱) مسجد قیامت تک مسجد ہے اور مسلمانوں کو اپنی استطاعت کے موافق اس کی تحصیل کے لیے کوشش کرنی چاہیے، اور استطاعت کے مدارج مختلف ہیں، قانونی استطاعت تو تقریباً ختم ہو چکی ہے، اگر پریوی کونسل میں مقدمہ جاسکتا ہو یا فیڈرل کورٹ میں سماعت ہوسکتی ہو تو اسے بھی ختم کرلینا چاہیے۔ (یعنی یہ کوشش بھی کرگزرنی چاہیے)

(۲) مسلمانوں نے مسجدِ شہید گنج کے لیے گزشتہ زمانہ میں جو قربانیاں دی ہیں، وہ بقدر اپنی نیت وخلوص کے اجر وثواب کے مستحق ہیں، جو مرگئے وہ شہید ہوئے اور جو زخمی ہوئے وہ بھی ماجور ہوں گے، اور ہر ایک کو اپنے خلوص کے موافق ثواب ملے گا۔

(۳) مجلسِ احرار، اتحاد ملت اگر اپنے غلبۂ ظن یا یقین کی بناء پر کہ اس ذریعہ سے مسجد حاصل ہوسکتی ہے، سول نافرمانی کررہی ہیں تو وہ مستحقِ اجر ہوں گی، اور جمعیتِ علماء ہر اس شخص کو جو اس یقین کا حامل ہو سول نافرمانی کرنے میں حق بجانب سمجھتی ہے مگر یہ لازم نہیں کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں اس بات کا یقین کرنے میں بھی شریک ہوں جو جماعت کہ اس ذریعہ سے حصول مسجد کا یقین نہیں رکھتی وہ اگر عمل میں شریک نہ ہو تو اسے نہ مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے ملامت کی جاسکتی ہے۔

(۴) مسجد کے حصول کا قانونی راستہ تو بظاہر بند ہے اور سول نافرمانی کا راستہ موجبِ تیقن نہیں، باہمی افہام وتفہیم کا راستہ مفید ہوسکتا ہے، اگر اس کے لیے کوئی معقول جدوجہد کی جائے اور جب ہر طرح استطاعت سے باہر ہوجائے تو اس وقت شریعتِ مقدسہ کا فرمان ”کہ وسعت سے باہر کا مرتبہ تکلیف کے دائرہ سے باہر ہے“ صاف وصریح موجود ہے۔

(۵) ہاں اگر مسلم لیگ کوئی ایسا ذریعہ تجویز کرے کہ اس میں قید و بند یا جان جاتے رہنے کا بھی خطرہ ہو، اور وہ اسے حصول مسجد کے لیے بظن غالب یا بدرجۂ یقین مفید سمجھے تو مسلم لیگ کی اس رائے سے اتفاق رکھنے والوں کے لیے اس پر عمل کرنا جائز اور ان کے لیے موجبِ اجر ہوگا، اور اگر اس سلسلہ میں وہ مر جائیں گے تو شہید ہوں گے؛ لیکن انہیں یہ حق نہ ہوگا کہ جو مسلمان اس ذریعہ کو حصولِ مسجد کے لیے مفید نہیں سمجھتے تو ان کو بھی شرکت پر مجبور کریں یا عدم شرکت کی بنا پر لعن طعن کریں۔

(۶) عدم استطاعت کی حد تک مسئلہ پہنچا یا نہیں؟ اس میں اختلافِ رائے ممکن ہے اور اختلافِ رائے پر طرقِ عمل کا اختلاف بھی لازم ہے۔

(۷) حکومتِ پنجاب اگر کوئی قابل قبول حل نکال سکے تو چشمِ ما روشن، دل ما شاد، اور اگر کوئی ایسا حل نکالے جو مسجد کے احکامِ شرعیہ کے موافق نہ ہو تو مسلمان اسے بطوعِ خاطر منظور نہیں کر سکتے، پھر اگر اس کی مخالفت سے کسی بہتر حل کا حصول ممکن ہو تو اس کی مخالفت کرنے میں حق بجانب ہوں گے، اور اگر کسی بہتر حل سے مایوسی ہو تو عدمِ استطاعت کے مرتبہ میں پہنچ کر سکوت کی رخصت ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایت المفتی ۹/ از۱۸۲ تا ۱۸۴)

(۴) اسمبلی یا پارلیمنٹ کی ممبری کا مقصد کرسی یا عہدہ کا لالچ ہے، تو وہ حکومت مسلم ہو یا غیر مسلم، عادل ہو یا ظالم، بہر حال یہ ممبری خسرانِ اخروی کا باعث اور واجب الترک ہے، اور اگر اس کا مقصد کسی بھی طریقہ سے امتِ مسلمہ کو فائدہ پہنچانا یا ان کو پہنچنے والے ضرر اور نقصان کو حتی المقدور دور کرنا ہے، تو یہ ممبری موجبِ اجر و ثواب اور لائقِ اختیار ہے، انہی دو حالتوں اور مقاصد پر آئندہ اس کے ساتھ کیے جانے والے رویہ کا مدار ہے،

اور چوں کہ نیت ایک امرِ مخفی ہے؛ اس لیے ہم اپنی طرف سے کسی کی بد نیتی کا دعویٰ نہیں کر سکتے، اگر کسی شخص کو قرائن سے اس ممبر کا بدنیت ہونا معلوم ہو تو خود اس کے ساتھ تعلق نہ رکھنے کی اس کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے؛ لیکن بلا دلیل شرعی دوسرے مسلمانوں کو اس کے ساتھ بائیکاٹ کی ترغیب یا حکم دینا نیز خود اس کو حکومت سے بائیکاٹ پر مجبور کرنا درست نہیں۔

(۵) اوامرِ خداوندی کی بجا آوری اور منہیاتِ شرعیہ سے اجتناب کے ذریعہ نصرتِ خداوندی حاصل ہوتی ہے۔

فارس کی لڑائی میں جب مدائن پر حملہ ہونے والا تھا تو راستہ میں دجلہ پڑتا تھا، کفار نے وہاں سے کشتیاں وغیرہ بھی سب ہٹا لیں کہ مسلمان ان پر کو نہ آسکیں، برسات کا موسم اور سمندر میں طغیانی، امیر لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ مسلمان سمندر میں گھوڑے ڈال دیں، دو دو آدمی ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور سمندر میں گھوڑے بے تکلف تیر رہے تھے، امیر لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ تھے، اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ بار بار فرما رہے تھے: "واللہ لینصرن اللہ ولیہ، ولیظھرن دینہ، ولیھزمن عدوہ مالم یکن فی الجیش بغی او ذنوب تغلب الحسنات" (خدا کی قسم اللہ جل شانہ اپنے دوستوں کی مدد ضرور کرے گا، اور اپنے دین کو غالب کرے گا، اور دشمنوں کو مغلوب کرے گا جب تک کہ لشکر میں ظلم (یا زنا) نہ ہو اور نیکیوں پر گناہ غالب نہ ہو جائیں۔ (الاعتدال ۱۱۳ بحوالہ اشاعۃ)

ہرقل کی فوج بہت زیادہ تھی اور مسلمان اس کے مقابلہ میں بہت ہی کم تھے، جس کی اطلاع حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دی، اس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ تم مسلمان قلتِ تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے؛ البتہ معاصی میں مبتلا ہونے پر باوجود کثیر تعداد کے بھی مغلوب ہو سکتے ہو؛ اس لیے اس سے پرہیز

کرتے رہنا۔ (الاعتدال ۱۱۲ بحوالۂ اشاعۃ)

عراق کی لڑائی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیرِ لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو جو نصیحت فرمائی تھی، اس کے چند الفاظ ملاحظہ فرمائیں: ''اس پر غرور نہ کرنا کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماموں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی کہا جاتا ہے، اللہ جل شانہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتے بلکہ برائی کو بھلائی سے مٹاتے ہیں، اللہ کے درمیان اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں ہے، اس سے صرف بندگی کا معاملہ ہے، اس کے یہاں شریف، رذیل سب برابر ہیں، اس کے انعامات اس کی اطاعت سے حاصل ہوتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی نبوت کے بعد سے وصال تک جو تم نے دیکھی ہے اس کو پیش نظر رکھنا اور اس کو مضبوط پکڑنا یہ میری خاص نصیحت ہے، اس کو اگر تم نے نہ مانا تو عمل ضائع ہو جاوے گا، اور نقصان اٹھاؤ گے، تم ایک بہت سخت اور دشوار کام کے لیے بھیجے جا رہے ہو جس کی ذمہ داریوں سے خلاصی بجز اتباع حق کے اور کسی صورت میں نہیں ہے؛ اس لیے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو بھلائی کا عادی بنانا...... اللہ کا خوف اختیار کرنا۔ اور اللہ کا خوف دو چیزوں میں مجتمع ہے اس کی اطاعت میں اور گناہ سے احتراز میں، اور اللہ کی اطاعت جس کو بھی نصیب ہوئی ہے وہ دنیا سے بغض اور آخرت کی محبت سے نصیب ہوئی ہے۔ (الاعتدال ۱۱۵ بحوالۂ اشاعۃ)

عن جرير بن عبدالله رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: مامن رجل يكون في قوم يعمل فيهم بالمعاصي يقدرون على ان يغيروا عليه ولا يغيرون الااصابهم الله منه بعقاب قبل ان يموتوا. رواه ابوداؤد وابن ماجه (مشكوٰة شريف ٤٣٧)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کسی جماعت اور قوم میں کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اور وہ جماعت وقوم باوجود قدرت کے اس شخص کو اس گناہ سے نہیں روکتی

تو ان پر مرنے سے پہلے دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے''۔

عن عدی بن عدی الکندی قال: حدثنا مولی لنا انه سمع جدی رضی اللہ عنہ یقول: سمعت رسول اللّٰه ﷺ یقول: ان اللّٰه تعالیٰ لایعذب العامة بعمل الخاصة حتی یروا المنکر بین ظهرا نَیْهم وهم قادرون علی ان ینکروه فلا ینکروا، فاذا فعلوا ذلك عذب اللّٰه العامة والخاصة. رواه فی شرح السنة. (مشکوٰۃ شریف ۴۳۸)

یعنی اللہ جل شانہ چند مخصوص لوگوں کے گناہ کرنے سے سب کو عذاب نہیں کرتے جب تک کہ وہ لوگ ان مخصوص لوگوں کے روکنے پر قادر ہوں اور نہ روکیں، اور جب ایسا ہو کہ وہ روکنے پر قادر ہوں اور نہ روکیں تو پھر عام خاص سب کو عذاب میں مبتلا فرماتے ہیں۔

عن عائشة قالت: دخل علي النبي ﷺ فعرفت فی وجهه ان قد حضره شیء، فتوضأ وما کلم احدا فلصقت بالحجرة استمع مایقول فقعد علی المنبر، فحمد اللّٰه واثنی علیه، وقال: یایها الناس ان اللّٰه تعالیٰ یقول لکم: مروا بالمعروف، وانهوا عن المنکر قبل ان تدعوا فلا اجیب لکم، وتسألونی فلا اعطیکم، وتستنصرونی فلا انصرکم، فما زاد علیهن حتی نزل. (ابن ماجه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ایک مرتبہ دولت کدہ پر تشریف لائے، تو میں نے چہرۂ انور پر ایک خاص اثر دیکھ کر محسوس کیا کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے، حضور ﷺ نے کسی سے کچھ بات چیت نہیں فرمائی، اور وضو فرما کر مسجد میں تشریف لے گئے، میں حجرہ کی دیوار سے لگ کر سننے کھڑی ہوگئی کہ کیا ارشاد فرماتے ہیں، حضور ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا: لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، مبادا وہ وقت آجائے کہ تم دعا مانگو اور قبول نہ ہو، تم

سوال کرو اور سوال پورا نہ کیا جائے، تم اپنے دشمنوں کے خلاف مجھ سے مدد چاہو اور میں تمھاری مدد نہ کروں، یہ کلمات طیبات ارشاد فرمائے اور منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔

(۶) اس کا جواب نمبر ۵ میں آ گیا، اس کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ شریعت کے تمام شعبوں پر عمل کرنے والے کتنے مسلمان ہیں؟ آپ نے لاکھوں کی جو تعداد بتلائی ہے کیا اس میں مبالغہ آرائی نہیں ہے؟ اپنی قلتِ تعداد کو بہانہ بنانا تو ہرگز درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ دشمن کے مقابلہ میں کامیابی کا مدار قلت وکثرت یا ہتھیاروں کی کمی بیشی نہیں ہے بلکہ مشیتِ خداوندی ہے۔

(۷) ایسی پابندی تو نہیں ہے؛ البتہ کچھ دیگر شرائط ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے۔

(۸) اسباب کا اختیار کرنا اس موقعہ پر جہاں شریعت کی طرف سے اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے فرض ہے، بعض اوقات اس کی حیثیت سنت ومستحب کی رہتی ہے، بعض مواقع میں مباح کی، اور یہ تمام احکام بھی شریعت ہی کے جاری فرمودہ ہیں، دین مجموعہ کا نام ہے، کسی ایک جزء کا نہیں؛ البتہ آپ نے بھی ان کی تردید کے جوش میں ایسا انداز اختیار فرمایا ہے جس سے عبادات کا استخفاف لازم آتا ہے۔ ﴿لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾

قدم جس طرح میدانِ جنگ میں دشمنوں کے مقابلہ میں جمانے پڑتے ہیں اسی طرح اطاعتِ خداوندی میں جادۂ شریعت پر بھی جمانے پڑتے ہیں، اور کل کو روزِ قیامت پل صراط پر بھی جمانے کی ضرورت پیش آوے گی، کتبِ تفسیر کی چند عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

(ویثبت اقدامکم) ای عندالقتال، وقیل علی الاسلام، وقیل علی الصراط. (تفسیر قرطبی ۲۳۲/۱۶)

(ویثبت اقدامکم) فی مواطن الحرب ومواقفها، او علی محجة الاسلام، والمراد یقویکم او یوفقکم للدوام علی الطاعة. (روح المعانی ٢٦/٤٣)

(و یثبت اقدامکم) فی القیام بحقوق الاسلام والمجاهدة مع الکفار. (تفسیر مظهری ٨/ ٤٢٥)

اور کیا آپ نے اس طرف بھی توجہ فرمائی کہ یہ ﴿ یثبت اقدامکم﴾ کی جزاء کس شرط پر مرتب ہورہی ہے؟

(۹) میں نہ دانش ور ہوں اور نہ صوفی، کیا عرض کروں؟

(۱۰) صلح ہی نہیں ہے تو پھر حدِ زمانی کہاں؟

(۱۱) جہاد جب سے فرض ہوا ہے اس کی فرضیت منسوخ نہیں ہوئی۔

واماقوله علیه السلام: الجهاد ماض الی یوم القیامة. فدلیل علی وجوبه وانه لاینسخ. (بحرالرائق ٥/٧٦)

عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: جاهدوا المشرکین باموالکم وانفسکم والسنتکم. رواه ابوداؤد، والنسائی، والدارمی. (مشکوٰة ٣٣٢)

عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: لن یبرح هذا الدین قائما یقاتل علیه عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعة. (رواه مسلم (ایضاً ٣٣٠)

عن عمران بن حصین رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: لاتزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین علی من ناواهم حتی یقاتل آخرهم المسیح الدجال. رواه ابوداؤد (ایضاً ٣٣١)

شروع اسلام میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے مامور تھے

کہ مشرکین ومخالفین کی طرف سے پیش آنے والی تکالیف پر صبر سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ درگزر اور چشم پوشی سے کام لیں۔ قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿فاصفح الصفح الجمیل﴾ وقال تعالیٰ: ﴿واعرض عن المشرکین﴾

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو یہ حکم ملا کہ وعظ ونصیحت کے ذریعہ دین کی دعوت پیش فرمائیں اور مباحثہ کے لیے لطف ونرمی والا طریقہ اختیار فرمائیں۔ قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن﴾

اس کے بعد آپ کو اس صورت میں قتال کی اجازت دی گئی جب کہ کفار کی طرف سے ابتدا ہو۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿اذن للذین یقاتلون بأنهم ظلموا﴾ (ای اذن لهم فی الدفع)

وقال تعالیٰ: ﴿فان قاتلوکم فاقتلوهم﴾

وقال تعالیٰ: ﴿و ان جنحوا للسلم فاجنح لها﴾

اس کے بعد اپنی طرف سے ابتداء بالقتال کا حکم دیا گیا۔

قال اللّٰہ تعالی: ﴿وقاتلوهم حتی لاتکون فتنة﴾

وقال تعالی: ﴿فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموهم﴾

اور ارشاد نبوی (ﷺ): امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لااله الااللّٰہ، فاذا قالوها فقد عصموا منی دماءهم، واموالهم الا بحقها وحسابهم علی اللّٰہ.

الحاصل آخری حکم یہ ہوا کہ مشرکین کے ساتھ جہاد فرض ہے اور اس کی فرضیت تا قیام قیامت باقی ہے۔

ارشاد نبوی ہے: الجهاد ماض منذ بعثنی اللّٰہ تعالیٰ الی ان یقاتل آخر

عصابة من امتی الدجال. وقال ﷺ: بعثت بالسيف بين يدی الساعة، وجعل رزقی تحت ظل رمحی، والذل والصغار علی من خالفنی، ومن تشبه بقوم فهو منهم. (کتاب المبسوط للامام السرخسی. ۱/۲،۳)

جہاد کے ان مختلف مراحل کی تفصیل کئی علماء نے فرمائی ہے، جن میں علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن رشدؒ اور علامہ ابن القیمؒ بھی ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہاد کے یہ تمام مراحل آج بھی مشروع ہیں یا آخری مرحلہ کو چھوڑ کر بقیہ تمام منسوخ ہو چکے ہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کی عبارتیں مختلف ہیں۔ بعض حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر بعد والے مرحلہ نے اگلے مرحلہ کو ختم کر دیا گویا آج پہلے تینوں مراحل منسوخ ہیں صرف آخری مرحلہ یعنی چوتھا باقی ہے، ان کے برخلاف علماء کی دوسری جماعت اس بات کی قائل ہے کہ اگلے مراحل بھی منسوخ نہیں ہیں بلکہ وہ ان مخصوص حالات کے ساتھ خاص ہیں جس میں ان کو مشروع کیا گیا تھا؛ اس لیے جب ایسے حالات پیش آویں گے تو وہی حکم ہوگا، اس گروہ کے سرخیل علامہ بدرالدین زرکشیؒ ہیں، وہ فرماتے ہیں: انه ليس فی مراحل الجها د نسخ بل يعمل بكل مراحله عندالحالة المشابهة للحالة التی شرعت فيها. (تکملہ فتح الملھم ۸/۳ بحوالۂ البرھان فی علوم القرآن)

اسلام کی طرف سے جو فرائض اپنے ماننے والوں پر عائد کیے گئے ہیں ان تمام کی ادائیگی کے لیے کچھ شرائط، کچھ ارکان اور محل اداء بھی مقرر فرمائے ہیں۔ مثلاً نماز فرض قرار دی ہے تو اس کی ادائیگی کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں، اور ارکان بھی ہیں، اب اگر کوئی آدمی سترعورت یا طہارت کا اہتمام کیے بغیر نماز ادا کرنا چاہے تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی، گندگی سے پُر جگہ پر نماز پڑھنا چاہے تو نماز نہیں ہوگی، علی ہذا القیاس دیگر فرائضِ اسلام کا

حال ہے۔ جہاد بھی ایک فریضہ ہے اس کے لیے بھی کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں، جہاد کے لیے اولین ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کا متفق علیہ امیر ہو، جس کی اطاعت ہر حال میں کی جاتی ہو اور اس کے لیے ایسا مرکز بھی ہو جو کفار کے تسلط سے پاک ہو، نبی کریم ﷺ جب تک مکہ معظّمہ میں قیام پذیر رہے جہاد کا حکم نہیں ملا؛ بلکہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی طرف سے جب کفار کے مظالم کی شکایت کی جاتی تو آپ ﷺ کی طرف سے صبر وسکون کی تلقین کی جاتی تھی؛ اس لیے کہ اس وقت تک مسلمانوں کو ایسا کوئی مرکز میسر نہ تھا جو کفار کے غلبہ اور تسلط سے پاک ہو، باوجود مسلمانوں کی خواہش اور درخواست کے مسلمانوں کو روکا گیا، ہاں جب مدینہ منورہ کی صورت میں مرکز میسر آیا تو جہاد کا حکم بھی ملا، اور اس وقت ان مسلمانوں کو جو مکہ معظّمہ میں تھے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچنے کا حکم ہوا، چنانچہ جہاد کے ساتھ ہجرت بھی فرض ہوئی۔

ہندوستان میں گزشتہ صدی میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ نے جب چاہا کہ جہاد کا سلسلہ شروع فرمائیں تو چونکہ اس وقت ہندوستان پر انگریز کا غلبہ اور تسلط تھا؛ اس لیے وہ حضرات آزاد قبائل میں ہجرت کر گئے جو علاقہ غیروں کے غلبہ سے پاک تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت تمام مسلمانانِ ہند کسی ایک امیر کی اطاعت پر متفق ہیں؟ پورے ہندوستان کی بات چھوڑیئے کہ بہت وسیع وعریض رقبہ ہے، کیا صرف ایک ہی صوبہ کے تمام مسلمان ایک امیر پر متفق ہیں؟ ایک صوبہ نہ سہی ایک ضلع اور ایک ضلع نہیں، ایک شہر کے مسلمان بھی کسی ایک امیر کی امارت واطاعت پر متفق ہیں؟ اور اگر اکثر مسلمان متفق ہو جائیں تو کیا اس امیر میں یہ قوت ہے کہ جو لوگ اس کی اطاعت سے خارج

ہیں ان کو بزور اپنی اطاعت میں لے آوے؟ اور اگر بالفرض تمام مسلمان اس کی اطاعت میں آ گئے ہیں تو کیا ہندوستان میں رہتے ہوئے اس کے پاس کوئی ایسی جگہ یا علاقہ ہے جو غیروں کے تسلط سے مکمل آزاد ہو جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق اسلامی احکام جاری کر سکے؟ اور جس کو مرکز قرار دے سکے؟ حنفیہ کے یہاں مالِ غنیمت کی تقسیم بھی اس وقت تک درست و جائز نہیں جب تک اس کو کفار کے تسلط سے نکال کر دارالاسلام میں نہ لے آوے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ایک فتویٰ کفایت المفتی جلد دوم از ۱۴۴ تا ۱۴۸ پر موجود ہے جس کا عنوان ہے ''ہجرت و جہاد'' اس کو ضرور ملاحظہ فرمالیں:

اس ملک میں رہ کر آپ کو خود پر اور اپنے مسلمان بھائیوں پر کیسا اور کتنا اختیار حاصل ہے؟ اور وہ ایک امیر پر کہاں تک مجتمع ہو سکتے ہیں؟ اس کا اندازہ تو خود آپ کے قائم کردہ سوال نمبر ۱۶ سے ہو جاتا ہے پھر بھی آپ سوال نمبر ۱۱ میں دوسرا ہی انداز اختیار فرمائے ہوئے نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں والا ہوش یہاں مفقود ہے۔

(۱۲) مظلوم مسلمان کی فریاد رسی اور اس کی امداد ہر ایک پر ضروری اور فرض ہے۔

نبیِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: انصر اخاك ظالما او مظلوما الخ متفق عليه. (مشکوٰۃ ۴۲۲)

نیز آپ ﷺ فرماتے ہیں: المسلم اخوا المسلم لايظلمه ولايسلمه الخ متفق عليه. (مشکوٰۃ ۴۲۲) ایک اور ارشاد نبوی ہے: مامن امرئ مسلم يخذل امرأ مسلما فى موضع ينتهك فيه حرمته وينتقص فيه من عرضه الا خذله اللّٰه تعالىٰ فى موطن يحب فيه نصرته، ومامن امرأ مسلم ينصر مسلما فى موضع ينتقص من عرضه وينتهك فيه من حرمته الانصر ه اللّٰه فى موطن تحب فيه نصرته رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ ۴۲۴)

مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے جو تدابیر اجتماعی، انفرادی، کارگر

اور مفید ہوں ان تمام کا اختیار کرنا حسبِ استطاعت ہر ایک پر ضروری ہے، کون سی تدبیر اس راہ میں مفید اور کارگر ہوسکتی ہے، اس سلسلہ میں اختلاف رائے بھی ہوسکتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کے طریقے مختلف ہوسکتے ہیں، آپ جس تدبیر کو دیانۃً مفید سمجھتے ہیں اس کا اختیار کرنا آپ پر حسبِ استطاعت ضروری ہے؛ لیکن جو اس کو مفید نہ سمجھتا ہو بلکہ اس کے خیال میں آپ والا انداز بجائے مفید ہونے کے مضر ہو تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اس میں آپ کی موافقت کرے، اور چونکہ آپ کے پاس بھی اس پر کوئی نص قطعی نہیں کہ آپ والی تدبیر مفید ہی ہے؛ اس لیے جو اس کو اختیار نہ کرے اس کی آپ تضلیل وتفسیق نہیں کرسکتے۔

(۱۳، ۱۴) دونوں صورتوں میں وہ شہید ہے۔ علامہ عینیؒ شرح بخاری میں فرماتے ہیں: وجاء ت احادیث اخری فی ھذاالباب منھا فی الصحیح: من قتل دون مالہ فھو شھید، ومن قتل دون اھلہ فھو شیھد، ومن قتل دون دینہ فھو شیھد، ومن قتل دون دمہ فھو شھید. (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ۱۲۷/۱۴)

(۱۵) کسی کی نیت پر حملہ کرنا تو ٹھیک نہیں ہے، رہی مسلمان کی مدد اور اس کی فریاد رسی تو وہ ہر ایک پر جو اس کی استطاعت رکھتا ہو ضروری اور فرض ہے، اس کی چند احادیث جواب نمبر ۱۲ میں پیش کرچکا ہوں۔

(۱۶) (الف): اس کا یہ اقدام مستحسن اور پسندیدہ ہے۔

(ب) اس کی کوئی مقررہ سزا نہیں ہے، حاکم مسلم اس کی مناسب تعزیر کرسکتا ہے۔

(ج) اس کا جواب نمبر ۱۳، ۱۴ میں آچکا ہے۔

(۱۷) شہید کی متعدد اقسام ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنے ایک رسالہ ”ابواب السعادۃ فی اسباب الشھادۃ“ میں تیس کے قریب شمار کرائی ہیں۔

قال السيوطی فی التنوير: وقد جمعتهم فناهزوا الثلاثين قلت: "سماها ابواب السعادة فی اسباب الشهادة" (اوجز المسالك ٤/ ٢٦٧)

علامہ عینیؒ نے شرح بخاری میں چالیس کے قریب بتلائی ہیں: وهذا كما رأيت ترتقی الشهداء الی قريب من اربعين. (عمدة القاری شرح صحيح البخاری ١٤/ ١٢٧)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ مہاجر مدنی نے مؤطا امام مالک کی شرح اوجز المسالک میں یہ تعداد ساٹھ تک پہنچادی ہے۔ وهذا كما رأيت ترتقی الشهداء الی قريب من ستين. (٤/ ٢٦٩)

ان کے علاوہ بھی بعض اقسام صاحب مظاہر حق نے ذکر کی ہیں، اور کنز العمال میں بھی مزید کچھ اقسام موجود ہیں۔ وذكر صاحب مظاهر حق انواعا اخر، وكذا فی كنز العمال. (اوجزالمسالك ٤/ ٢٦٩)

(۱۸) بہ اعتبار آلات کے جہاد کی تین اقسام بیان کی جاتی ہیں: جہاد بالنفس، جہاد بالمال، جہاد باللسان۔ اس آخری قسم ہی کی ایک نوع جہاد بالقلم بھی ہے۔ لان القلم احداللسانين نیز اس سلسلہ میں کچھ تفصیل جواب نمبر ۱۱ میں بھی آچکی ہے۔

عن انس رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: جاهدوا المشركين باموالكم وانفسكم والسنتكم. رواه ابوداؤد والنسائی والدارمی. (مشكوٰة ٣٣٢)

کن حالات میں جہاد کی کون سی قسم پر عمل ہو اس کا فیصلہ امیر المؤمنین کرے گا اور اس کی اطاعت اس سلسلہ میں ضروری ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم وعلمہ اتم واحکم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

۲۴/محرم الحرام ۱۴۱۲ھ

كتاب الميراث

ترکہ میں میراث جاری ہوتی ہے

سوال: باپ اپنی حیاتی میں ہی سب تقسیم کرنا چاہتا ہے اور اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا تو پھر وراثت کا سوال رہتا ہے یا نہیں؟ ترکہ تو ورثہ ہی میں تقسیم ہوتا ہے، اگر کسی باپ کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی ہو اور ماں بھی حیات ہو اور اپنی زندگی میں ہی تقسیم کرنا چاہتا ہو تو اس صورت میں تقسیم کیسے کرے؟ اور اس کا کیا نام رہے گا؟ پھر میراث رہے گی یا نہیں؟ اور باپ نے اب تک بیٹی کو جو دیا ہے وہ شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آدمی اپنی وفات کے بعد جو مال اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے جس کو اصطلاح شرع میں ترکہ کہتے ہیں، وہ اگر حقوق العباد سے فارغ ہو تو اس میں وراثت جاری ہوگی، اب اگر کسی آدمی نے اپنی زندگی ہی میں اپنا مال تقسیم کردیا اور بوقتِ وفات اس کی ملک میں کچھ بھی نہیں تو پھر وراثت جاری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، زندگی میں اگر تقسیم کرنا چاہتا ہے تو بیٹا بیٹی میں تفریق نہ کرے بلکہ ہر ایک کو یکساں دے۔ اس صورت میں باپ بیٹی کو اب تک جو کچھ دے چکا ہے اس کو بھی شمار میں لے۔ شامی۔ (فتاویٰ رحیمیہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

لڑکی اپنا حصہ معاف کردے تو بھی معاف نہیں ہوتا

سوال: اگر وراثت میں کسی لڑکی کا حصہ ہے اگر وہ لڑکی خود معاف کردیوے تو کیا وہ معاف ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وراثت کے ذریعہ جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے ملکیت جبری ہے، نہ اس میں وارثوں کا قبول کرنا شرط ہے، نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے بلکہ اگر وہ

زبان سے بصراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا تب بھی وہ شرعاً اپنے حصہ کا مالک ہو چکا۔ (معارف القرآن ۲/۳۱۲)

جو لوگ بہنوں کو حصہ نہیں دیتے اور وہ یہ سمجھ کر بادلِ ناخواستہ شرما شرمی معاف کر دیتی ہے کہ ملنے والا تو ہے ہی نہیں تو کیوں بھائیوں سے برائی لے ایسی معافی شرعاً معافی نہیں ہوتی ان کا حق بھائیوں کے ذمہ واجب رہتا ہے، یہ میراث دبانے والے سخت گنہگار ہیں، ان میں بعض بچیاں نابالغ بھی ہوتی ہیں ان کو حصہ نہ دینا دوہرا گناہ ہے، ایک گناہ وارث شرعی کے حصہ کو دبانے کا، اور دوسرا یتیم کے مال کو کھانے کا۔ (معارف القرآن ۲/۳۲۱)

اپنا حصہ وارثوں کو ھبہ کرنا

سوال: ایک لڑکی وراثت کی حق دار تھی اور وراثت کے تقسیم کرنے کے وقت اس کا حصہ اس کو دے دیا، پھر اس کے بعد اس نے واپس وارثوں کو ھبہ کر دیا تو کیا یہ ہبہ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ مفصل اور مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب وہ اپنا حصۂ میراث لے چکی تو اب اس کو اختیار ہے چاہے اپنے پاس رہنے دے، چاہے کسی کو فروخت کر دے، چاہے کسی کو (جس میں دیگر ورثاء بھی ہیں) ہبہ کر دے؛ البتہ ارکان وشرائط ہبہ کا پایا جانا ضروری ہے ورنہ ہبہ صحیح نہ ہوگا۔

وشرائط صحتها فی الواهب: العقل، والبلوغ، والملك، فلا تصح هبة صغير ورقيق ولو مكاتبا. وشرائط صحتها فی الموهوب: ان يكون مقبوضا، غير مشاع، مميزا، غير مشغول. وركنها: هو الايجاب، والقبول. الخ (درمختار على هامش الشامی ٤/ ٥٦٧)

بہنوں کو ان کا حقِ وراثت نہ دینا ظلم ہے

سوال: ہمارے علاقے میں وراثت میں بہن کو اس کا حصہ نہیں دیا جاتا اور نہ دیگر ورثاء کو حصہ ملتا ہے، والد کی وفات کے بعد تمام بھائی آپس میں ساری وراثت تقسیم کر لیتے ہیں، پہلے لوگ لاعلمی اور ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کرتے تھے مگر اب علم ہونے کے باوجود بہنوں کو یہ حق نہیں دیا جاتا، خود ہماری بہنوں کو ہمارے بھائی ان کا حصہ نہیں دے رہے ہیں ان کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ باپ کے ترکہ میں سے بیٹیوں کو حصۂ میراث دینے کے سلسلہ میں بھائیوں کی ناراضی سے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: میراث کی تقسیم کے بارے میں شرعی حکم نہ ماننا اور لڑکیوں کو ان کے حق سے محروم کرنا، اور ان کو ان کا حق نہ دینا بہت سخت گناہ کا کام ہے بلکہ حد کفر تک پہنچ جانے کا اندیشہ ہے، خدائے پاک نے اپنے کلام پاک میں وراثت کے قانون وقواعد بیان کرنے کے بعد صریح الفاظ میں فرمایا ہے: ﴿و من یعص اللّٰہ و رسولہ و یتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیھا و لہ عذاب مھین﴾ یعنی اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر حدود سے تجاوز کرے گا تو اس کو جہنم میں ڈال دے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ (سورۃ النساء) لہٰذا بہنوں کو ان کا حق دینا ضروری ہے، انکار کرنا رسم کفار کی اتباع ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲/۲۵۴، ۲۵۵)

ایک اور جگہ ”کسی کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر لینا اور بہنوں کو میراث سے محروم کرنا“ کے عنوان کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں: مسلمانوں میں ایک مرض یہ بھی عام

ہو رہا ہے کہ جہاں موقع ملا دوسرے کا مال دبا لیتے ہیں، صرف دنیوی مفاد پیشِ نظر رہتا ہے آخرت سے بے انتہا غفلت چھائی ہوئی ہے، کسی دوسرے کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں۔ (مجمع الزوائد ٤/١٧٦)

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے منی میں جو خطبہ دیا اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کا کوئی مال حلال نہیں ہے سوائے اس مال کے جو اس نے خوش دلی سے دیا ہو۔ (ایضا ۴/۱۷۱)

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا کوئی مال ناحق طور پر لے؛ اس لیے کہ حق تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کیا ہے، اور اس کو بھی حرام قرار دیا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے۔ (ایضاً ۴/۱۷۱)

کسی سے کوئی چیز لینے یا اس کو استعمال کرنے کے لیے اس کا خوشی سے راضی ہونا ضروری ہے؛ لہذا اگر کسی وقت حالات سے یہ معلوم ہو جائے کہ کسی شخص نے اپنی ملکیت استعمال کرنے کی اجازت کسی دباؤ کے تحت یا شرما شرمی میں دے دی ہے اور وہ دل سے اس پر راضی نہیں ہے، تو ایسی اجازت کو اجازت نہیں سمجھا جائے گا؛ بلکہ اس کا استعمال بھی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہوگا۔ (وصیۃ العرفان)

نیز یہ بھی ذہن میں رہے کہ لڑکیوں کو میراث سے محروم کرنا اور ان کو میراث میں جو حصہ ملتا ہے وہ لڑکوں کا آپس میں تقسیم کر لینا یہ بھی اسی حکم کے اندر داخل ہے، اور سخت

حرام ہے اور بہنوں پر ظلم ہے، لڑکیوں (بہنوں) کا جو شرعی حق ہو (اور ان کے علاوہ جو بھی شرعی وارث ہوں) ان کا حق ادا کرنا انتہائی ضروری اور لازم ہے، میراث کی تقسیم قانون الٰہی ہے اس کے مطابق عمل کرنا بہت بڑی فضیلت اور اجر وثواب کا باعث ہے، اور اس کی خلاف ورزی پر دوزخ کی سخت وعید ہے، قرآن مجید میں میراث کے احکام بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ، وَمَن يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَاراً خَالِداً فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ (قرآن مجید سورہ نساء آیت ۱۳، ۱۴ پارہ ۴) ترجمہ: یہ سب احکام مذکورہ خداوندی ضابطے ہیں، اور جو شخص اللہ ورسول کی پوری اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں داخل کر دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے، اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا نہ مانے گا، اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جاوے گا، اس کو آگ (جہنم) میں داخل کر دیں گے اس طور پر کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے۔ لہذا بہنوں کا اور شرعی وارثوں کا حق ادا کر دینا چاہیے۔

مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی بلند شہری رحمہ اللہ نے بڑی اچھی بات تحریر فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لڑکیوں کے حصہ کی اہمیت بیان فرماتے ہوئے ﴿للذکر مثل حظ الانثیین﴾ (لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہے) فرمایا یعنی لڑکوں کا حصہ علیحدہ سے بتایا ہی نہیں؛ بلکہ لڑکیوں کا حصہ بتاتے ہوئے لڑکوں کا حصہ بتایا ہے۔ (وصیت اور میراث کے احکام ۴۳)

ہمارے زمانے کی جو حالت ہے کسی شاعر نے اس کا خوب نقشہ کھینچا ہے، اس

کے چند اشعار یاد ہیں جو پیش کیے جاتے ہیں:

خبر حدیثوں میں جس کی آئی	وہی زمانہ اب آرہا ہے
زمین بھی تیور بدل رہی ہے	فلک بھی آنکھیں دکھا رہا ہے
پرائے مال کو اپنا سمجھیں	حرام کو بھی حلال سمجھیں
گناہ کرے اور کمال سمجھیں	بتاؤ دنیا میں کیا رہا ہے
بھائی کا بھائی رہے گا رہزن	حقیقی بیٹی ہے ماں کی دشمن
پسر نے چھوڑا پدر کا دامن	بہن کو بھائی ستا رہا ہے
ہاتھ باندھے کھڑے ہیں صف میں	سب اپنے اپنے خیال میں ہیں
امام مسجد سے کوئی پوچھے	نماز کس کو پڑھا رہا ہے

حاصل کلام اب دنیا میں ہر صاحب حق کا حق ادا کر کے معاملہ صاف کر لینا چاہیے، آخرت کا معاملہ بہت ہی سنگین ہے، وہاں حقوق کی ادائیگی نیکیوں سے کرائی جائے گی، نیکیاں نہ رہیں گی تو صاحب حق کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے، حدیث میں ہے:عن ابی هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من كانت له مظلمة لاخيه من عرضه او شی ء فليتحلله منه اليوم قبل ان لا يكون دينار ولا درهم، ان كان له عمل صالح اخذ منه بقدر مظلمته، وان لم يكن له حسنات اخذ من سيئات صاحبه فحمل عليه. رواه البخاری. (مشكوٰة شريف ٤٣٥ باب الظلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس پر اس کے بھائی کا کوئی حق اس کی آبرو ریزی یا مال سے متعلق ہو تو اسے چاہیے کہ آج ہی اس سے معافی حاصل کرے، اس سے پیشتر کہ قیامت کا دن آئے وہاں نہ اس کے

پاس دینار ہوں گے نہ درہم، اگر اس کے پاس نیکیاں ہوں گی تو نیکیاں لے لی جائیں گی، اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو صاحب حق کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔

عن سعید بن زید رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: من اخذ شبرا من الارض ظلماً فانہ یطوقه یوم القیٰمة من سبع ارضین. متفق علیه (مشکوٰۃ شریف ٢٥٤)

ترجمہ: حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے کسی کی ظلماً ایک بالشت زمین لے لی تو قیامت کے دن اس ایک بالشت کے بقدر ساتوں زمین کا حصہ اس کے گلے میں طوق (ہار) بنا کر ڈال دیا جائے گا۔

کسی کا مال دبا لینے اور میراث نہ دینے پر بسا اوقات خاندان میں نا اتفاقی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ قطع رحمی کا سبب بن جاتا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۹/۳۸۶ تا ۳۹۰ بتغیر یسیر)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، مفتی: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک۔ ضلع: نوساری، گجرات

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک۔ ضلع: نوساری، گجرات

الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی، معین مفتی: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک۔ ضلع: نوساری، گجرات